مظلوم اقبال

چند یادیں — چند تاثرات

اعجاز احمد

شائع کنندہ ــــــــــــــــــ مصنف

مطبع ــــــــــــــــــ شیخ شوکت علی پرنٹرز ۔ کراچی

اشاعت اول ــــــــــــــــــ ۱۹۸۵ء

تعداد ــــــــــــــــــ ایک ہزار

قیمت ــــــــــــــــــ 75 روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

بی ۔ ۲۱۳ داؤد پوتہ روڈ کراچی ۔ ۴

ٹیلیفون نمبر ۵۱۲۱۷۱

فہرست

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

شام ہوتی توحسبِ معمول چچا جان کے ملاقاتیوں کی آمد شروع ہوگئی۔ کچھ روز کے آنے والے، کچھ کبھی کبھی آنے والے۔ "بیا بہ مجلسِ اقبال ویک دوساغر کش" کی دعوتِ عام تھی۔ اُن کی "درگاہ" میں "گیر ودار دحاجب ودرباں" کا کیا ذکر۔ "ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو" والا معاملہ تھا۔ ذاتی احباب کے علاوہ سبھی قسم کے لوگ آتے، سیاستدان صحافی۔ ادیب۔ شاعر، علمائے دین۔ مشائخ کبار، درس گاہوں کے اساتذہ۔ روسأ۔ طلبأ تاجر۔ صنعتکار۔ متوسط طبقہ کے شہری، حکومت کے عمال۔ شہر کے پہلوان۔ کارخانوں میں کام کرنے والے کاریگر اور مزدور۔ پیشہ ور۔ غرضیکہ کسی کے آنے پر کوئی قدغن نہ تھی اُن کی مجلس میں ہر قسم کے موضوع زیرِ بحث آتے۔ کبھی سیاست کی گتھیاں سلجھائی جاتیں کبھی شعر و ادب پر اظہار خیال ہوتا۔ کبھی تاریخ و فلسفہ پر گفتگو ہوتی۔ جسمانی ورزش کا ذکر چھڑ جاتا تو فنِ پہلوانی کے رموز بیان ہوتے۔ ایک مرتبہ تو اس مجلس میں طباخی کے فن پر سیر حاصل بحث سُنی تھی۔ ایسے ایسے کھانوں کا ذکر ہوا جو کبھی دیکھے نہ سُنے۔ مجلس میں اُن کے بے تکلف احباب ہوتے تو دو ایک سے (نام کیا لوں) مزاحیہ چھیڑ چھاڑ سے محفل زعفران زار بن جاتی۔

جس دن کا یہ ذکر ہے۔ اُس شام کی مجلس میں قرآن پاک کی تفاسیر پر گفتگو ہو رہی تھی

حاضرین میں سے کسی نے ایک معلوم الاسم صاحب کے متعلق بیان کیا کہ وہ بھی قرآن کریم کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ ان صاحب کے متعلق معلوم تھا کہ وہ قرآن کریم کے بعض نواہی احکام پر عامل نہیں۔ یہ سن کر چچا جان نے اپنی مخصوص نیم مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا "ایک زمانے میں حسینؑ مظلوم تھے۔ ان دنوں قرآن مظلوم ہے۔ جو اُٹھتا ہے اُس کی تفسیر لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ دیکھیں یہ صاحب قرآنی آیت لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ[1] کی کیا تفسیر فرماتے ہیں۔" اُن کو کیا معلوم تھا کہ وفات کے بعد وہ بھی مظلوموں کی فہرست میں شامل ہو جائیں گے۔ ان کے "احباب" کی تعداد بھی بہت بڑھ جائے گی اور اکثر مشاہیرِ عالم کی طرح ان کے متعلق بھی جس کے جی میں آئے گا عجیب عجیب فرضی روایات ان سے منسوب کر کے شائع کرا دے گا۔

پچھلے چھیالیس سالوں میں علامہ کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے لیکن وہ زیادہ تر اُن کے حکیمانہ افکار، اُن کے ساحرانہ فن یا اُن کی سیاسی بصیرت کے بارے میں ہے۔ اس سلسلہ کی بعض تصانیف تو بڑے پائے کی اور بہت ہی قابلِ قدر ہیں۔ ان کے سوانح حیات اور بقول فیض "ان کی ذات کے اجنبی گوشوں اور ان کی شخصیت کی غیر معروف گہرائیوں کی تحقیق کا کام ابھی تشنۂ تکمیل ہے"۔[2]

اُن کی وفات کی برسی پر اکثر اخبارات خاص نمبر نکالتے رہتے ہیں۔ گاہے گاہے اُن میں ایسے قابلِ قدر مضامین بھی ہوتے ہیں جن سے اُن کی شخصیت کے کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہے لیکن اُن کی ذات کے متعلق اور بالخصوص ابتدائی زندگی کے متعلق اکثر مضامین میں "رہِ افسانہ زدند" والا معاملہ ہوتا ہے۔ مصدّقہ مواد یا معلومات فراہم کرنے کے لئے کاوش کرنے کی بجائے یہ کمی اپنے ذہن سے پوری کر لی جاتی ہے۔ لکھنے والے کو اُن سے رشتہ یا تعلق کے اظہار کی خواہش یا اُن کی ذات کے متعلق کوئی "نئی بات" (وضعی ہی سہی) بیان کر کے بقول ڈاکٹر تاثیر "اپنے لئے بقائے دوام حاصل کرنے کی کوشش" اور اخبار کو اپنے کالم پُر کرنے سے غرض۔ اتنی فرصت کسے کہ بیان کردہ روایات کے صحیح ہونے کے متعلق تحقیق کر لی جائے۔

---

[1] (الواقعہ - آیت ۸۰)

[2] ڈاکٹر جاوید اقبال کی فاضلانہ "زندہ رود" نے اب اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔

وفات کی ایک برسی پر لاہور کے ایک مشہور اُردو روزنامے اور ایک ہفت روزہ نے اپنے اپنے خاص نمبروں میں ایک مضمون "اقبال کا بچپن" کے عنوان سے شایع کیا تھا جس میں اُن کے ایک مبیّنہ "بچپن کے دوست" کی تلاش اور اس سے انٹرویو کا قصہ بیان کیا گیا تھا۔ مضمون کے ساتھ صاحبِ مضمون کی ارسال کردہ ہمارے داداجان کی ایک تصویر بھی شایع ہوئی تھی جس میں وہ اپنے دائیں بائیں دو بچوں کو لئے بیٹھے ہیں تصویر کے نیچے لکھا تھا "اقبال اپنے والدِ بزگوار کی گود میں۔ بائیں ہاتھ یعنی اپنے والد کی داہنی جانب اقبال ہیں اور داہنی طرف اُن کے چچیرے بھائی"۔ تصویر کو سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو صاحبِ تصویر بزرگ اور بچوں کے متعلق بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اوّل الذکر کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہے اور دونوں بچے دو اڑھائی سال کے ہیں۔ ایک "نئی چیز" شایع کرنے کے شوق میں نہ تو تصویر بھیجنے والے صاحب نے اور نہ ہی اخبار والوں نے یہ سوچنے کی زحمت کی کہ کیا ساٹھ یا پینسٹھ سالہ بزرگوار کے داہنی جانب بیٹھا ہوا دو اڑھائی سال کا بچّہ اقبال ہو سکتا ہے۔ تصویر میں جو بچے ہیں اُن میں سے ایک تو مَیں ہوں اور دوسرے میرے چچازاد بھائی آفتاب ہیں۔ صاحبِ مضمون نے نہ صرف علاّمہ اقبال کا "بچپن کا ایک دوست" ڈھونڈ نکالا بلکہ اُن کا ایک "چچازاد بھائی" بھی تلاش کر لیا حالانکہ اُن کا چچازاد بھائی کوئی نہ تھا۔ اس مثال کو ذرا تفصیل سے اس لئے بیان کیا ہے تاکہ علاّمہ اقبال کے ذاتی حالات شایع کرنے میں جو "احتیاط" برتی جاتی ہے اسے ظاہر کیا جا سکے۔

خیر اخبارات میں جو کچھ شائع ہوتا ہے وہ اتنا دیرپا نہیں ہوتا کہ اس سے تاریخ کے مسخ ہونے کا زیادہ اندیشہ ہو۔ ۱۹۵۵ء میں بزمِ اقبال لاہور نے "ذکرِ اقبال" کے نام سے علاّمہ کے سوانح حیات شایع کئے جو مولانا سالک مرحوم نے مرتب کئے تھے۔ اس کتاب نے ایک حد تک سوانح حیات کی کمی کو پورا کیا ہے اور اس بارے میں بزمِ اقبال اور مولانا سالک مرحوم کی کوشش لائقِ ستائش ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کتاب میں بھی ایسی روایتیں راہ پا گئی ہیں جو صحیح نہیں۔ اس کے لئے نہ مولانا مرحوم قابلِ الزام ہیں نہ بزمِ اقبال۔ ان راویوں کو بیان کرنے والے یا تو صحیح حالات سے واقف نہ تھے یا

اُنھوں نے "ایجاد بندہ" پر عمل کیا۔ اس کتاب کے بعد بھی دو ایک کتابیں علامہ مرحوم کے بعض ذاتی حالات کے متعلق شائع ہوئی ہیں جن میں کچھ باتیں ایسی درج ہیں جو محل نظر ہیں اور کچھ جو ناروا ہیں۔

ایک دن ممتاز حسن مرحوم کے ہاں جو اپنے وقت میں "اقبالیوں" کے سرخیل تھے۔ اس روایت سازی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ انھوں نے فرمایا تم کیوں صحیح حالات لکھ کر ایسی روایتوں کی صحت نہیں کرتے۔ میں نے عذر کیا کہ لکھنا میرے بس کی بات نہیں اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی سے اتنی فرصت بھی کہاں ہے۔ اُن دنوں کرنل سعید الدین مرحوم علامہ کے متعلق اپنی کتاب "روزگار فقیر" مرتب کر رہے تھے۔ طے پایا کہ میں کچھ خاندانی حالات اور دیگر کوائف انھیں بتا دوں اور وہ علاوہ دیگر امور انھیں "روزگارِ فقیر" میں شائع کر دیں۔ چنانچہ اس پر عمل کیا گیا اور "روزگارِ فقیر" شائع ہو کر مقبول ہوئی۔

نومبر ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کی پیدائش پر سو سال پورے ہو گئے۔ پیدائش کی صدسالہ تقریبات کے سلسلہ میں ان کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

بعض احباب نے مشورہ دیا کہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں اپنی صحت اور یادداشت کی اچھی حالت کو غنیمت جانتے ہوئے مجھے علامہ کے خاندانی حالات اور دیگر کوائف کے متعلق جو کچھ معلوم ہے وہ قلمبند کر دینا چاہیئے تاکہ اُن پر تحقیق کرنے والوں کے کام آ سکے۔

میرے پاس اُن کے ایک سو سے زائد خطوط بھی محفوظ ہیں جو انھوں نے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۷ء کے درمیان اپنے والد کو یا اپنے بڑے بھائی کو یا مجھے یا دو ایک اور عزیزوں کو لکھے۔ اگرچہ وہ زیادہ تر گھریلو معاملات کے متعلق ہیں لیکن اُن کا اور اُن کے پس منظر کا ریکارڈ میں آ جانا بھی آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

کتاب کے قارئین اس میں اظہار و بیان کی بہت سی اغلاط پائیں گے جنھیں نظر انداز کر دیں کیونکہ نہ تو میں کوئی ادیب ہوں اور نہ یہ کتاب ایک ادبی تصنیف

کے طور پر پیش کی جا رہی ہے۔ یہ صرف علامہ کے خاندان اور خود اُن کے متعلق میری چند یادداشتیں ہیں جو ممکن ہے اُن پر تحقیق کرنے والوں کے کام آسکیں۔ یہی اس کتاب کے شائع کرنے کا مقصد ہے۔

اپنی ان یادداشتوں کو مرتب کرنے کا فیصلہ کیا تو اس مجموعہ کے لئے موزوں نام کی تلاش ہوئی۔ ایسے میں علامہ کی مجلس کا متذکرہ بالا واقعہ یاد آیا تو مجھے کتاب کے لئے "مظلوم اقبال" موزوں نام معلوم ہوا۔ ابھی کچھ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ پچھلے سال نومبر میں "جنگ" لاہور کے زیر اہتمام علامہ اقبال کے فکر و فن کے سلسلہ میں ایک مذاکرہ منعقد ہوا۔ اُن دنوں فیض مرحوم ابھی زندہ تھے اور اُس مذاکرے میں شریک تھے۔ انہوں نے فرمایا "آج کل کے دور میں اگر شعراء میں سب سے مظلوم کوئی ہے تو وہ علامہ اقبال ہیں۔ ہر نقّاد اور مبصّر نے اقبال کو اپنے نظریات، خیالات اور عقائد کی اقلیم میں کھینچ تان کر لانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے حضرات علامہ اقبال کا کوئی نہ کوئی مصرعہ یا شعر اپنے خیالات کی تائید کے لیے پیش کر دیتے ہیں۔"(۱) فیض مرحوم کی اس رائے نے کتاب کے لئے "مظلوم اقبال" کا نام موزوں ہونے کی تائید کر دی۔

مرحوم فقیر وحید الدین نے ۱۹۶۳ء میں جب علامہ اقبال پر اپنی کتاب شائع کی تو فیض مرحوم سے کتاب کے لئے کوئی موزوں نام تجویز کرنے کی استدعا کی اور انہوں نے نہایت ہی موزوں نام "روزگار فقیر" تجویز فرمایا۔ فیض مرحوم راقم الحروف کے نام اور علامہ سے میری قرابت سے تو غالباً واقف تھے لیکن اُن کے کلام کا ایک قاری اور مدّاح ہونے کے باوجود میرا اُن سے ذاتی تعلق نہ تھا کہ اُن سے کتاب کا نام تجویز کرنے کی استدعا کر سکتا۔ اسے حُسنِ اتفاق کہیئے کہ "جنگ لاہور" کے مذاکرے میں اُن کی طرف سے ایک رنگ میں اُس نام کی تائید ہو گئی جو میرے ذہن میں تھا اور میں اسے اُنہیں کا تجویز کردہ نام سمجھتا ہوں۔ وہ خود بھی تو ایک عظیم شاعر اور ایک عظیم انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے رنگ میں عمر بھر "مظلوم" ہی رہے۔

۱۵ ستمبر ۱۹۸۵ء　　　　　　　　اعجاز احمد

---

(۱) روزنامہ "جنگ" لاہور۔ اقبال ایڈیشن (۹ نومبر ۱۹۸۴ء)

خاندانی حالات

باب ۱

علامہ اقبال کے جدِّ اعلیٰ کا مشرف بہ اسلام ہونا

میں نے اپنے دادا جان سے سُنا ہوا ہے کہ ہمارے اجداد میں سے جس نے سب سے پہلے ہندو مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا وہ "لول حج" کے عرف سے مشہور ہوئے کیونکہ انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ حج کی سعادت حاصل کی۔ میرے لڑکپن میں گھرانے کی بڑی بوڑھیاں اکثر سنایا کرتی تھیں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اس بزرگ کو اپنے ہندو رشتہ داروں کی طرف سے بڑی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سلسلہ میں اُن کی بعض "کرامتوں" کا ذکر کیا جاتا تھا۔ آخری کرامت یہ بیان کی جاتی تھی کہ وفات کے بعد اُن کی ہدایت کے بموجب اُن کا عصا اُن کی قبر کے سرہانے گاڑ دیا گیا جو رفتہ رفتہ ایک بڑا سایہ دار درخت بن گیا۔ واللہ اعلم حقیقت میں ایسا ہوا یا عقیدت مندوں نے یہ افسانہ بنا لیا۔ ہر مذہب میں ایسے افسانوں کی تخلیق میں اعتقاد اور خوش فہمی کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔

اس جدِّ اعلیٰ کے متعلق دادا جان نے اپنے بزرگوں سے جو کچھ سُنا ہوا تھا وہ انھوں نے چچا جان کو بھی بتلایا ہوا تھا اور انھیں اس روایت کی تصدیق کی جستجو رہتی تھی۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں انھیں اپنے اس بزرگ کا سراغ مل گیا۔ وہ اپنے خط محرّرہ ۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں اپنے بڑے بھائی یعنی میرے ابّا جان کو لکھتے ہیں "آپ اور والدِ مکرّم یہ سُن کر خوش

ہوں گے کہ مدت کی جستجو کے بعد آج اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے۔ حضرت بابا لول حج کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ اُن کا ذکر خواجہ اعظم کی "تاریخ کشمیر" میں اتفاقاً مل گیا ہے۔ والد محترم نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا تھا، وہ بحیثیت مجموعی درست ہے ان کا اصلی گاؤں "لوچپ" نہ تھا بلکہ موضع "چکو" پرگنہ آدون تھا۔ بارہ سال کشمیر سے باہر رہے اور ممالک کی سیر میں مصروف رہے۔ بیوی کے ساتھ اُن کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ اس واسطے ترک دنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے۔ واپس آنے پر اشارہ غیبی پا کر حضرت بابا نصرالدینؒ کے مرید ہوئے جو حضرت نورالدینؒ ولی کے مرید تھے۔ بقیہ عمر انھوں نے بابا نصرالدینؒ کی صحبت میں گزاری اور اپنے مرشد کے جوار میں مدفون ہوئے۔

ان حالات کے معلوم ہونے کا سبب بھی عجیب و غریب ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار الہ آباد یونیورسٹی کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے ایک کتاب کشمیری تہذیب و تمدن پر لکھ رہے ہیں۔ میں اُن کے ممتحنین میں سے ہوں۔ اتفاق سے رجسٹرار صاحب کل آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کسی اپنے دوست کو ہدایت کی تھی کہ خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر کا قلمی نسخہ میرے مکان پر پہنچا دے۔ وہ شخص قلمی نسخہ تاریخ مذکور کا لایا۔ میں اس وقت فارغ بیٹھا تھا۔ یہی کتاب دیکھنی شروع کر دی۔ دو چار ورق ہی الٹے تھے کہ بابا صاحب کا تذکرہ مل گیا۔ جس سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی۔"

یہ خط میرے پاس محفوظ ہے۔ جاوید سلمہٗ نے خط کی فوٹو کاپی مجھ سے منگوائی اور خط کا ذکر ڈاکٹر محمد باقر سے کیا جو اُن دنوں علامہ کے اجداد کے سلسلہ پر تحقیق کر رہے تھے۔ انھوں نے بھی اس خط کی فوٹو کاپی مجھ سے منگوائی۔ پھر خواجہ محمد اعظم شاہ دیدہ مری کی تاریخ کشمیر مؤلفہ ۱۷۵۵ء[1] میں بابا لولی حاجی کے تذکرے کو دیکھا اور اُسے علامہ کے خط کے عین مطابق پایا تاریخ کشمیر اعظمی کے علاوہ ڈاکٹر محمد باقر نے ابو محمد حاجی محی الدین مسکین کی مشہور تالیف "تحائف الابرار فی ذکر اولیاء الاخیار" (تاریخ کبیر کشمیر مرتبہ ۱۹۰۳ء) میں بابا لولی حاجی کا ذکر[2] ڈھونڈھ نکالا۔ اس تحقیق پر مبنی ڈاکٹر محمد باقر کا ایک مضمون "اقبال کے اجداد کا سلسلۂ عالیہ" کے عنوان سے

---

[1] صفحہ ۷۲   [2] صفحہ ۱۲۲-۱۲۳

مجلس ترقیٔ ادب لاہور کے رسالہ "صحیفہ" کے اقبال نمبر حصہ اوّل[1] میں شائع ہو چکا ہے۔ اُن کی تحقیق کے مطابق بابا لولی حاجی حضرت شیخ نور الدین ولیؒ کے خلیفہ چہارم بابا نصر الدینؒ کے مریدوں میں سے تھے۔ بابا نصر الدینؒ بھی ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ بابا نصر الدینؒ نے ۱۴۵۱ء میں رحلت فرمائی اور اپنے مرشد حضرت نور الدین ولیؒ کے پہلو میں تکیہ سنگرام ڈار واقعہ چرار شریف میں دفن ہوئے۔ چرار شریف سرینگر سے ۲۰ میل جنوب مغرب میں واقع ہے بابا لولی حاجی وفات کے بعد بابا نصر الدینؒ کے جوار میں دفن ہوئے۔

"ذکر اقبال" مرتبہ مولانا سالک میں علامہ اقبال کے جدِّ اعلیٰ کے مشرف بہ اسلام ہونے کا قصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:-

"یہ لوگ (یعنی علامہ کے اجداد) سری نگر میں رہتے تھے اور اپنی نیکی اور شرافت کی وجہ سے ہم چشموں میں معزز و ممتاز تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی سیّد بزرگ کہیں باہر سے سری نگر تشریف لائے۔ علامہ کے جدِّ اعلیٰ اُن کی پاک نفسی کے باعث اُن کے گرویدہ ہو گئے۔ صحبت و محبت نے اپنا کام کیا۔ برہمن نے سیّد کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ صالح نام پایا۔ سیّد صاحب نے اپنے دوست کی صالحیّت کو دیکھ کر اپنی دختر نیک اختر سے اُس کی شادی کر دی۔ اسلام لانے کے بعد صلاح و تقویٰ کی وہ منزلیں طے کیں کہ بابا صالح کر کے مشہور ہو گئے۔ رجوع عام ہوا۔ مزار کشمیر میں ہے لیکن مقام معلوم نہیں ہو سکا۔"

"ذکر اقبال" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ کے راوی ہمارے ایک عزیز ہیں، جو اس کتاب کی ترتیب کے ایّام میں جواں عمر تھے۔ اس عزیز نے نہ تو یہ بیان کیا کہ یہ قصہ جو ہمارے دادا جان کی روایت سے بالکل مختلف ہے۔ انہوں نے کس سے سنا اور نہ ہی اپنی راویت کی تائید میں کوئی سند پیش کی۔ مَیں نے اپنے کسی بزرگ سے یہ روایت نہیں سُنی نہ ہی کسی بابا صالح کا نام سُنا۔ ہمارے اجداد میں سے ایک بزرگ کے متعلق یہ راویت ضرور سنی ہے کہ وہ کسی سیّد خاندان میں مرید تھے۔ ان کے مرشد کا انتقال ہوا تو ان کا مرشدزادہ ابھی نابالغ تھا۔ اس لیئے ہمارے اس بزرگ نے اپنے مرحوم مرشد کے مریدوں کو سنبھالا

[1] صفحات ۱ تا ۲۲

اور خاندان کی خدمت کرنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی سیّد خاندان کی ایک خاتون سے
اُن کی شادی بھی ہوگئی۔ لیکن یہ بزرگ وہ نہ تھے جنھوں نے سب سے پہلے اسلام قبول
کیا بلکہ اُن کی اولاد میں سے تھے۔ اُن کا نام شیخ محمد اکبر تھا۔ وہ ایک باعمل صوفی تھے اور
اُن کے تقدس اور اِتقا کا بڑا شہرہ تھا۔ اُن کا ذکر محمد عبداللہ قریشی کے ایک مضمون میں
کیا گیا ہے جو روزنامہ مشرق لاہور کی ۱۱ مارچ ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ سیّد
نذیر نیازی کی تصنیف "اقبال کے حضور" کے مطابق خود علامہ نے بھی اپنے اس بزرگ (شیخ
محمد اکبر) کا ذکر سیّد نذیر نیازی سے کیا تھا اور انھیں اپنے "والد کا دادا یا پڑدادا" کہا تھا جس
سے ظاہر ہے کہ انھیں رشتہ صحیح طور پر معلوم نہ تھا۔ شیخ محمد اکبر علامہ کے والد کے دادا تو یقیناً
نہ تھے کیونکہ اُن کے والد کے دادا کا نام شیخ جمال دین تھا۔ ممکن ہے پڑدادا ہوں۔ محمد عبداللہ
قریشی نے اپنے مضمون میں علامہ کے دادا شیخ محمد رفیق کو شیخ محمد اکبر کی چوتھی پشت بیان کیا
ہے لیکن اس کی تائید میں کوئی سند پیش نہیں کی۔ شیخ محمد اکبر کون سی پشت سے بابا لولی حاجی
سے متعلق تھے۔ اس کی کوئی حتمی شہادت میسّر نہیں۔ معلوم ہوتا ہے مولانا سالک کے
راوی ہمارے عزیز نے ہمارے اس بزرگ کے متعلق سنا ہوا ہوگا کہ وہ کسی سیّد خاندان میں
مرید تھے اور پھر اُس خاندان میں ان کی شادی ہوئی اور اس روایت کو ہمارے اجداد
میں سے سب سے پہلے اسلام لانے والے بزرگ پر چسپاں کر دیا۔ واللہ اعلم۔

۱۹۵۵ء میں جب "ذکرِ اقبال" مرتب کی گئی، علامہ اقبال کے قریباً نصف درجن
عمر رسیدہ قریبی عزیز زندہ تھے جو اس مسئلے پر روشنی ڈال سکتے تھے اور علامہ کا اکتوبر
۱۹۲۵ء کا لکھا ہوا متذکرہ بالا خط بھی موجود تھا۔ لیکن اُن میں سے کسی سے کچھ دریافت نہ
کیا گیا اور ایک نسبتاً کم عمر عزیز کی بے سند روایت پر انحصار کرتے ہوئے یہ قصّہ
بیان کر دیا گیا۔ بابا لولی حاجی کے متعلق دادا جان کی روایت اور چچا جان کو اتفاقاً اس
بزرگ کا سراغ ملنے کا مختصر ذکر "روزگارِ فقیر" حصہ دوم میں شائع ہو چکا ہے۔

۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کی پیدائش کی صد سالہ تقریب حکومت ہند نے بھی منائی
اس سلسلہ میں حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات نے ایک دیدہ زیب

"مرقع اقبال" بھی شائع کیا۔ جسے مشہور شاعر وادیب پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے مرتب کیا۔
اس مرقع میں ہمارے خاندان کا شجرہ نسب بھی شائع کیا گیا ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد
نے ذکر اقبال والی روایت پر انحصار کرتے ہوئے اس شجرے میں "صالح" کو ہمارا وہ جد
اعلیٰ دکھایا ہے، جس نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور "لول حج" کو ان کی اولاد میں سے
دکھایا ہے جو ہمارے داداجان کی روایت کے مطابق درست نہیں۔ علاوہ اس بنیادی
غلطی کے اور بھی کئی غلطیاں اس شجرے میں اور "مرقع اقبال" میں شامل "توقیت اقبال"
میں ہیں۔ مثلاً شیخ محمد اکبر کا شجرے میں کہیں نام نہیں۔ شیخ محمد رفیق کے تین بیٹے دکھائے
ہیں حالانکہ ان کے صرف دو بیٹے نور محمدؒ اور غلام محمدؒ تھے۔ غلام محمد کے متعلق لکھا ہے
کہ اُن کا انتقال ہیضہ کے مرض سے روپڑ ضلع انبالہ میں ہوا حالانکہ روپڑ میں اس مرض
سے اُن کے والد شیخ محمد رفیق کا انتقال ہوا تھا جو وہاں اُن سے ملنے گئے ہوئے تھے۔
شیخ نور محمد کی تین بیٹیاں دکھائی ہیں جو درست نہیں۔ اُن کی چار لڑکیاں تھیں۔ شیخ عطا محمد کی
دختران کوئی نہیں دکھائیں حالانکہ ان کی تین صاحب اولاد دختران تھیں جن میں سے دو اب
بھی زندہ ہیں۔ علامہ کی بیٹی معراج بیگم کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بچپن میں ہی وفات پا گئیں
حالانکہ ان کا انتقال جوانی میں، ۱۷ یا ۱۸ سال کی عمر میں ہوا۔ علامہ کے والد گرامی کی وفات کا
سن ۱۹۲۰ء لکھا ہے جو درست نہیں۔ ان کا سن وفات ۱۹۳۰ء ہے۔ "توقیت اقبال" میں
علامہ اقبال کی اہلیہ چچی مختار کا انتقال ۲۱ راکتوبر ۱۹۲۴ء کو ہونا بیان کیا گیا ہے اور انہیں
والدہ آفتاب اقبال لکھا گیا ہے۔ حالانکہ آفتاب بھائی کی والدہ محترمہ اس وقت بفضلہٖ زندہ
تھیں۔ اگر شجرہ شائع کرنا ضروری تھا تو اُس کے متعلق مناسب تحقیق کرنا چاہیئے تھی۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد کی بات ہے میں والدہ محترمہ سے ملنے سیالکوٹ
گیا ہوا تھا۔ پھوپھی کریم بی بی تو سیالکوٹ میں ہی میری والدہ کے پاس رہتی تھیں۔ وزیرآباد
سے پھوپھی زینب اور پھوپھا غلام رسول بھی مجھ سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ گھر میں کسی
تقریب کے سلسلہ میں گھرانے کی کچھ اور بزرگ خواتین بھی جمع تھیں۔ اس موقعہ کو غنیمت جانتے
ہوئے میں نے ان بزرگوں سے تحقیق کر کے خاندان کا ایک شجرہ تیار کیا تھا۔ علامہ اقبال

کی صحیح تاریخ پیدائش کا تعین کرنے کے لئے حکومتِ پاکستان نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔
میں اس کا ایک رکن تھا۔ اس کمیٹی کے ایک اجلاس میں کسی سلسلہ میں میرے تیار کردہ خاندانی
شجرے کا ذکر آیا تھا۔ وہ شجرہ میں نے کمیٹی میں پیش کیا تھا۔ مرحوم جسٹس رحمٰن سابق چیف جسٹس
پاکستان نے کہ وہ بھی اس کمیٹی کے ایک رکن تھے۔ اس شجرے کو دیکھ کر اس کے متعلق کچھ
استصواب بھی کئے تھے اور اس کی صحت کے متعلق اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ اس شجرے
کو شامل کتاب کیا گیا ہے۔

باب ۲

علامہ اقبال کے جدِّ اعلیٰ نے کب اسلام قبول کیا؟

علامہ اقبال کے سوانح نگار اب تک یہی لکھتے آرہے ہیں کہ اُن کے اجداد قریباً سوا دو سو سال ہوئے یعنی سترھویں صدی کے آخر میں مسلمان ہوئے۔ اس روایت کی ابتدا منشی محمد دین فوق کی تصنیف "مشاہیر کشمیر" سے ہوئی جس کا دوسرا ایڈیشن سنہ ۳۲ء میں شائع ہوا پہلے ایڈیشن کا سنِ اشاعت معلوم نہیں۔ سنہ ۳۲ء میں مجلہ "نیرنگ خیال" کا اقبال نمبر شائع ہوا اس میں فوق صاحب نے علامہ کے متعلق اپنے مشاہیر کشمیر والے مضمون کو من وعن (صرف سالِ پیدائش کی تبدیلی کے ساتھ) شائع کیا۔ پھر سنہ ۳۴ء میں اپنی تصنیف "تاریخ اقوام کشمیر" میں بھی یہی لکھا کہ علامہ کے جدِ اعلیٰ قریباً سوا دو سو سال ہوئے (عالمگیر کے زمانے میں مسلمان ہو گئے تھے" بعد کے سوانح نگاروں نے بھی اپنی تصانیف میں اسی انداز سے کو دہرا لیا ہے مثلاً تاج کمپنی کی حیاتِ اقبال مطبوعہ ۱۹۳۹ء صوفی غلام محی الدین کی انگریزی تصنیف KASHMIR۔ مولانا عبد السلام ندوی کی "اقبال کامل" مطبوعہ ۱۹۴۸ء اور مولانا سالک کی "ذکرِ اقبال" مطبوعہ ۱۹۵۵ء۔ علامہ اقبال کی ولادت کے صد سالہ جشن کے سلسلہ میں اقبال اکادمی لاہور کی شائع کردہ "سرگزشتِ اقبال" مرتبہ ڈاکٹر عبد السلام خورشید میں بھی ہمارے جدِّ اعلیٰ کے اسلام قبول کرنے کا زمانہ "اٹھارویں صدی کا آغاز" بیان کیا گیا

ہے۔ کسی سوانح نگار نے اس اندازے کی تائید میں کوئی سند پیش نہیں کی۔ علامہ کے والد نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہوا تھا کہ ان کے جس جدِّ اعلیٰ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ وہ ”لول حج“ کے عُرف سے مشہور ہوئے۔ ”لول حج“ کے متعلق خواجہ محمد اعظم شاہ دیدہ مری کی تاریخ کشمیر اعظمی اور ابو محمد حاجی محی الدین مسکین کی تالیف تحائف الابرار فی ذکر اولیائ الاخیار سے ثابت ہے کہ وہ بابا نصر الدینؒ کے مرید تھے۔ ان دونوں تصانیف میں بابا نصر الدین کا سن وفات ۱۴۵۱ء لکھا ہے۔ لہٰذا بابا لولی حاجی اس سے پہلے اسلام لا چکے ہوں گے۔ انہیں تصانیف سے یہ بھی ثابت ہے کہ بابا نصر الدینؒ کے مرید ہونے سے قبل بابا لولی حاجی ۱۲ سال کشمیر سے باہر سیر و سیاحت میں رہے اور واپس آکر بابا نصر الدینؒ کے مرید ہوئے اور باقی عمر ان کی صحبت میں گذاری۔ لہٰذا علامہ کے جدِّ اعلیٰ کا سوا دو یا ڈھائی سو سال پہلے سترھویں صدی میں عالمگیر کے زمانے میں یا اٹھارویں صدی کے آغاز میں اسلام قبول کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ بابا جی نے پندرھویں صدی کے نصف اول میں ۱۴۲۰ء اور ۱۴۲۵ء کے درمیان سلطان زین العابدین کے زمانے میں کسی وقت اسلام قبول کیا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

باب ۳

علامہ اقبال کے اجداد میں سے کس نے اور کب کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں سکونت اختیار کی

جیسا کہ شجرہ نسب میں دکھایا گیا ہے۔ علامہ کے پردادا کا نام شیخ جمال دین تھا۔ اُن کے چار بیٹے تھے۔ شیخ عبدالرحمٰن، شیخ محمد رمضان، شیخ محمد رفیق (علامہ کے دادا) اور شیخ محمد عبداللہ

اگرچہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے اجداد میں سے پہلے کس نے کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں سکونت اختیار کی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو شیخ جمال دین چاروں بیٹوں

سمیت یا ان کے چاروں بیٹے ترک وطن کر کے سیالکوٹ آ گئے۔ اول الذکر تین بھائی تو شہر سیالکوٹ میں آباد ہوئے اور شیخ محمد عبداللہ موضع جیٹھی کے ضلع سیالکوٹ میں ہمارے تینوں یکجدی گھرانوں کے افراد کا ہمارے ہاں اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ شادی غمی میں بھی شمولیت ہوتی تھی۔ ان تینوں گھرانوں کے علاوہ اور کسی ایسے گھرانے کا ہمیں علم نہیں جو بابا لولی حاجی یا شیخ محمد اکبر کی اولاد میں سے ہو اور سیالکوٹ یا پنجاب کے کسی دوسرے ضلع میں آباد ہو۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہو گا کہ شیخ جمال دین کے اوپر کے بزرگوں میں سے کسی نے کشمیر سے، سکونت ترک نہیں کی اور سب سے پہلے وہ معہ چاروں بیٹوں کے یا اُن کے چاروں بیٹے سیالکوٹ میں آ کر آباد ہوئے۔ شیخ محمد اکبر کے متعلق لکھا ہے کہ "انھوں نے کئی مرتبہ پنجاب کا سفر کیا" جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے کشمیر کی سکونت ترک نہیں کی تھی اگرچہ پنجاب آتے جاتے تھے۔

"ذکر اقبال" میں بیان کیا گیا ہے کہ علامہ کے اجداد "۱۸۵۷ء کے ہنگامے فرو ہونے کے بعد" کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں مقیم ہوئے۔ کتاب سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سالک صاحب سے یہ روایت کس نے بیان کی۔ راوی کوئی بھی ہو۔ یہ روایت امر واقعہ کے خلاف ہے۔ ہمارے دادا سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت وہ "گبھرو جوان" تھے۔ اگر گبھرو جوان سے بیس سالہ جوان سمجھا جائے تو ان کا سن پیدائش ۱۸۳۷ء بنتا ہے۔ ان کی وفات ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء کو ہوئی۔ اسی دن اباجان نے ایک یادداشت میں ان کی عمر "بحساب قمری ۹۶ اور بحساب شمسی ۹۳ سال" درج کی۔ اس حساب سے بھی سن پیدائش ۱۸۳۶ء ہی بنتا ہے وہ اپنے والدین کی گیارھویں اولاد تھے۔ ان سے پہلے ان کے والدین کے ہاں دس لڑکے پیدا ہوئے اور سب کے سب شیر خواری کی عمر میں فوت ہو جاتے رہے۔ اگر ان دس لڑکوں کی پیدائش اور وفات کا عرصہ ۲۰ سال فرض کیا جائے تو ان کے والدین کی شادی تقریباً ۱۸۱۳ء میں ہوئی ہو گی۔ ان کے والد شیخ محمد رفیق کی یہ دوسری شادی تھی جو جلال پور جٹاں ضلع گجرات کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی۔ ان کی پہلی شادی شہر سیالکوٹ کے

آتا ہے۔ اور "پر" کا روٹ وہی ہے جو ہمارے مصدر پڑھنا کا ہے۔ والد مرحوم کہتے تھے کہ یہ نام کشمیر کے برہمنوں نے اپنے اُن بھائی بندوں کو ازراہ تعریض و تحقیر دیا تھا، جنھوں نے قدیم رسوم و تعصبات قومی و مذہبی کو چھوڑ کر سب سے پہلے اسلامی زبان و علوم کو سیکھنا شروع کیا تھا جو رفتہ رفتہ ایک مستقل گوت ہو کر مشہور ہو گیا۔"

مجھے یاد ہے کہ جب میں اور بھائی آفتاب سیالکوٹ سکول میں پڑھتے تھے تو ہمارے دادا جان ہمیں پڑھائی میں محنت کی ترغیب دینے کے لئے کہا کرتے تھے کہ تم لوگ "سپرو" ہو اور لفظ "سپرو" پہلے "سب پڑھو" تھا۔ پھر رفتہ رفتہ مخفف ہو کر سپرو رہ گیا۔ لہٰذا تم کو علم حاصل کرنے کے لئے محنت کرنی چاہیئے۔ میرے پاس علامہ کی قلمی ایک رجسٹری شدہ دستاویز ہے جس میں انھوں نے اپنی قومیت "سپرو" (کشمیری پنڈت) لکھی ہے۔ اپنے کلام میں بھی انھوں نے اپنے آباؤ اجداد کے برہمن ہونے کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً "بیا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی۔ برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریزاست" لیکن یہ "برہمن زادہ" اظہار واقعہ کے طور پر کہا گیا ہے نہ کہ نسلی تفاخر کی وجہ سے۔ فخر تو انھیں حلقہ بگوش اسلام ہونے پر تھا۔ اپنے ابتدائی کلام میں فرماتے ہیں۔

بت پرستی کو مرے پیش نظر لاتی ہے
یادِ ایّام گذشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکہ اقبال
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

محقق بھی انسان ہوتے ہیں اور ان سے بھی غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ ریٹائرڈ لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید مرحوم ایک علم دوست بزرگ تھے اور انھوں نے تحقیق کے میدان میں کافی کام بھی کیا ہے۔ وہ ہماری بڑی چچی مرحومہ کے قرابت دار تھے۔ اس قرابت کی وجہ سے انھیں بڑی چچی مرحومہ کا نکاح نامہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس نکاح نامہ پر ایک صاحب "حاجی نور محمد ولد حاتم میر قوم کشمیری سکنہ سیالکوٹ" کے دستخط بطور گواہ نکاح ہیں۔ کرنل صاحب نے بغیر تحقیق فرض کر لیا کہ گواہ نکاح نور محمد خود علامہ کے والد

ہیں ۔اس غلط مفروضے کی بناء پر انھوں نے پاکستان ٹائمز کی ۱۲ جولائی ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں ایک مضمون انگریزی زبان میں "NEW LIGHT ON THE EARLY LIFE OF THE POET" کے عنوان کے تحت لکھا۔ اس مضمون میں علاوہ اور باتوں کے جو ایک خاص مقصد کے لئے لکھی گئیں جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ کرنل صاحب نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ کیا علامہ اقبال جیسا کہ وہ کہتے ہیں سپرو کشمیری پنڈت ہیں۔ کرنل صاحب نے فرمایا کہ نکاح نامہ میں علامہ اقبال کے والد کی ذات "میر" لکھی ہے اور کشمیر کے میر تو مغل ہیں لہذا علامہ کا "جز برہمن پسرے واقف اسرار کجاست" کا دعوے درست نہیں۔ علامہ کے والد کو حج کی سعادت حاصل نہ تھی نہ وہ کبھی حاجی نور محمد کہلائے ۔ نیز اُن کے والد کا اسم گرامی شیخ محمد رفیق تھا نہ کہ حاتم میر۔ جن حاجی نور محمد ولد حاتم میر کے دستخط بطور گواہ نکاح نامہ پر ہیں وہ ہماری کشمیری برادری کے ایک بزرگ تھے جن کے برادرزادے فضل دین میر سے بعد میں علامہ کے چچا غلام محمد کی نواسی کی شادی ہوئی ۔ اقبال "سپرو" نہ بھی ہوتے تو ان کی عظمت میں کوئی فرق نہ پڑتا، کیونکہ ان کی عظمت کا انحصار ان کی گوت کے تعین پر نہیں ۔ یہاں اس غلطی کی نشان دہی نسبی تفاخر کی وجہ سے نہیں کی گئی بلکہ صرف اس خیال سے کی گئی ہے کہ علامہ کے بیان کی صداقت پر حرف نہ آئے ۔

علامہ اقبال پر تحقیق کرنے والوں کے لئے اُن کے اُس ماحول سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے جس میں اُن کے کردار کی نشو و نما ہوئی۔ کہتے ہیں بچے کا ذہن ایک سادہ ورق کی طرح ہوتا ہے جس پر اس کے والدین ۔ اُس کے عزیز و اقارب۔ اس کے استاد اچھے یا بُرے نقوش ثبت کرتے ہیں جن سے اس کے کردار کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے ۔علامہ کے کلام اور اُن کی دوسری تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ذہن پر اپنے والدین کے اسلامی اقدار و اخلاق ۔ اپنے بڑے بھائی کی بے لوث محبت و ایثار اور اپنے استاد مولوی میر حسن کی علمیت و مروت کے بڑے گہرے نقوش تھے ۔ مؤخر الذکر بزرگ کے تفصیلی حالات مرتبہ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین اقبال اکادمی نے ۱۹۸۱ء میں شائع کر دیئے ہیں۔ باقی تین بزرگوں کے مختصر حالات لکھ دیتا ہوں جو امید ہے محققین کے لئے کارآمد ہوں گے۔

باب ۵

علامہ اقبال کے والد

علامہ اقبال کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا اور عرف شیخ نتھو۔ گھر میں اور محلے برادری میں سب انھیں "میاں جی" کہتے تھے۔ میاں جی کی پیدائش سے پہلے اُن کے والدین کے ہاں یکے بعد دیگرے دس لڑکے پیدا ہوئے جو ایام شیر خواری میں ہی فوت ہو جاتے رہے اُن دنوں جہالت کا دور دورہ تھا۔ مستورات میں ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ گنڈے کا عام رواج تھا۔ میاں جی کی پیدائش پر گھر کی مستورات نے منتیں مانیں۔ پیروں فقیروں سے دعائیں کرائیں اور ٹونے کے طور پر بچے کے ناک میں ایک چھوٹی سی نتھ ڈال دی گئی، جسے وہ بچپن میں کچھ سال پہنے رہے۔ یہ گویا اپنے زعم میں موت کے فرشتے کو یہ باور کرانے کی جاہلانہ کوشش تھی کہ بچہ لڑکا نہیں لڑکی ہے۔ نتھ کی وجہ سے نتھو عرف پڑ گیا۔ اس ٹونے کا اثر تو کیا ہونا تھا۔ کسی بزرگ کی دعا قبول ہوئی اور میاں جی نے طویل عمر پائی۔

میں نے ہوش سنبھالا تو اس وقت میاں جی کی عمر ۶۵ سال سے اوپر تھی۔ وہ بلند قامت اور وجیہہ صورت تھے۔ چہرہ نورانی۔ رنگ کندن کی طرح۔ سر اور داڑھی کے بال سفید۔ بڑے بُردبار۔ متحمل مزاج اور حلیم طبع تھے۔ ان کے والد کا چھوٹا موٹا کاروبار کپڑے اور کشمیری دُھسوں کی فروخت کا تھا۔ ایسے کاروبار کو بڑھانے کے لئے سرمائے کی

ضرورت ہوتی ہے جو عنقا تھا اس لئے آمدنی محدود تھی۔ جوان ہونے پر میاں جی نے پارچہ دوزی کا کام سیکھا تاکہ اس کام سے گھر کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ پنجاب میں انگریز کی حکومت قائم ہوئی تو کچھ عرصہ تک محکمۂ مال اور عدالتوں کے لئے افسران اور اہلکار صوبۂ متحدہ (حال اُترپردیش ہندوستان) سے لائے جاتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک صاحب وزیر علی بلگرامی نام سیالکوٹ میں تعینات ہوئے۔ انہیں فوجداری اختیارات بھی حاصل ہوں گے کیونکہ "ڈپٹی وزیر علی" کے نام سے معروف تھے۔ ایک عرصہ تک سیالکوٹ میں مقیم رہے۔ بڑے ہر دلعزیز افسر تھے۔ کچھ تصوف سے بھی دلچسپی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے میاں جی سے رابطہ قائم ہوا اور انہوں نے میاں جی کو اپنے ہاں پارچہ دوزی کے لئے ملازم رکھ لیا۔ ان دنوں کپڑا سینے کی مشین ایک نادر چیز تھی۔ ڈپٹی صاحب نے ایک مشین منگوائی جو سیالکوٹ میں آنے والی پہلی مشین تھی۔ کچھ عرصہ بعد میاں جی نے ڈپٹی وزیر علی کے ہاں کی ملازمت ترک کر دی۔

اس ملازمت کے ترک کرنے کے متعلق بھی کچھ غلط روایات مشہور ہو گئی ہیں۔ مثلاً "ذکر اقبال" میں لکھا ہے "معتبر حضرات کا بیان ہے کہ شیخ نور محمد کی اہلیہ (علامہ کی والدہ) ان کی تنخواہ میں سے ایک حبہ نہیں لیتی تھیں کیونکہ ان کے نزدیک ڈپٹی وزیر علی کی آمدنی کا غالب حصہ شرعاً جائز نہ تھا چنانچہ تھوڑی مدت بعد شیخ نور محمد نے ملازمت ترک کر دی"۔ یہ معتبر حضرات کون تھے جنہوں نے مولانا سالک سے یہ روایت بیان کی اور ان تک یہ روایت کیسے پہنچی۔ اس کا کتاب میں کوئی ذکر نہیں۔ اُن "معتبر حضرات" نے یہ روایت بیان کر کے بے چارے ڈپٹی صاحب پر ناواجب اتہام تراشی کی۔ خود میاں جی نے ملازمت ترک کرنے کی جو وجہ میری موجودگی میں ایک عزیز سے بیان کی وہ ان معتبر حضرات کی بیان کردہ روایت سے مختلف ہے۔ ایک دن ایک عزیز کے ساتھ اکلِ حلال پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ڈپٹی وزیر علی کے ہاں پارچہ دوزی کے لئے ملازم ہوئے تو کچھ عرصہ بعد تجربے سے معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب کے ہاں پارچہ دوزی کا کام تو برائے نام ہے اور اتنا نہیں کہ ایک ہمہ وقت خیاط کی ضرورت

ہر ہاں حاضر باشی اور مصاحبت کا کام البتہ کافی ہے۔ ڈپٹی صاحب کو تصوف سے کچھ لگاؤ تھا اور فرصت کے اوقات میں وہ اکثر میاں جی سے اس موضوع پر گفتگو کرتے تھے میاں جی نے فرمایا کہ ان حالات میں اُن کے دل میں یہ خلش رہتی تھی کہ ڈپٹی صاحب سے جو تنخواہ انہیں پارچہ دوزی کے لئے ملتی ہے۔ اس کا زیادہ حصہ اکل حلال نہیں۔ دو ایک مرتبہ انہوں نے ڈپٹی صاحب سے ملازمت ترک کرنے کی اجازت چاہی لیکن وہ بات کو ٹال جاتے۔ ایک دن میاں جی کے اصرار پر فرمایا معلوم ہوتا ہے آپ کو ہمارے ہاں کوئی تکلیف ہے جو ملازمت چھوڑنا چاہتے ہیں۔ اگر تکلیف بیان کر دیں تو اس کا ازالہ کر دیا جائے۔ مجبوراً میاں جی کو اپنی ذہنی خلش کا اظہار کرنا پڑا جسے سن کر وہ بہت متاثر ہوئے اور ترک ملازمت کی اجازت دے دی۔ میاں جی رخصت ہونے لگے تو ملازم کو حکم دیا کہ کپڑا سینے کی مشین شیخ صاحب کے ہاں پہنچا دی جائے۔ مشین تو ڈپٹی صاحب کی ملکیت تھی۔ اس لئے میاں جی نے عذر کیا تو فرمایا ہمیں تو اب اس کی ضرورت نہیں اور آپ کے کام کی چیز ہے اور بہرحال ہمارا کام بھی تو آپ کیا ہی کریں گے۔ میاں جی نے کہا کہ اگرچہ ملازمت کا تعلق تو ڈپٹی صاحب سے ختم ہو گیا لیکن اُن سے دوستانہ تعلق قائم رہا۔

ڈپٹی وزیر علی کی ملازمت ترک کرنے کے بعد میاں جی نے پارچہ دوزی کا اپنا کام شروع کیا لیکن اس کام میں ایک نئی راہ نکالی۔ اُن دنوں پردہ دار خواتین ایک سفید رنگ کا برقعہ استعمال کرتی تھیں۔ میاں جی نے ایسے برقعہ کے لئے ایک ٹوپی تیار کی جو بڑی خوشنما اور پائیدار تھی اور برقعوں کے علاوہ مردوں کے استعمال میں بھی آ سکتی تھی۔ ٹوپی بہت جلد مقبولِ عام ہو گئی اور اس کی مانگ اتنی بڑھی کہ میاں جی کو کچھ درزی ملازم رکھنے پڑے۔ نتھو عرف کے اشخاص تو شہر میں کئی تھے۔ لہذا تشخص کی خاطر میاں جی کو "شیخ نتھو ٹوپیاں والے" کہا جانے لگا۔ یہاں تک کہ مستورات میں ہمارے گھر کو بھی "ٹوپیاں والوں" کا گھر کہا جاتا۔ میاں جی کا کام تو خوب چل نکلا لیکن ان کو علما اور صوفیا سے ملنے ملانے کا بڑا شوق تھا۔ ان کے ہم مشرب اور ہم خیال جمع ہوتے تو گھنٹوں علمی گفتگو ہوتی لہذا کاروبار کی طرف توجہ کم ہونے لگی۔ جب میرے ابا جان اپنی ملازمت

سے گھر کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو گئے تو میاں جی نے ٹوپیوں کا کاروبار اپنے داماد غلام محمد کے حوالے کر دیا۔ جسے انھوں نے اپنے پاس رکھ کر یہ کام سکھایا تھا اور خود کاروبار سے علیحدہ ہو گئے۔ یہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی بات ہے کیونکہ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد میاں جی کو کوئی کاروبار کرتے نہیں دیکھا۔ اُن کے ہم مشرب اکثر اُن کے ہاں جمع ہوتے اور وحدت الوجود اور "اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے" پر گفتگو ہوتی

علامّہ اقبال کی ولادت کی صد سالہ تقریبات کے سلسلہ میں مجلس ترقی ادب لاہور نے ایک کتاب "روایات اقبال" کے عنوان سے شائع کی ہے، جسے ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے مرتب کیا ہے۔ اس میں جہاں کئی اور غلط روایات درج ہیں وہاں سیّد محمد ذکی کی یہ روایت بھی درج ہے کہ میاں جی نے "دکان اس وقت چھوڑی جب ڈاکٹر صاحب بہت مشہور ہو گئے اور انھوں نے مجبور کیا کہ اب کام چھوڑ دیں اور آرام کریں"۔ یہ روایت درست نہیں کیونکہ علامّہ اقبال "بہت مشہور" تو انگلستان سے واپس آنے کے کچھ سال بعد ہوئے اور میاں جی تو اُن کے انگلستان جانے سے بھی پہلے کاروبار بند کر چکے تھے۔

میاں جی نے کسی مکتب میں یا کسی اُستاد سے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی لیکن اپنے علمی ذوق اور مذہبی علوم سے شغف کی وجہ سے علما اور صوفیوں کی صحبتوں سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔ شاید اہل علم کی صحبتوں میں بیٹھنے کا اثر تھا کہ اپنی وہبی ذہانت کی وجہ سے اردو اور فارسی کی چھپی ہوئی کتابیں پڑھ اور سمجھ سکتے تھے۔ چچا جان کی اسرار خودی۔ رموز بیخودی، پیام مشرق۔ بانگ درا اور زبور عجم میاں جی کی حیات میں شائع ہو گئی تھیں۔ جب کوئی کتاب شائع ہوتی اس کا ایک نسخہ میاں جی اور میرے ابا جان کے لئے ضرور بھیجا جاتا۔ وہ کتابیں بالخصوص ہر دو مثنویات اکثر میاں جی کے زیر مطالعہ رہتیں۔ کبھی کبھی مجھ سے پڑھوا کر بھی سنتے لیکن مثنویات اکیلے بیٹھے اونچی آواز سے پڑھتے اور بے اختیار روتے۔ بے جی کا انتقال ہوا تو میاں جی کو سخت صدمہ ہوا۔ کئی دن طبیعت بہت نڈھال رہی۔ ایک دن مجھے کاغذ قلم لانے کو کہا۔ فرمایا جو کچھ

میں لکھاؤں لکھتے جاؤ اور اسے اپنے چچا کو بھیج دو۔ میں سمجھا شاید چچا جان کو خط لکھوائیں گے۔ میں لکھنے بیٹھا تو انہوں نے سوچ سوچ کر شعر لکھوانے شروع کر دیئے۔ دو یا تین نشستوں میں کچھ شعر لکھوائے جن میں۔ سے صرف یہ شعر مجھے یاد رہ گیا ہے

یہ تنہا زندگی پیری میں نصف الموت ہوتی ہے
نہ کوئی ھم سخن اپنا نہ کوئی رازداں اپنا

وہ اشعار میں نے چچا جان کو بھیج دیئے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کاتب سے خوشخط لکھوا کر سیالکوٹ بھجوائی۔ آخری دو صفحوں پر میاں جی کے لیے انھوں نے نظم کے ہر بند کی مختصر تشریح بھی اپنے قلم سے لکھی۔ میاں جی وہ نظم بھی اکثر پڑھا کرتے اور زار زار روتے۔ کاتب کی لکھی ہوئی یہ نظم بھی معہ چچا جان کی قلمی تشریح میرے پاس محفوظ تھی جواب میں نے پاکستان نیشنل میوزیم کی تحویل میں دے دی ہے

عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ میاں جی ارشاد نبوی "خَیرُکُم خَیرُکُم لاَ ھلِیہٖ" پر ذرا زیادہ ہی عمل کرتے ہیں کیونکہ گھر کے انتظام میں بے جی مختار مطلق تھیں۔ میاں جی کسی معاملہ میں دخل انداز نہ ہوتے اور انھیں ہمیشہ بے جی کی خوشنودی مدنظر رہتی لیکن یہ بھی دیکھا گیا کہ جب کبھی کوئی اصول کا سوال آ گیا تو" بریشم کی طرح نرم" میاں جی نے "خوئے حریری" کی بجائے فولاد کی خاصیت اختیار کر لی اور پھر بے جی بھی جن کی بات وہ بہت کم ٹالتے تھے انھیں اپنے موقف سے ہٹانے میں ناکام رہتیں۔ اس سلسلہ میں دو مثالیں یاد آتی ہیں جو میاں جی کے کردار پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ہمارے بزرگوں نے جب محلہ چوڑیگراں میں سکونت اختیار کی تو ارد گرد کے ہمسایہ گھرانوں کی طرح ان کی مالی حالت بھی کچھ ایسی اچھی نہ تھی۔ جب میاں جی کا کاروبار چل نکلا اور میرے ابا جان بھی ملازم ہو گئے تو مالی حالت کچھ بہتر ہو گئی۔ ہماری یہ نسبتاً خوشحالی بعض ہمسایوں کو برہنائے حسد خوش نہ آئی اور وہ میاں جی کو ایذا پہنچانے کے درپے ہو گئے۔ جب اُسی محلہ میں میاں جی نے ایک اور مکان -/۳۰۰ میں خرید کر نو تعمیر کرایا تو محلے والے مخالفین نے اس میں ہر طرح کی رکاوٹیں ڈالیں۔ یہاں تک کہ مکان کی کھڑکیوں کے

عین نیچے محلے کے کھلے میدان میں ایک بھٹیارن کا تندور لگرا دیا۔ جس کا دھواں مکان کے اندر جاتا تھا۔ آخر معاملہ دیوانی عدالت میں گیا۔ ڈھائی سال بعد فیصلہ ہمارے حق میں ہوا۔ عدالت کے حکم سے تندور اٹھوایا گیا۔ مقدمہ کا خرچہ فریق ثانی پر ڈالا گیا۔ جس کے ادا کرنے کی توفیق اُن میں کہاں تھی۔ لہذا میاں جی نے وصولی کی کارروائی نہ کی۔ رفتہ رفتہ میاں جی اور بے جی کے حسنِ سلوک سے محلے والے رام ہو گئے۔ صرف اس مخالفت کے سرغنہ کے دل سے کدورت دور نہ ہوئی۔ یہ صورت حالات تھی کہ شہر میں طاعون کی وبا شدت سے پھوٹ پڑی۔ بیسیوں اشخاص روز مرنے لگے۔ ہمارا یہ پڑوسی بھی اس مرض کا شکار ہوا اور حالت نازک ہو گئی لیکن جان نکلنے کا نام نہ لیتی تھی۔ موت وحیات کی ایسی کشمکش میں انسان کو اپنی زیادتیوں کا احساس ہوتا ہوگا۔ یہ صاحب بھی ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ اُس نے اپنے گھر کے لوگوں سے کہا کہ جب تک میاں جی آکر میرا قصور معاف نہیں کریں گے، میری جان نہیں نکلے گی۔ اس کی بیٹی روتی ہوئی ہمارے گھر آئی اور بے جی سے یہ کیفیت بیان کر کے خواہش کی کہ میاں جی اُن کے گھر چل کر اُس کے باپ کو معافی دے آئیں۔ بے جی کو تو طاعون زدہ گھر سے اس لڑکی کا آنا بھی ناگوار ہوا تھا۔ وہ میاں جی کے وہاں جانے پر کیسے رضامند ہو جاتیں۔ انھوں نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ تم اپنے باپ سے کہہ دو کہ میاں جی کے دل میں اس کے متعلق کوئی کدورت نہیں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ لڑکی کے رونے کی آواز سن کر میاں جی بھی آ گئے۔ جب انہیں جاں بلب مریض کی خواہش کا علم ہوا تو بلا تامل ان کے ہاں جانے پر آمادہ ہو گئے۔ بے جی نے بتیہرا منع کیا لیکن انھوں نے ایک نہ سُنی۔ وہ منع کرتی رہ گئیں اور میاں جی اپنے لٹھے کے بڑے رومال کو جو باہر جاتے وقت ہمیشہ ساتھ رکھتے، کندھے پر ڈال کر لڑکی کے ہمراہ اس کے گھر چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر مریض کی چارپائی کے پاس پیڑھی پر بیٹھ گئے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اطمینان دلایا کہ اُن کے دل میں اس کے متعلق کوئی کدورت نہیں۔ وہ رونے لگا تو اسے کہا کہ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان لگاؤ۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے کچھ دعائیں پڑھتے رہے۔ رفتہ رفتہ

مریض کو سکون ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ فوت ہو گیا۔ میاں جی نے اُٹھ کر اس کا منہ قبلہ رُخ کیا۔ پھر تجہیز و تکفین کے انتظامات کرائے۔ کفن اپنے ہاتھ سے تیار کیا اور خود ساتھ جا کر دفنایا۔ قبرستان سے گھر آکر غسل کیا اور کپڑے تبدیل کیے۔ بے جی منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ وہ اپنے غصے کا اظہار کرنے لگیں تو انہیں یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ جیل والے بھی پھانسی پانے والے قاتل کی آخری خواہش پوری کر دیتے ہیں اور مرحوم مخالف سہی لیکن ہمارا پڑوسی تھا اور مخالف پڑوسی کے ساتھ بھی اچھے سلوک کا حکم ہے۔ یہ واقعہ میرے لڑکپن کا ہے بڑ میں نے کئی مرتبہ گھر کی اور محلے کی مستورات سے اور خود مرنے والے کی بیٹی سے جس کو ہم خالہ کہا کرتے تھے سنا ہوا ہے۔

دوسرے واقعہ کا مجھے ذاتی علم ہے۔ سیالکوٹ کے اڈہ شہباز خاں کے قریب کچھ دکانیں میاں جی کے پاس رہن یا قبضہ تھیں۔ جن کا معمولی کرایہ آتا تھا۔ ایک دن ہمارے پھوپھا غلام محمد نے میاں جی سے کہا کہ ان میں سے دو دُکانیں ایک شخص کرایہ پر مانگتا ہے اور موجودہ کرائے سے دُگنا کرایہ دینے پر تیار ہے۔ لہٰذا جو کرایہ دار اُن میں آباد ہیں اُن سے وہ دکانیں خالی کرا کر زیادہ کرایہ دینے والے کو دے دی جائیں۔ میاں جی نے جواب دیا کہ جب تک موجودہ کرایہ دار اپنے معاہدے کے مطابق کرایہ ادا کرتے جائیں انہیں زیادہ کرایہ کے لالچ میں بے دخل کرنا اُن کے اصول کے خلاف ہے۔ جب وہاں دال نہ گلی تو پھوپھا جی نے بے جی کو اپنی تائید کے لئے آمادہ کیا کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ میاں جی اُن کی بات نہیں ٹالتے۔ بے جی نے بھی میاں جی سے بہت کہا کہ سب طرف کرائے بڑھ رہے ہیں۔ جب زیادہ کرایہ دینے والا کرایہ دار ملتا ہے تو یا موجودہ کرایہ دار کو کرایہ بڑھانے کے لئے کہیں یا جو زیادہ کرایہ دینے پر تیار ہے اس کو دے دیں، لیکن میاں جی نے دونوں باتوں سے انکار کر دیا اور اپنی بات پر اَڑے رہے کہ جب تک معاہدہ کے مطابق مقررہ کرایہ ادا ہوتا رہے گا وہ نہ تو کرایہ دار کو کرایہ بڑھانے کیلئے کہیں گے نہ اُسے بے دخل ہی کریں گے۔

مثنوی رموزِ بے خودی میں علاّمہ نے اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کیا ہے

کہ ایک سائل بھیک مانگتا ہوا ان کے دروازے پر آیا جو کسی طرح ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا
اس کے بار بار صدا دینے سے برہم ہو کر اُنھوں نے سائل کو مارا۔ جس سے اس کی جھولی
میں جو کچھ تھا وہ گر گیا۔ اُن کی اس حرکت پر اُن کے والد بہت آزردہ ہوئے اور اُن
سے کہا کہ حشر کے دن حبیب خیر الرسلؐ کی اُمّت اُن کے حضور جمع ہو گی تو اس مجمع میں
یہ گدائے دردمند تمھارے اس سلوک کے خلاف حضور رسالتمآبؐ فریاد کر کے مجھے
نادم کرے گا۔ اس وقت :

اے صلاطت مشکل از بے مرکبی	من چہ گویم چوں مرا پرسد نبیؐ
حق جوانے مسلمے با تو سپرد	کو نصیبے از دبستانم نہ برد
از تو ایں یک کارِ آساں ہم نہ شد	یعنی آں انبارِ گل آدم نہ شد
اندکے اندیش و یاد آر اے پسر	اجتماع اُمّت خیر البشر
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر	لرزۂ بیم و امیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن	پیش مولاؐ بندہ را رسوا مکن

اگرچہ یہ واقعہ میری پیدائش سے بھی پہلے کا ہے لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا
ہوں کہ میاں جی نے وہی کچھ کہا ہو گا جو علاّمہ نے ان دردناک اشعار میں قلمبند کیا ہے
کیونکہ میاں جی کے نصیحت کرنے کا یہی انداز تھا۔ وہ جب کسی امر کی تاکید کرتے یا کسی
بات سے منع کرتے تو اکثر قرآن کریم سے یا اُسوۂ رسول کریمؐ کے حوالے سے کرتے اور
اُن کی نصیحت میخ کی طرح دل میں گڑ جاتی۔ چچا جان کے ساتھ تو یہ تکنیک خصوصیت سے
استعمال کرتے اور وہ اپنی بات پر کتنے ہی اڑے ہوتے ہوتے قرآن کریم اور رسول کریمؐ
کی سند سنتے ہی اپنی بات چھوڑ دیتے۔ ایسے دو ایک واقعات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ
ہو گا۔

ہماری سب سے چھوٹی پھوپھی زینب کی شادی وزیرآباد کے ایک گھرانے میں
ہوئی تھی۔ شادی کے بعد دو تین سال تک اُن کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ اُن کی ساس
نے بیٹے کی دوسری شادی کر دی۔ ہماری پھوپھی میکے آگئیں اور کئی سال وہیں رہیں۔ اس

اثنا میں معلوم نہیں کیوں اُن کی ساس نے بیٹے کی ایک اور شادی بھی کر دی۔ ہمارے پھوپھا ایک سعادت مند بیٹے کی طرح اپنی والدہ کی زندگی میں پوری طرح اُن کی اطاعت کرتے رہے لیکن اُن کی وفات کے بعد انھوں نے ہماری پھوپھی کو گھر لے جانا چاہا۔ مہینوں کوشش جاری رکھی۔ بار بار میاں جی کے پاس اپنے اور ہمارے رشتہ داروں کو بھیجتے رہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد میاں جی اور بے جی مصالحت پر رضامند ہو گئے۔ میرے اباجان باہر ملازمت پر تھے۔ انھوں نے بھی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ایک دن ہمارے پھوپھا اپنے کچھ عزیزوں کو لے کر ہمارے ہاں آ گئے۔ اتفاق سے ان دنوں چچا جان بھی سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ انھیں ابھی یہ علم نہ تھا کہ ہمارے پھوپھا کئی مہینوں سے مصالحت کے لئے کوشاں ہیں۔ جب اُن کو پھوپھا جی کی آمد اور آمد کی غرض کا علم ہوا تو بڑے برہم ہوئے۔ میں نے کبھی انہیں اتنے غصّے میں نہیں دیکھا۔ میاں جی نے بہت سمجھایا لیکن وہ یہی کہتے رہے کہ مصالحت کی کوئی ضرورت نہیں۔ آنے والوں کو واپس کر دیا جائے۔ آخر میاں جی نے جب دیکھا کہ وہ کسی صورت رضامند نہیں ہوتے تو فرمایا کہ قرآن کریم میں تو اللہ تعالےٰ نے "والصّلحُ خیرٌ" فرمایا ہے۔ یہ سُننا تھا کہ چچا جان بالکل خاموش ہو گئے۔ سب جوش وخروش جاتا رہا۔ میاں جی نے کچھ دیر توقف فرمایا۔ پھر چچا جان سے مخاطب ہو کر دریافت کیا کہ پھر کیا فیصلہ کیا جائے۔ انھوں نے کہا وہی جو قرآن کریم کہتا ہے۔ چنانچہ مصالحت ہو گئی اور کچھ دنوں بعد پھوپھا غلام رسول پھوپھی زینب کو رخصت کرا کر گھر لے گئے۔ اس وقت پھوپھا جی کی دونوں دوسری بیویاں حیات تھیں۔ اور دونوں سے بہت سی اولاد بھی تھی۔ باوجود اس کے قرآنی قول کے مطابق یہ صلح خیر ہی ثابت ہوئی۔ پہلی بیوی ہونے کی حیثیت سے گھر کا پورا اختیار ہماری پھوپھی کو حاصل رہا کبھی کوئی قابل ذکر شکر رنجی نہ دوسری بیویوں کے ساتھ ہوئی نہ سوتیلی اولاد کے ساتھ۔ سب بچوں کی شادیوں کا انتظام ہماری پھوپھی نے ہی کیا۔ یہاں تک کہ ایک سوکن کی بیٹی کی شادی میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ اور دوسری سوکن کے بیٹے کی شادی میری چھوٹی ہمشیرہ کے ساتھ کرائی۔ پھوپھا غلام رسول بڑے زیرک اور معاملہ فہم بزرگ تھے

مصالحت کے تھوڑے ہی عرصہ بعد چچا جان کو اُن پر اس قدر اعتماد ہو گیا تھا کہ اپنے اکثر نجی کاموں کا انصرام انہیں کے سپرد فرماتے تھے۔

میرے لڑکپن کے زمانے میں ہمارے گھر کے سامنے والے بازار چوڑیگراں میں سبزی فروش سبزیاں فروخت کیا کرتے تھے۔ اُن کی باقاعدہ دکانیں نہ تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف سبزیوں کے ٹوکرے رکھ لیتے اور زمین پہ بیٹھ کر انہیں فروخت کرتے شام کو اگر کچھ مال بچ رہتا تو وہ کسی کی دکان میں رکھوا جاتے۔ ان سبزی فروشوں میں سیالکوٹ کے قریب کے ایک گاؤں کا رہنے والا بابا بوٹا تھا۔ وہ اپنے ٹوکرے میاں جی کی اجازت سے ہمارے مکان کی نچلی منزل میں رکھ جایا کرتا تھا۔ ایک دن ہم لڑکوں نے اس کے ایک ٹوکرے میں بیر رکھے پائے اور ان میں سے کچھ بیر نکال کر کھا لئے۔ بے جی کو علم ہوا تو انھوں نے ایک آفت مچائی۔ بابا بوٹا بے چارہ کہتا ہی رہا کہ بچوں نے کھا لئے تو کیا ہوا لیکن بے جی نے سب کی پٹائی کی۔ میاں جی کو بھی اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ اُس دن تو خاموش رہے۔ دوسرے دن صبح جب بازار سے سودا خریدنے گئے تو بڑے عمدہ بیر خرید کر لائے۔ سب لڑکوں کو بلایا اور بیر سامنے رکھ دیئے جو سب نے شوق سے کھائے۔ کھا چکے تو میاں جی نے دریافت کیا، کیوں بھئی یہ بیر مزیدار تھے یا وہ مُردے کا گوشت جو تم لوگوں نے کل کھایا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ جب ہم نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا تو فرمایا کہ بابا بوٹے کا سامان جو وہ ہمارے ہاں رکھ جاتا ہے ہمارے پاس امانت ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں امانت میں خیانت نہ کرنے کا بار بار حکم آیا ہے۔ امانت کا مال کھانا مُردے کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔ کل والے بیر جو تم لوگوں نے کھائے مُردے کا گوشت تھا۔ یہ سُن کر میاں جی کے لائے ہوئے بیروں کا مزہ بھی جاتا رہا لیکن بابا بوٹے کا مال جو ہمارے ہاں رکھا جاتا تھا ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو گیا۔

میاں جی بڑے رقیق القلب تھے۔ عید پہ ہمیشہ قربانی کے لئے بازار سے جانور خرید کر قربانی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ابا جان نے اپنی جائے ملازمت سے

ایک اچھی نسل کے دنبے کا بچہ بھیجا کہ قربانی کے لئے گھر میں پال کر عید پر قربان کیا جائے میاں جی خود اس کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ عید کے دن جب قربانی کے لئے چھری ہاتھ میں لے کر تیار ہوئے تو اُس نے ایسی ملتجی نظروں سے میاں جی کی طرف دیکھا کہ وہ بے چین ہو گئے۔ چھری ہاتھ سے رکھ دی اور قصاب کو ذبح کرنے کی اجازت دے کر وہاں سے چلے گئے۔ اس کے بعد نہ کبھی قربانی کے لئے جانور پالا نہ اپنے ہاتھ سے قربانی کی۔ عید کے دو ایک دن قبل بازار سے جانور خرید کر لاتے اور قصاب ذبح کر دیتا۔ خود پاس بھی کھڑے نہ ہوتے۔ فرماتے اُس دُنبے کی رحم طلب نگاہیں یاد آجاتی ہیں

ہماری منجھلی پھوپھی کریم بی بڑی عابدہ خاتون تھی۔ اُن کے پاس اولیاءؒ اللہ کی کرامات کے ذکر کی کئی کتابیں تھیں، مَیں بھی اُن کتابوں کو شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ پھوپھی جی اکثر "اسمِ اعظم" کی کرامات کا ذکر کرتیں۔ ایک دن انھوں نے کہا کہ میاں جی کو" اسمِ اعظم" معلوم ہے اور انھوں نے بھائی صاحب (چچا جان) کو بتلایا ہوا ہے۔ اس کے بعد جب چچا جان عدالتوں کی چھٹیوں میں سیالکوٹ آئے تو میں نے ایک دن پاؤں دابتے ہوئے پوچھا کہ کیا میاں جی نے آپ کو "اسمِ اعظم" بتلایا ہوا ہے۔ مسکرا کر فرمایا تم میاں جی سے ہی پوچھنا۔ کچھ دنوں بعد میں نے میاں جی سے دریافت کیا کہ" اسمِ اعظم" کیا ہے اور کیا آپ نے چچا جان کو بتلایا ہوا ہے۔ اُنہوں نے فرمایا مجھے کوئی ایسا اسمِ اعظم معلوم نہیں جس کو جادو منتر کی طرح پڑھیں اور ہر مشکل آسان ہو جائے۔ ہاں اللہ تعالیٰ سے دعا ضرور حلِ مشکلات کرتی ہے۔ اس لئے دعا ہی اسمِ اعظم ہے۔ فرمایا قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات درج ہیں۔ جن کے واسطے سے دعا کرنی چاہیئے۔ مثلاً اگر صحت کے لئے دعا ہے تو" یا شافی" کہہ کر۔ اگر کشائش رزق کے لئے دعا ہے تو "یا رزاق" کہہ کر وقس ہذا لیکن شرط یہ ہے کہ الفاظ صرف زبان ہی سے نہ نکلیں بلکہ دل سے نکلیں اور دل اللہ تعالیٰ کی اس صفت پر یقین بھی رکھتا ہو۔ فرمایا قبولیت دعا کے لئے ہر دعا سے قبل اور بعد حضور سرورِ کائناتؐ پر درود بھیجنا چاہیئے کہ درود سے بڑھ کر کوئی اسمِ اعظم نہیں اور اقبال کو مَیں نے اسی اسمِ اعظم کی تلقین کی ہے

ایک اور موقعہ پر فرمایا کہ اسمائے الٰہی میں سے "یا حیّ" و "یا قیوم" کا ورد بکثرت کرنا چاہیئے۔ اقبال کو بھی میں نے اس کی تاکید کی ہوئی ہے۔

میاں جی کو اہلِ اللہ سے عقیدت تھی۔ جوانی میں اہلِ علم اور صوفیا کی مجالس میں شرکت کا بھی شوق رہا تھا۔ محمد دین فوق نے اپنے ایک مضمون میں چچا جان کی روایت کی بناء پر لکھا ہے کہ علامہ کے والد سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے۔ ایک مرتبہ میری موجودگی میں چچا جان نے ایک صاحب سے بیان کیا تھا کہ ان کے والد گوجرانوالہ کے کسی گاؤں میں ایک بزرگ سے ملنے جایا کرتے تھے۔ انہوں نے ان بزرگ کا یا گاؤں کا نام نہیں لیا تھا۔ میاں جی کا پیروں اور بزرگوں کے ہاں آنا جانا میری پیدائش سے پہلے کی باتیں ہیں۔ ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے انہیں کبھی کسی پیر یا بزرگ کے ہاں جاتے دیکھا نہ سنا نہ کبھی گھر میں اس قسم کا کوئی چرچا ہوا۔ اتنا یاد ہے کہ ہمارے لڑکپن میں ایک خوشرو کشمیری نوجوان سردیوں میں کشمیر سے آیا کرتے تھے۔ دو ایک دن ہمارے ہاں بھی قیام کرتے۔ گھر میں کہا جاتا تھا کہ وہ ہمارے پیروں کے گھرانے سے ہیں ممکن ہے بابا نصر الدین کی اولاد میں سے ہوں۔ واللہ اعلم۔ اُن کو بھی صرف تین چار سال آتے دیکھا۔ میاں جی کے کچھ صوفی منش ہم مشرب ہمارے لڑکپن میں ضرور اُن سے ملنے آتے تھے جن سے گفتگو رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ مجلسیں بھی ختم ہو گئیں۔ مولانا میر حسن کے ساتھ میل ملاقات البتہ جاری رہی۔ وہ سرسیّد کے معتقد تھے۔ ممکن ہے ان کی صحبت کے اثر کی وجہ سے روایتی پیری مریدی سے پہلے سا شغف نہ رہا ہو۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں ہمارے شہر میں احمدیت کا چرچا بھی شروع ہو چکا تھا اور میاں جی اُس سے بھی کچھ عرصہ وابستہ رہے تھے بہر حال میں نے انہیں کسی پیر کے ہاں آتے جاتے نہیں دیکھا۔

میاں جی کا لباس سادہ لیکن صاف ستھرا ہوتا تھا۔ زیادہ تر ململ کا کرتا اور لٹھے کی شلوار پہنتے تھے۔ سر پر ململ کی سفید پگڑی۔ گھر میں سر پر ململ کی چوگوشہ ٹوپی پہنتے جو بہت ہلکی ہوتی تھی۔ کہیں تقریب میں جانا ہو تو واسکٹ اور کوٹ بھی پہن لیتے۔ کندھے پر لٹھے کا سفید رومال باہر جاتے وقت رکھتے۔ ہماری جان پہچان والے

گھروں سے اور کبھی کبھی ایسے گھرانوں سے بھی جن سے ہماری کوئی واقفیت نہ ہوتی۔ میاں جی کے استعمال کئے ہوئے کرتوں کی بڑی مانگ رہتی۔ بڑی بوڑھیوں کا کہنا تھا کہ اگر میاں جی کے استعمال شدہ کرتے سے نومولود بچے کا کرتا تیار کر کے پہنایا جائے تو بچہ میاں جی کی طرح نیک، صاحب نصیب اور بڑی عمر والا ہوگا۔ اگرچہ میاں جی اسے مستورات کی ضعیف الاعتقادی سمجھتے تھے لیکن یہ کہہ کر کرتا دے دیا کرتے:۔ "اچھا ایک شریک اور آگیا۔ اَللّٰهُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

میاں جی کے ایک چھوٹے بھائی تھے۔ جن کا نام غلام محمد تھا۔ ان کو بھی تصوّف سے بڑا لگاؤ تھا۔ ایک دن میں نے میاں جی کو چچا جان سے اُن کا اور تصوّف سے اُن کی دلچسپی کا ذکر کرتے سنا تھا۔ وہ نہر کے محکمہ میں ملازم تھے اور ضلع انبالہ میں روپڑ کے مقام پر تعینات تھے۔ میاں جی کے والد شیخ محمد رفیق اپنے چھوٹے بیٹے سے ملنے روپڑ گئے ہوئے تھے کہ وہیں انتقال کر گئے۔ میاں جی کے بھائی غلام محمد میری پیدائش سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔ اُن کی نرینہ اولاد کوئی نہ تھی۔ صرف دو لڑکیاں تھیں۔ جن کی پرورش اور شادیاں میاں جی نے کیں۔ اُن لڑکیوں کی اولاد سیالکوٹ میں آباد ہے۔

میاں جی نے ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء کو وفات پائی۔ اُن کا مزار سیالکوٹ میں درگاہ امام علی الحق رح کی پشت پر بے جی کے مزار کے پہلو میں ہے۔ لوحِ مزار پر حسب ذیل قطعہ تاریخ وفات کندہ ہے:۔

پدر و مُرشدِ اقبال ازیں عالم رفت

ماہمہ راہرواں منزلِ ما مُلکِ ابد

ہاتف از حضرت حق خواست دو تاریخ رحیل

آمد آواز اثرِ رحمت و آغوشِ لحد

۱۳۴۹ھ ۱۳۴۹ھ

وفات کے وقت میاں جی کی عمر شمسی حساب سے ۹۳ سال تھی۔ باوجود کبرسنی کے ہوش و حواس بالکل درست تھے۔ صرف سماعت اور بینائی میں کچھ کمی واقع ہو گئی

تھی۔ وقت دیکھنے کی گھڑی ہر وقت سرہانے رہتی۔ آخری دو ایک سالوں میں بینائی کی
کمزوری کی وجہ سے گھڑی میں وقت خود نہ دیکھ سکتے۔ کوئی پاس سے گزرتا تو گھڑی دکھا کر وقت
ضرور دریافت کرتے۔ اُن کے وقت کے متعلق بار بار استفسار پر مجھے تعجب بھی ہوتا کہ میاں
جی کو کہیں جانا تو ہے نہیں پھر گھڑی گھڑی وقت کیوں پوچھتے رہتے ہیں۔ اب کہ میں عمر کی
اسی منزل کے قریب جا رہا ہوں اور وقت کاٹے نہیں کٹتا اور نظر ہر لمحہ گھڑی کی طرف
اٹھتی رہتی ہے تو میاں جی کے بار بار وقت دریافت کرتے رہنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی
ہے۔

میاں جی کے ذکر میں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ چچا جان کو ۱۹۰۸ء
میں جو بیرسٹری کی سند دی گئی اس میں ان کے والد گرامی کا نام انگریزی میں نور محمد
(Noor Mohammad) کی بجائے میر محمد (Mir Mohammad) لکھا ہے جو
درست نہیں۔ سند تیار کرنے والے انگریز کارکن نے اسلامی ناموں سے ناواقفیت کی
وجہ سے Noor کو Mir پڑھا اور وہی لکھ دیا۔ جب اس سند کی بنا پر چچا جان نے
چیف کورٹ لاہور میں بطور بیرسٹر رجسٹر کیے جانے کی درخواست کی تو سند کے مطابق
وہاں بھی ولدیت میر محمد درج ہوئی۔ نام کی یہ غلطی چچا جان کے علم میں تو آئی ہوگی۔ معلوم
نہیں انہوں نے کیوں اس قدر تساہل سے کام لیا اور اس غلطی کی اصلاح نہیں کرائی۔ اس
میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ہمارے دادا جان کا نام شروع سے ہی نور محمد تھا۔ میرے
ابا جی یعنی علامہ اقبال کے بڑے بھائی ۹ جون ۱۸۸۰ء کو فوج میں ملازم ہوئے۔ اُن
کی سروس بک میں جو اس تاریخ کو شروع کی گئی اُن کے والد کا نام نور محمد لکھا ہے۔ یہ
سروس بک میرے پاس محفوظ ہے۔ پھر فوج والوں نے ابا جی کو انجینئرنگ کی تعلیم کے لئے
ٹامسن کالج آف سول انجینئرنگ رڑکی بھیجا۔ یہ امتحان انہوں نے ۱۸۸۴ء میں اپنی کلاس
میں اوّل رہتے ہوئے پاس کیا۔ اُن کی اس کالج کی سند میں جو ۲۷ مارچ ۱۸۸۴ء کی ہے
اور میرے پاس محفوظ ہے۔ اُن کے والد کا نام نور محمد لکھا ہے خود چچا جان کی پنجاب
یونیورسٹی کی اسناد میٹرک (۱۸۹۳ء)۔ ایف اے (۱۸۹۵ء)۔ بی اے (۱۸۹۷ء)

اور ایم اے (۱۸۹۹ء) میں اُن کے والد کا نام نور محمد ہی لکھا ہے۔ ان اسناد کے عکس مرحوم کرنل وحید الدین کی "Iqbal in pictures" مطبوعہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہو چکے ہیں اور اصل اسناد محفوظ ہیں۔ بیرسٹری کی سند میں میر محمد سند لکھنے والے کارکن کی غلطی سے لکھا گیا جسے چچا جان نے تساہل برتتے ہوئے درست نہ کرایا۔

میں نے اب یہ اسناد اور چچا جان کے تعلیمی تمغے پاکستان نیشنل میوزیم کراچی کی تحویل میں دے دیئے ہیں۔

نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کی وہ مختصر

تشریح جو خود علامہ اقبال نے کی

بنداول و دوئم :۔ نظامِ عالم کے قوانین اٹل ہیں۔ قوانین فطرت کی محکم زنجیر میں ہر شے جکڑی ہوئی اور مجبور ہے۔ اس واسطے جب انسان کو اس عالمگیر مجبوری کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے مصائب پر نالاں نہیں ہوتا بلکہ آنسوؤں کا سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ عالم کا دل گویا الماس کا ٹکڑہ ہے جس میں علم کی روشنی تو ہے مگر ساتھ ہی اس کے سختی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور سوز و گداز رخصت ہو جاتا ہے۔

بندِ سوئم :۔ شاعر اگرچہ حکمت سے متاثر ہونے کے باعث رونے سے قاصر ہے تاہم محض تصویر کا نظارہ ہی اُس کے خوابیدہ تاثرات کو جگا دیتا ہے۔

بندِ چہارم :۔ تاثر کی فضیلت عقل پر۔ ماں کی تصویر ایامِ طفلی کی یاد دلاتی ہے۔

بندِ پنجم :۔ ماں کے احسانوں کو یاد کر کے روتا ہے۔

بندِ ششم :۔ دنیا میں موت کی عمومیت اور کثرت۔ ہر جگہ اس کی حکمرانی ہے۔ کوئی مقام ایسا نہیں جہاں یہ انسانی تمناؤں کا خون نہ کرتی ہو۔ مگر یہ دنیا جہاں موت کی اتنی کثرت ہے محض امتحان گاہ ہے اور کبھی نہ کبھی یہ امتحان ضرور ختم ہو جائے گا۔

بندِ ہفتم :۔ زندگی کبھی فنا نہیں ہو سکتی اور خود موت کی کثرت ہی اس بات کی دلیل ہے کہ زندگی کو فنا نہیں۔ قدرت اگر پیکرِ جسمانی کو توڑ دیتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ قدرت ظالم ہے بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ قدرت کو اس بات پر کامل اعتماد ہے کہ وہ ہزاروں اچھے

سے اچھے پیکر اور جسیم بنا سکتی ہے۔ اس بات کو ہوا اور بُلبلے کی مثال سے واضح کیا ہے۔

بندِ ہشتم :۔ رات کے تارے جو اپنی چمک دمک کے لئے تاریکی کے محتاج ہیں اور جو محض روشنی کی چنگاریاں ہیں اُن کی عمر اس قدر لمبی ہے کہ انسانی عقل اس کا اندازہ کرنے سے قاصر ہے۔ پھر انسان جو قدرت کا روشن ترین ستارہ ہے کیا ایک عارضی زندگی رکھتا ہے اور روشنی کی آسمانی چنگاریوں سے بھی گیا گزرا ہے؟ نہیں اس کی عمر ستاروں کی عمر سے بدرجہا زیادہ ہے۔ یہ ایک نہ بجھنے والا چراغ ہے۔

بندِ نہم :۔ پھول کے بیج کی مثال سے قبر سے دوبارہ اُٹھنے کو واضح کرتا ہے اور اس کے امکان پر استدلال کرتا ہے۔

بندِ دہم :۔ آدمی اگر کچھ وقت کے بعد اپنے مصائب اور غم کو بھول جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وقت میں کوئی پوشیدہ قوت ہے جس سے وہ انسانی غموں کو پرانا کر کے فنا کر دیتا ہے۔ ہم جو مرنے والوں کو فراموش کر دیتے ہیں تو یہ فراموشی وقت کے گزر جانے کا اثر نہیں بلکہ ہماری فطرت میں ایک احساس مخفی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مر کر فنا نہیں ہوتا۔ اس لطیف احساس کی وجہ سے ہمارا غم دور ہو جاتا ہے پس گزرے ہوئے عزیزوں کی طرف سے بے پرواہی اور گو نہ غفلت روح کے اس مخفی احساس کی وجہ سے ہے کہ ہمارے عزیز زندہ موجود ہیں۔ اگر وہ حقیقت میں فنا ہو چکے ہوتے تو یقیناً ہمارا غم کبھی ختم نہ ہوتا۔ گویا اس بند میں اور اس سے پہلے کے بندوں میں چار باتوں سے حیات مابعد الموت کا استدلال کیا ہے۔

۱۔ موت کی عمومیت و کثرت سے

۲۔ رات کے تاروں سے

۳۔ پھول کے بیج سے

۴۔ انسان کی ظاہری فراموشی سے جو عام لوگوں کے نزدیک مرورِ زمانہ سے پیدا ہوتی ہے۔

بندِ یازدہم :۔ عام فلسفہ حیات اور اشعار دعائیہ

محمد اقبال

باب ۶

علامہ اقبال کی والدہ

علامہ اقبال کی والدہ کا نام امام بی بی تھا لیکن گھر میں اور محلے برادری میں بھی سب انہیں "بے جی" کہتے تھے۔ ان کے بزرگ بھی کشمیر سے ترک وطن کر کے ضلع سیالکوٹ کے موضع سمبڑیال میں آباد ہو گئے تھے۔ بے جی سے میاں جی کی شادی کس سن میں ہوئی اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شادی ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل ہوئی ہوگی۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں لڑکیاں چھوڑ، لڑکوں کی تعلیم کا بھی کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ شہروں کی مساجد میں لڑکوں کی دینی تعلیم کے لیے کچھ مکتب ہوں گے۔ لیکن دیہات میں تو وہ بھی مفقود تھے۔ بے جی لکھنا پڑھنا بالکل نہ جانتی تھیں لیکن ناخواندہ ہونے کے باوجود بڑی زیرک، معاملہ فہم اور مدبر خاتون تھیں۔ گھرداری کا سب انتظام وہ خود کرتی تھیں۔ میاں جی اس انتظام میں بالکل دخل نہ دیتے تھے۔ اُن کے حسن سلوک کی وجہ سے محلے برادری کی مستورات میں انہیں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ اکثر گھرانوں کے تنازعوں میں تصفیہ کرانے کے لئے اُن سے رجوع کیا جاتا اور وہ بڑی خوش اسلوبی سے مفاہمت کرا دیتیں۔ یوں تو سب بچوں سے شفقت کا سلوک کرتی تھیں، لیکن میں خصوصیت سے اُن کے لطف و کرم کا مورد تھا۔ اس خصوصیت کی وجہ یہ تھی کہ

میرے والدین کے ہاں کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ میری پیدائش سے پہلے دو تین لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہوئے لیکن پہلی لڑکی کے سوا سب فوت ہو گئے۔ بے جی کی بڑی خواہش تھی کہ اُن کے بڑے بیٹے یعنی میرے اباجان کے ہاں بھی نرینہ اولاد ہو۔ اس کے لئے انہوں نے حضرت مسیح موعود سے دعا کرائی کیونکہ میرے اباجان سلسلہ احمدیہ میں شامل ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی تمنا پوری کی تو میری پرورش کی ذمہ داری انہوں نے سنبھال لی۔ آٹھ دس سال کی عمر تک مجھے اپنے کمرے میں ہی سلاتی تھیں۔ ملازمت کے سلسلہ میں اباجان کی تعیناتی زیادہ تر سرحدی چھاؤنیوں میں ہوتی۔ اس لئے میری والدہ عام طور پر سیالکوٹ میں ہی رہتیں لیکن مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اباجان کی تعیناتی انبالہ چھاؤنی میں ہوئی تو والدہ میرے چھوٹے بھائیوں کو ساتھ لے کر وہاں گئیں اور مجھے بے جی نے وہاں جانے نہ دیا اور میں اُن کے پاس سیالکوٹ میں ہی رہا۔ بچوں سے لاڈ پیار اپنی جگہ لیکن تربیت کے معاملہ میں وہ ایک آمر سے کم نہ تھیں۔ اُنھوں نے اردو کا یہ قول تو شاید نہ سنا ہو کہ بچوں کو کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ، لیکن ان کا عمل اس کے مطابق تھا۔ جب تک زندہ رہیں ہمارے گھر سے باہر آنے جانے، ملنے ملانے پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ ہماری مجال نہ تھی کہ بغیر اُن کی اجازت گھر سے باہر جائیں اور واپسی کے لئے جو وقت وہ مقرر کریں اس پر واپس نہ آئیں۔

بے جی نے غربت کے دن بھی دیکھے تھے اس لئے حتی الامکان غربا سے ہمدردی اور خاموشی سے اُن کی مالی امداد کرنا ان کا شعار تھا۔ کئی ضرورت مند مستورات کی باقاعدہ ماہانہ رقم مقرر تھی۔ لینے والیوں کے علاوہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کس کو کیا دیتی ہیں۔ اباجی مذاق میں ایسی امداد کو "گپت دان" کہا کرتے تھے۔ رخصت پر گھر آتے تو "گپت دان" کیلئے بے جی کو علیحدہ رقم پیش کرتے۔ وفات سے دو ایک دن پہلے جب گھر کا انتظام اور اپنے صندوقوں کی چابیاں میری والدہ کے سپرد کیں تو علیحدگی میں انہیں ایسی امداد کی تفصیل بتائی اور تاکید کی کہ اُن کے بعد بھی یہ امداد جاری رہے۔

بے جی کے غربا کی امداد کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ محلے برادری کے غریب لیکن

شریف گھرانوں کی دس بارہ سال کی عمر کی تین چار لڑکیاں اپنے گھر لے آتیں اور ان کی کفیل ہو جاتیں۔ یہ لڑکیاں گھر کے کام کاج میں ہاتھ بھی بٹاتیں اور ہماری پھوپھیوں سے قرآن کریم نماز، دینی تعلیم، اردو لکھنا پڑھنا۔ کھانا پکانا۔ سینا پرونا بھی سیکھتیں۔ اُن کی پرورش بالکل ایسے ہی ہوتی جیسے گھر کی بیٹیوں کی۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ہماری ایک پھوپھی نے ان لڑکیوں میں سے ایک کو گھر کے سامنے والے بازار سے کوئی چیز خریدنے کے لیے بھیج دیا۔ وہ لڑکی واپس آئی تو بے جی نے دیکھ لیا کہ وہ بازار سے کچھ خرید کر لائی ہے جب انھیں معلوم ہوا کہ اُسے پھوپھی جی نے بھیجا تھا تو بیچاری پھوپھی جی کی شامت آگئی۔ بار بار اُنھیں کہتیں "تمھاری اپنی بیٹی ہوتی تو تم اسے بازار بھیجتیں؟" اس واقعہ کے بعد اُن لڑکیوں کے گھر سے نکلنے پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔

بے جی کو اِن لڑکیوں کے لیے مناسب رشتہ کی تلاش رہتی اور رشتہ ملنے پر اُن کی شادی کر دی جاتی۔ شادی کا خرچ بے جی برداشت کرتیں۔ شادی کے بعد بھی وہ لڑکیاں ہمارے ہاں اسی طرح آتیں جس طرح لڑکیاں میکے آتی ہیں۔ اگرچہ لڑکیوں میں زیادہ تعداد محلے برادری کی لڑکیوں کی ہوتی لیکن غیر برادری کے لوگ بھی اس سلوک سے مستثنیٰ نہ تھے۔ نواحی گاؤں کا ایک ارائیں بابا بوٹا نامی ہمارے مکان کے سامنے سبزی فروخت کرتا تھا۔ اس کی بیوی ایک دس بارہ سال کی لڑکی چھوڑ کر فوت ہوئی جس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ تو بے جی نے اُسے بھی اپنے ہاں بلوا لیا۔ جوان ہونے پر وہ ہمارے گھر سے ہی اپنی برادری میں بیاہی گئی۔ ایسی ایک لڑکی کو بے جی نے چچی سردار (والدہ جاوید) کے سپرد بھی کیا تھا۔ جس نے چچا جان کے ہاں لاہور میں پرورش پائی اور چچی سردار نے ہی اس کی شادی کی تھی۔ ان لڑکیوں میں سے دو ایک کے لڑکے تو اچھے عہدوں سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

میرے لڑکپن میں جو لڑکیاں ہمارے ہاں بے جی کی کفالت میں تھیں۔ اُن میں سے ایک لڑکی ہماری رشتہ دار بھی تھی جو شکل و صورت کی بھی ذرا اچھی تھی، اسے ان دونوں باتوں کا گھمنڈ تھا اور وہ اپنے آپ کو دوسری لڑکیوں بالخصوص بابا بوٹے

کی لڑکی حسن بی بی سے برتر سمجھتی تھی ، عام طور پہ کھانے کے وقت دو دو لڑکیاں ایک
ہی برتن سے اکٹھی کھانا کھاتیں۔ ایک روز ہماری اس رشتہ دار لڑکی کو حسن بی بی کے
ساتھ کھانے میں شریک ہونا پڑا تو اُس نے اُس کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرنے
سے انکار کر دیا۔ بے جی تک بات پہنچی تو انھوں نے حسن بی بی سے کہا وہ کل سے
ان کے ساتھ کھانا کھایا کرے اور ہماری رشتہ دار لڑکی کو اکیلے کھانا کھانے کی ہدایت
ہوئی۔ چنانچہ دوسرے دن سے اس کے مطابق عمل درآمد شروع ہو گیا۔ حسن بی بی پھولے نہ سماتی
تھی اور ہماری رشتہ دار لڑکی بکتّو بن کر رہ گئی۔ دو چار دن بعد اس نے اپنی ساکھ بنانے کیلئے بے جی
سے کہا آج میں آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ بے جی نے کہا کہ میں تو حسن بی بی کے ساتھ کھاتی
ہوں۔ تمھیں اُس کے ساتھ کھانے میں احتراز ہے تو میرے ساتھ کیسے کھاؤ گی۔ اس نے
ندامت سے رونا شروع کر دیا۔ بے جی نے اُسے گلے سے لگا کر کہا کہ حسن بی بی بھی ویسی ہی
میری بیٹی ہے جیسی تم ہو اور صاف ستھری بھی تم سے کم نہیں۔ پھر تمہیں اس کے ساتھ
کھانے میں اعتراض کیوں ہو۔ دو چار دن اس کے ساتھ کھانا کھا لو پھر میرے ساتھ
بھی کھا لینا۔ اُس دن سے ہماری رشتہ دار لڑکی کا گھمنڈ جاتا رہا اور حسن بی بی کی پکّی سہیلی بن گئی
بے جی کے جذبۂ ایثار کا یہ واقعہ جو علامّہ کی پیدائش سے پہلے کا ہے۔ مَیں نے گھر
کی مستورات سے کئی دفعہ سنا ہوا ہے۔ میاں جی کے چھوٹے بھائی غلام محمد کے ہاں لڑکیاں
ہی ہوتی تھیں۔ ان کی اہلیہ کو لڑکے کی بڑی تمنا تھی اور اس لئے بہت دلگیر رہتی تھیں۔
ایک مرتبہ دونوں بھائیوں کی بیویاں اُمید سے ہوئیں۔ اِس مرتبہ بے جی کو اللہ تعالیٰ نے
لڑکا عطا کیا اور ان کی دیورانی کے پھر لڑکی پیدا ہوئی۔ اُس کے غم واندوہ کو دیکھتے ہوئے
بے جی نے اُن سے کہا کہ لڑکا تم لے لو اور لڑکی مجھے دے دو۔ چنانچہ بچوں کا تبادلہ ہو
گیا لیکن وہ لڑکا شیر خواری کی عمر میں ہی فوت ہو گیا۔ بے جی نے اپنی گود خالی کر کے دیورانی
کی لڑکی پھر انہیں واپس دے دی۔ اللہ تعالیٰ کو شاید بے جی کا ایثار پسند آیا کہ فوت ہونیوالے
لڑکے کا نعم البدل علامّہ اقبال ایسا فرزند عطا فرمایا۔
چچا جان کی نظم " والدہ مرحومہ کی یاد میں" جس "صحبت مادر میں طفل سادہ" رہ جانے

کا ذکر ہے ۔ وہ صحبتیں میری آنکھوں دیکھی ہیں ۔ عدالتوں میں موسم گرما کی تعطیلات میں چچا جان سیالکوٹ آتے تو دوپہر کے کھانے سے پہلے اور کبھی بعد بے جی کے کمرے میں روزانہ محفل جمتی جس میں بے جی میری والدہ ۔ میری دو پھوپھیاں ۔ چچی سردار اور چچی مختار شامل ہوتیں ۔ علمی گفتگو کا تو اس محفل میں کیا ذکر ۔ بس اِدھر اُدھر کی ہلکی پھلکی باتیں ہوتیں ۔ محلے بھر کے قصے برادری کے قصے ۔ چچا جان کو ان قصوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی ۔ لیکن بڑے شوق سے سُنتے ۔ اُن کی مخصوص نیم مسکراہٹ اُن کے لبوں پر کھیلتی رہتی ۔ بعض اوقات خود پوچھتے ۔ اچھا بے جی پھر فلاں ساس بہو کی لڑائی میں آپ نے کیسے صلح کرائی ۔ ایک لطیفہ جو ایک مرتبہ پھوپھی کریم بی بی نے ہماری ایک رشتہ دار خاتون کے متعلق سنایا تھا ۔ انہیں اتنا پسند تھا کہ بار بار سنتے اور خوب ہنستے ۔ یہ میاں جی کے مرحوم بھائی کی بیٹی کے متعلق تھا ۔ وہ بڑی "اللہ لوک" اور سادہ طبیعت خاتون تھیں ۔ پیروں فقیروں کی معتقد ۔ ان کی بہو کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو اُس کے لئے میاں جی کا مستعمل کرتا لینے آئیں ۔ میاں جی نے کرتا لے دیا اور حسبِ عادت "اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ" کہا ۔ انہوں نے پھوپھی جی سے پوچھا کہ میاں جی نے کیا کہا ہے ۔ پھوپھی جی نے کہا اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ وہ آپ کو ایک اور پوتا عطا کرے ۔ دو سال بعد ان کی بہو کے ہاں دوسرا لڑکا ہوا تو پھر میاں جی کا کرتا لینے آئیں ۔ پھوپھی جی سے کہا ۔ میاں جی سے کہو ، کرتا بھی دیں اور اللہ میاں سے "جد" (ضد) بھی کریں کہ وہ مجھے ایک اور پوتا دے ۔ چچا جان ہر سال ہنس کر پوچھتے "بھئی بہن" جد فجد" کے ہاں اور پوتا ہوا یا نہیں" ۔ بے جی کی وفات کے بعد بھی جب چچا جان سیالکوٹ آتے تو حسبِ دستور محفل جمتی لیکن وہ بات پیدا نہ ہوتی جو ان کی موجودگی میں ہوتی تھی ۔

بے جی نے اگرچہ دینی تعلیم نہیں پائی تھی لیکن میاں جی سے طویل رفاقت کی وجہ سے دین کے بنیادی اصولوں سے بخوبی واقف تھیں ۔ وہ فروعی مسئلے مسائل میں اُلجھنا پسند نہیں کرتی تھیں ۔ اس کے برعکس پھوپھی کریم بی بی ایسے مسائل میں بڑی دلچسپی لیتی تھیں ۔ محلے کی ایک اور خاتون ہمارے ہاں آئی ہوئی تھیں اور اُن کے اور پھوپھی جی کے درمیان کسی فروعی مسئلہ پر بڑی گرم بحث ہو رہی تھی ۔ بے جی کو یہ مناظرانہ گفتگو پسند

نہ تھی لیکن مہمان خاتون کے سامنے ناپسندیدگی کا اظہار بھی مناسب نہ تھا۔ ہمارے ہاں پرورش پانے والی لڑکیاں جو پھوپھی جی سے تعلیم پاتیں وہ بھی اس بحث کو سن رہی تھیں جب بحث ذرا دیر کے لئے رُکی تو بے جی نے موقعہ پاکر لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہا: لڑکیو! تم اس عالمانہ بحث پر حیران ہو رہی ہو۔ یہ مسائل اپنی جگہ ٹھیک ہوں گے لیکن تمھارے لئے ان کا جاننا ایسا ضروری نہیں ایک سیدھے سادے مسلمان کے لئے اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو حقوق اُس کے ذمہ ہیں اُن کو حتی الامکان دیانتداری سے ادا کرنے کی کوشش کرے اگر باوجود کوشش ان میں کوئی کوتاہی یا غفلت ہو جائے تو اللہ تعالیٰ معاف بھی کر سکتا ہے۔ ہاں جو حقوق اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ہمارے ذمہ ہیں ان کے ادا کرنے میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیئے۔ کہ ایسی کوتاہی کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے۔ دوسری بات یہ یاد رکھو کہ نرا عقیدہ کسی کام نہ آئے گا جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ یہ نہیں کہ عقیدہ تو اللہ تعالیٰ کے رزاق ہونے کا ہو اور رزق کے لئے میرے تیرے آگے ہاتھ پھیلایا جائے۔ یا عقیدہ تو اللہ تعالیٰ کے عالم الغیب ہونے کا ہو اور نجومیوں[1] سے غیب کا حال بتانے کی امید رکھی جائے۔ بے جی نے مخاطب تو لڑکیوں کو کیا تھا لیکن اصل مخاطب پھوپھی جی اور وہ خاتون تھیں اور نجومیوں والی بات تو دراصل اُن خاتون کو سنانے کے لئے کی گئی کیونکہ انہیں نجومیوں وغیرہ پر بڑا اعتقاد تھا بے جی کے اِس اظہارِ خیال کے بعد یہ "عالمانہ" بحث بند ہو گئی۔

میری پیدائش کے وقت بے جی کی عمر ۶۲ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ انہیں کئی سال گردوں میں پتھری کی شکایت رہی جو انہوں نے دونوں بیٹوں کو ورثہ میں دی۔ ان کے گھٹنوں میں بھی درد کی شکایت تھی۔ گردوں کی تکلیف کا علاج حضرت حکیم نورالدین نے کیا تھا۔ وہ نماز باقاعدگی سے ادا کرتیں لیکن مَیں نے جب سے ہوش سنبھالا انہیں نماز بیٹھ کر ہی پڑھتے دیکھا جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تکلیف بھی پرانی تھی۔ گردوں کی تکلیف کی وجہ سے روزہ رکھنے کی انہیں طبی ممانعت تھی۔ اس لئے ہر سال فدیہ رمضان دیتیں۔ ۱۹۱۴ء میں جب ان کی عمر ۷۸

[1] باتیں پنجابی زبان میں ہو رہی تھیں اور بے جی نے "ہر ڈیو لیو" کا لفظ استعمال کیا تھا۔

سال کے قریب تھی۔ ان کی طبیعت اکثر ناساز رہنے لگی۔ چچا جان نے علاج کے لئے لاہور چلنے کو کہا لیکن وہ گھر چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئیں۔ اس سال کی آخری سہ ماہی میں چارپائی سے لگ گئیں بخار رہنے لگا۔ اور کمزوری دن بدن بڑھنے لگی۔ آخر ۹ نومبر ۱۹۴۱ء کو داعی اجل کو لبیک کہا (انا للہ و انا الیہ راجعون)

اس سانحہ کو گذرے اب قریباً ستر (۷۰) سال ہو چکے ہیں لیکن بے جی کی وفات کے دن کے واقعات اب تک آنکھوں کے سامنے ہیں۔ بے جی کا جسدِ بے جان میاں جی کے ہاتھوں تیار کیے ہوئے کفن میں لپٹا ہوا بڑے کمرے میں ایک چارپائی پر رکھا ہے۔ گھر میں مستورات کا ہجوم ہے۔ میاں جی صبر و رضا کا نقشہ بنے مستورات کو جزع فزع سے منع کر رہے ہیں۔ ابا جان اپنے کمرے میں بچوں کی طرح رو رہے ہیں۔ چچا جان حزن و ملال لیکن ضبط و تحمل کی تصویر بنے انہیں تسلیاں دے رہے ہیں۔ رخصت کا وقت آ گیا ہے۔ بے جی کے جواں سال عزیز نعش کو اٹھا کر گھر سے باہر لے جانے کے لئے اندر آ گئے ہیں۔ ایک کہرام بپا ہو گیا ہے بے جی کی بیٹیاں اور بہوئیں شدتِ غم سے بے حال میاں جی کے ڈر سے بے آواز آنسو بہا رہی ہیں اور حسرت سے اس پیارے چہرے کو دیکھ رہی ہیں جو پھر کبھی نظر نہ آئے گا۔ بے جی کی منہ بولی بیٹیاں نعش سے لپٹی جا رہی ہیں اور اس ہنگامے میں پندرہ سولہ سال کا ایک دُبلا پتلا لڑکا جسے بے جی نے ڈھیروں پیار دیا تھا، ان کے قدموں سے لپٹا بلک رہا ہے۔ جیسے وہ اُنہیں گھر سے جانے نہ دیگا اور بے جی جو کبھی اس کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جایا کرتی تھیں یوں بے تعلق لیٹی ہیں جیسے وہ اُسے جانتی تک نہیں۔ معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذنِ حضوری میں کیا تاثیر ہوتی ہے کہ روح دنیاوی محبت کے مضبوط رشتوں کو توڑ کر اور اپنے پیاروں سے منہ موڑ کر چشم زدن میں ہوا ہو جاتی ہے۔ اور زندگی میں جان چھڑکنے والے اپنی عزیز ترین ہستی کے جسدِ خاکی کو جلد سے جلد گھر سے لے جا کر اپنے ہاتھوں خاک کے سپرد کر آتے ہیں۔ اس عزیز ہستی کے ساتھ بھی جو ایک دن پہلے تک گھر پر ایک ملکہ کی طرح حکمران تھی اور سب کی محبت اور اطاعت کا مرکز تھی۔ یہی سلوک ہوا اور انہیں درگاہ امام علی الحق کے قبرستان میں لے جا کر دفن کر دیا گیا۔ گھر میں کئی دن تک تعزیت کے لئے آنے والوں کا

آنا جانا رہا اور پھر رفتہ رفتہ حالات معمول پر آ گئے۔ کچھ دن بعد چچا جان لاہور چلے گئے، ان کی روانگی کے وقت ابا جان نے روتے روتے جب انہیں گلے لگایا تو میں نے پہلی دفعہ چچا جان کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے۔ دسمبر ۱۴ء کے آخری ہفتہ میں فاتحہ چہلم کی رسم ادا ہوئی۔ چچا جان نے لاہور سے آ کر اس میں شرکت کی بے جی کے مزار کی تعمیر شروع ہوئی تو چچا جان نے لوح مزار لاہور سے تیار کرا کر بھجوائی۔ اس پر حضرت اکبر اللہ آبادی کا حسب ذیل قطعہ تاریخ وفات کندہ ہے۔

مادرِ مخدومہٗ اقبال رفت
سوئے جنت زیں جہان بے ثبات
گفت اکبرؔ با دل پر درد و غم
رحلتِ مخدومہ تاریخ وفات
۱۳۳۳ھ

چچا جان کو بے جی سے کتنی عقیدت تھی اور ان کی ہر خواہش پوری کرنے کا کتنا خیال تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو بے جی کی وفات کے کئی سال بعد پیش آیا۔ یہ سن ۱۹۲۲ کی بات ہے جب میری شادی کی بات پختہ ہوئی۔ عدالتوں کی تعطیلات میں چچا جان چچی سردار اور چچی مختار کو ساتھ لے کر سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ ایک دن میری والدہ (جنھیں سب لوگ یہاں تک کہ اُن کی اولاد بھی "بھابھی جی" کہتے تھے) دونوں چچیوں اور پھوپھی کریم بی بی کے ساتھ مشورہ کر رہی تھیں کہ شادی میں ہماری طرف سے کیا کیا زیور اور کپڑے دیئے جائیں۔ چچی سردار نے یہ کہہ کر سب کو تعجب میں ڈال دیا کہ ڈاکٹر صاحب (وہ چچا جان کا ذکر ڈاکٹر صاحب کہہ کر ہی کیا کرتی تھیں) شادی پر دلہن کے لئے پاؤں کا کوئی سونے کا زیور تیار کرانا چاہتے ہیں۔ تعجب اس لئے ہوا کہ شادی والے دونوں گھرانے متوسط الحال تھے اور دونوں کی مالی حالت کے مدِ نظر لڑکے والوں کی طرف سے چڑھاوے میں پاؤں کے لئے سونے کا زیور ضروری نہ تھا۔ چونکہ جس گھرانے میں رشتہ کی بات پکی ہوئی۔ ان سے چچی سردار کے خاندان کی کچھ رسم و راہ تھی اس لئے میری والدہ کو خیال ہوا کہ ہو نہ ہو یہ تجویز چچی سردار کی

ہوگی۔ انہوں نے چچی جی سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے بھائی صاحب کو یہ مشورہ تم نے دیا ہے لیکن چڑھاوے کے باقی سامان کو دیکھتے ہوئے پاؤں کا سونے کا زیور تو بڑی انمل بے جوڑ بات ہوگی۔ چچی سردار نے کہا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کی اپنی تجویز ہے اور اُن کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں بلکہ وہ متفق ہیں کہ پاؤں کے لئے سونے کے زیور کی ضرورت نہیں۔ پھوپھی کریم بی بی نے اس بات کا ذکر اباجان سے کر دیا۔ رات کو جب سب لوگ سونے کے لئے چھت پر اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئے تو اباجان نے پوچھا اقبال میں سُنتا ہوں کہ تم شادی میں دینے کے لئے پاؤں کا سونے کا زیور بنوانے کی سوچ رہے ہو۔ چچاجان نے اپنی مخصوص نیم مسکراہٹ کے ساتھ کہا ہاں ایسا ارادہ تو ہے۔ اباجان نے کہا کہ گھر کی مالی حالت کا تمہیں علم ہے پھر اس غیر ضروری (Item) کی تمہیں کیوں سوجھی۔ چچاجان نے کہا بے جی کی وفات سے تین چار سال پہلے کی بات ہے۔ میں تعطیلات میں گھر آیا ہوا تھا۔ ایک دن بے جی کی مجلس میں ساتھ کے محلے کے کسی تاجر گھرانے کی ایک شادی کا ذکر ہو رہا تھا۔ کسی نے کہا لڑکے والوں نے دُلہن کو علاوہ اور زیورات کے سونے کے پازیب پہنائے ہیں۔ اعجاز بے جی کے پاس ہی لیٹا ہوا تھا۔ بے جی نے اُسے پیار کرتے ہوئے کہا اس کی شادی ہوگی تو میں بھی اس کی دلہن کو سونے کے پازیب پہناؤں گی۔ میں چاہتا ہوں بے جی کی اس خواہش کو پورا کر دیا جائے۔ اباجی نے کہا بے جی نے ایسے ہی لاڈ میں یہ بات کہہ دی ہوگی ورنہ وہ کبھی اپنی حیثیت سے بڑھ کر کچھ کرنے کی عادی نہ تھیں۔ اباجی نے میاں جی کو یہ سب قصہ سُنایا تو انہوں نے کہا کہ جو جذبہ اس ارادے کا محرک ہے وہ تو قابلِ قدر ہے لیکن اس ارادے پر عمل کرنا ہمارے حالات میں اسراف ہوگا اور اسراف اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ ہائی کورٹ کے اس رولنگ کے بعد کسی کو کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی اور چچاجان نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

باب ۷

علامّہ اقبال کے بڑے بھائی

علامّہ اقبال کے بڑے بھائی میرے ابّا جان کا نام عطا محمد تھا۔ اُن کی سروس بک میں ان کا سنِ پیدائش ۱۸۵۹ء درج ہے جو درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ میاں جی اور بے جی کی شادی ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ ہوئی اور وہ اُن کی پہلی اولاد تھے۔ ان دنوں ملک میں تعلیم کے لئے ابھی سکول کہاں کھلے تھے۔ اس لئے انہوں نے کسی سکول میں تو تعلیم نہیں پائی ہوگی۔ شہر کی ایک دو مساجد میں مکتب تھے جہاں سے ممکن ہے "لیکن یہی کہ رفت گیا اور بُود تھا" کی تعلیم پائی ہو۔ میاں جی کے چھوٹے بھائی غلام محمد کے متعلق سنا ہے اُس زمانہ کے معیار کے مطابق اچھے پڑھے لکھے تھے اور نہر کے محکمہ میں ملازم تھے۔ وہ روپڑ ضلع انبالہ میں تعینات تھے ابّا جان کو اُن سے بڑا لگاؤ تھا اور روپڑ جا کر ان کے پاس کچھ عرصہ رہے تھے۔ اُن سے بھی کچھ استفادہ ضرور کیا ہوگا خصوصاً نقشہ نویسی میں جو آئندہ زندگی میں اُن کے بڑے کام آیا۔

ابّا جان بقول چچا جان "قامت میں صورتِ سروِ بلند" تھے۔ سرخ و سفید رنگت۔ چوڑا چکلا سینہ۔ وجیہہ و شکیل سراپا۔ ملازمت کی تلاش ہوئی تو اپنی صحت

اور جسمانی ساخت کی بدولت رسالہ فوج میں بطور "سوار" بھرتی کر لئے گئے۔ اُن کا تقرر ۹ جون ۱۸۸۰ء کو ۹ بنگال کیولری میں ہوا۔ دو تین سال بعد فوج والوں نے انہیں ٹامسن کالج آف سول انجینئرنگ رُڑکی میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج دیا۔ یہ انتخاب غالباً نقشہ نویسی میں ان کے شغف کی وجہ سے ہوا ہوگا۔ اس کالج سے انہوں نے مارچ ۱۸۸۴ء میں کامیابی کی سند حاصل کی۔ سند سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی کلاس میں اوّل آئے۔ فوج میں بھرتی ہونے سے قبل اُن کے کسی سکول میں تعلیم پانے کا کوئی امکان نہ تھا کہ ابھی ایسے سکولوں کا وجود ہی نہ تھا۔ رڑکی کالج کے کورس میں سول انجینئرنگ، ڈرائینگ اور سروے کے مضامین کے علاوہ Mathematics اور Languages کے مضامین بھی تھے۔ اُن کی سند اور سروس بک سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کالج کا کورس ایک سال کا تھا یا دو سال کا اگر دو سال کا بھی تھا تو بھی دو سال کے عرصہ میں ایک صرف "شُد بُد" رکھنے والے فوجی "سوار" کا ان تمام مضامین میں اچھے نمبر حاصل کر کے جماعت میں اوّل آنا ان کی ذہنی ذہانت کا ثبوت ہے۔ اس کامیابی پر اُن کی خدمات رسالہ فوج سے ملٹری ورکس کے محکمہ کو منتقل کر دی گئیں جہاں اپریل ۱۸۸۴ء میں اُن کا تقرر بطور سب اوورسیر ہو گیا۔ اس محکمہ میں قریباً ۲۸ سال ملازمت کے بعد وہ ستمبر ۱۹۱۲ء میں ریٹائر ہوئے۔ اُن کی ملازمت کا زیادہ عرصہ بلوچستان اور صوبہ سرحد کی چھاؤنیوں میں گزرا۔ کچھ عرصہ کے لئے انبالہ چھاؤنی میں اور بمبئی ڈسٹرکٹ میں دیولالی چھاؤنی میں بھی تعینات رہے۔ ریٹائر ہونے سے پہلے ۱۹۱۰ء کے آخر میں سوا سال کی رخصت پر سیالکوٹ آ کر مکان کی از سر نو تعمیر کی اور چھوٹے بھائی کے نام پر مکان کا نام اقبال منزل رکھا۔ ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو ان کے تینوں بیٹے ابھی سکولوں میں زیر تعلیم تھے اور ان سے چھوٹی دو بیٹیاں تھیں۔ غرضیکہ اُن کی اپنی ساری اولاد کی تعلیم اور شادیوں کے فرائض ابھی ان کے ذمہ تھے۔ جو کچھ پس انداز کیا تھا اس کا معتدبہ حصہ مکان کی تعمیر میں خرچ ہو گیا۔ اس لئے متفکر رہتے اور چچا جان کی مرضی کے خلاف اس کوشش میں رہتے تھے کہ کہیں اور ملازمت مل

جائے تاکہ اُن کی ذمہ داریوں کا بوجھ چھوٹے بھائی پر نہ پڑے۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں اُن کے محکمہ کو پھر ان کی خدمات کی ضرورت پڑی تو دوبارہ ملازمت پر چلے گئے اور مزید تین سال ملازمت کی۔

چچا جان کے ایک دیرینہ دوست اور مدّاح خان صاحب میر منشی سراج الدین نے ایک مرتبہ آبا جان سے کہا کہ آپ کے اور علامہؒ کے باہمی تعلقات میں بھائیوں کی محبت سے زیادہ آپ کی طرف سے باپ کی شفقت اور ان کی طرف سے بیٹے کی سعادت کی جھلک نظر آتی ہے۔ آبا جان نے منشی صاحب سے اس کی دو وجوہات بیان کیں۔ فرمایا کہ اُن کی پیدائش کے بعد ۱۸ سال تک ان کے والدین کے ہاں کوئی لڑکا پیدا نہ ہوا سوائے ایک کے جو شیر خواری کے ایام میں ہی فوت ہوگیا۔ لڑکپن میں ایک چھوٹے بھائی کی کمی کو وہ شدّت سے محسوس کرتے تھے لہٰذا جب اقبال پیدا ہوا تو انھیں اُس "سرخ و سفید گول مٹول" بچے سے بڑی محبت ہوگئی۔ دوسرے خود ان کے ہاں ۱۸۹۹ء تک کوئی اولادِ نرینہ نہ ہوئی سوائے ایک لڑکے کے جو جلد فوت ہوگیا۔ ایک لمبے عرصے تک اولادِ نرینہ سے محروم رہنے کی وجہ سے انھوں نے چھوٹے بھائی کو ہی بیٹا سمجھ لیا۔ وجوہات کچھ بھی ہوں دونوں بھائیوں کی محبت مثالی تھی۔ چچا جان نے اپنی دو نظموں میں اس محبت کا ذکر فرمایا ہے۔ تعلیم کے لئے انگلستان جاتے ہوئے دہلی میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر ایک نظم پڑھی جو "التجائے مسافر" کے عنوان سے شائع ہوچکی ہے۔ اس میں بڑے بھائی کے متعلق کہا:

وہ میرا یوسفِ ثانی وہ شمعِ محفلِ عشق
ہوئی ہے جس کی محبت قرارِ جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو
ہوائے عیش میں پالا کیا جواں مجھ کو
وہ میرا یار بھی۔ محبوب بھی، برادر بھی
کہ جس کے عشق سے جنت ہے یہ جہاں مجھ کو

ریاضِ دہر میں مانندِ گل ہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو

پھر اپنی والدہ کی وفات پر اپنی مشہور نظم " والدہ مرحومہ کی یاد میں " بڑے بھائی کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے :

وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سرو بلند
تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو میرا
وہ محبت میں تری تصویر وہ بازو میرا
تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ
صبر سے ناآشنا صبح و مسا روتا ہے وہ
تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

ابّا جان بڑی بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ ملازمت کے دوران اپنے محکمہ میں اور بعد ملازمت اپنے گھر اور اپنے محلہ میں ان کا بڑا دبدبہ تھا۔ طبیعت کے لحاظ سے پنبہ کی طرح " بظاہر ملائم " نہ تھے بلکہ اس کے برعکس " سنگیں تر از محکم حصارے " معلوم ہوتے تھے۔ لیکن یہ ایک ظاہری خول تھا۔ اندر سے دل کے صاف اور " چوں جوئے درکنار کوہسارے " کے مصداق تھے۔ جلدی غصے میں آجاتے لیکن جتنی جلدی غصہ چڑھتا اتنی ہی جلدی اُتر جاتا اور پھر تلافیٔ مافات کے طور پر جس پر غصہ کیا تھا اُس کی دلجوئی کے لئے بہانے تلاش کرتے۔ اگر کبھی ان سے کسی سے زیادتی ہو جاتی تو انہیں اُسے تسلیم کرنے اور معذرت کرنے میں کبھی تامل نہ ہوتا۔ ضرورت سے زیادہ فیاض طبیعت پائی تھی۔ وہ چچا جان کے اس شعر پر عامل معلوم ہوتے تھے

" مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

مصافِ زندگی میں اُن کی فولادی سیرت نے ایک مرتبہ انہیں مشکل میں بھی ڈالا جس کا ذکر آگے آئے گا اور شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہونے کا ثبوت ان کا بھائی، بہنیں اور اُن کی اپنی اولاد دے سکتی ہے، جن سب کو انہوں نے ہوائے "عیش میں پالا" اور ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کے بغیر ان کے سب فرائض ادا کئے۔ اباجان گھر میں تو بہت لئے دیئے رہتے تھے لیکن اپنے احباب کی مجلس میں ان کی ظرافت اور بذلہ سنجی ضرب المثل تھی۔ وہ مردم شناس نہ تھے ورنہ زندگی بھر ایسے عزیزوں کی پُرزور حمایت نہ کرتے جنھوں نے ان کی وفات کے بعد "اپنا صحیح مقام حاصل کرنے" کی کوشش لاحاصل میں مظلومیت کا لبادہ اوڑھنے کے لئے اُن پر کیچڑ اُچھالا۔

اپنی ملازمت کے دوران اباجان کو فوجداری مقدمہ کی صورت میں ایک ابتلا سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ چچا جان کے متعلق دو ایک تذکروں میں اس واقعہ کا ذکر اجمالی طور پر اور بڑے مبہم پیرائے میں کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک تذکرے میں لکھا ہے کہ "آخر بڑی جدوجہد اور لارڈ کرزن سے اقبال کی ذاتی اپیل کے بعد یہ قضیہ ختم ہوا۔" ان الفاظ سے پڑھنے والے کے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہو سکتا ہے کہ مقدمہ میں جو الزام تھا وہ تو درست تھا لیکن لارڈ کرزن نے چچا جان کی ذاتی اپیل پر اس قضیہ کو ختم کرا دیا۔ یہ نہ صرف واقعہ کے خلاف ہے بلکہ ایسا تاثر علامہ کے بڑے بھائی اور خود علامہ کے ساتھ بڑی بے انصافی ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً اس واقعہ کا ذکر کر دیا جائے۔ چچا جان کے اپنے دوستوں کے نام دو ایک لکھے خطوط اور اباجان کی سروس بک سے ظاہر ہے کہ یہ شاخسانہ اُن کے ایک ہندو ہم عصر اور ایک انگریز افسر کی ملی بھگت سے کھڑا کیا گیا ہوا یہ کہ نومبر ۱۹۰۲ء میں ملٹری ورکس کے محکمہ نے اول الذکر ہندو ہم عصر کو جو اباجان سے سینئر تھا نظر انداز کرتے ہوئے اباجان کو سب ڈویژنل افسر مقرر کر دیا۔ یہ ترقی جس سے اباجان کی تنخواہ یک دم دُگنی ہو گئی۔ اس ہندو سب اوورسیر کو قدرتاً ناگوار ہوئی۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ اباجان کو اُسی حلقہ میں سب ڈویژنل افسر مقرر کیا گیا جس میں یہ ہندو سب اوورسیر تعینات تھا۔ اس حلقہ کا بڑا انجینئر جو ایک درشت کلام انگریز میجر تھا

اُس سب اوورسیر کی جیب میں تھا۔ اس لئے شروع سے ہی۔ اُس کا رویہ ابا جان کے ساتھ معاندانہ تھا۔ اُنھیں چارج لئے کوئی دو ماہ ہوئے تھے کہ ہیجر نے ابا جان سے بدکلامی کی اور انھوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اُن دنوں ایک "نیٹو" ماتحت کے اپنے انگریز فوجی افسر سے ایسی گستاخی کرنے کی سزا اگر ملازمت سے برطرفی نہیں تو کم از کم تنزلی ضرور تھی لیکن زخم خوردہ ہندو سب اوورسیر نے برہم ہیجر کو پٹی پڑھا کر سٹور سے جس کا انچارج دو ماہ پہلے وہ خود تھا سرکاری سامان خورد برد ہونے کا مقدمہ کھڑا کر دیا۔ چونکہ اندیشہ تھا کہ ہندو سب اوورسیر اور انگریز ہیجر گواہوں اور عدالت کو متاثر کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے ابا جان کی طرف سے کوشش کی گئی کہ یا تو مقدمہ کسی دوسرے ضلع کی عدالت میں منتقل ہو جائے یا ان کے مخالف سب اوورسیر اور ہیجر کا تبادلہ کر دیا جائے مگر بقول چچا جان "بلوچستان ایجنسی والے تو ہمارے ساتھ ناانصافی کرنے پر آمادہ تھے" اس لئے وہ ان دو باتوں میں سے کوئی بات ماننے پر تیار نہ ہوئے۔ مجبور ہو کر چچا جان نے لارڈ کرزن کو ایک ذاتی خط میں حالات سے مطلع کیا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب چچا جان کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ سرکاری حلقوں میں نہ تو اُن کی رسائی تھی نہ کوئی اثر رسوخ تھا۔ لارڈ کرزن کے علاوہ چچا جان نے ایک اُس سے بڑی بلکہ سب سے بڑی سرکار میں بھی فریاد کی۔ یہ فریاد ایک نظم کی صورت میں تھی جس میں اپنے اضطراب کی کیفیت بیان کر کے اللہ تعالیٰ سے اس ابتلا سے رہائی کی دعا کی گئی تھی۔ وہ نظم خواجہ حسن نظامی کی وساطت سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر پڑھی گئی۔ ستمبر ۱۹۰۳ء کے مخزن میں یہ نظم "برگ گل" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ "بانگ درا" میں تو یہ نظم شامل نہیں لیکن "سرود رفتہ" اور "باقیات اقبال" میں شامل ہے۔ نظم طویل ہے۔ چچا جان کی اضطرابی کیفیت کے اظہار کے لئے اُس کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

کبھی پھرتی ہے شفا مرے دل بیمار سے

اے مسیحا دم بچا لے مجھ کو اس آزار سے

اے ضیائے چشم عرفاں اے چراغ راہِ عشق
تنگ آیا ہوں جفائے چرخ ناہنجار سے
ہند کا دانا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے[5]
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربار گوہر بار سے
ناک میں بیٹھی ہے بجلی میرے حاصل کے لئے
بیر ہے بادِ بہاری کو میرے گلزار سے
کیا کروں اوروں کا شکوہ اے امیر ملک فقر[6]
دشمنی میں بڑھ گئے اہل وطن اغیار سے
گھات میں صیاد مائل آشیاں سوزی پہ برق
باغ بھی بگڑا ہوا ہے عندلیبِ زار سے
سخت ہے مری مصیبت سخت گھبرایا ہوں میں
بن کے فریادی تری سرکار میں آیا ہوں میں
تو ہے محبوب الٰہی کر دعا میرے لئے
یہ مصیبت ہے مثال فتنۂ محشر مجھے
ہو اگر یوسف مرا زحمت کش چاہِ الم
چین آئے مصر آزادی میں پھر کیونکر مجھے
اُس بڑی سرکار کے قابل مری فریاد ہے
چل حضوری میں شہ یثرب کی تو لے کر مجھے
میرا کیا مُنہ ہے کہ اس سرکار میں جاؤں مگر
تیرے جیسا مل گیا تقدیر سے رہبر مجھے
واسطہ دوں گا اگر لخت دل زہرا کا میں
غم میں کیونکر چھوڑ دیں گے شافع محشر[4] مجھے

رونے والا ہوں شہید کربلا کے غم میں مَیں
کیا دُرِ مقصد نہ دیں گے ساقیٔ کوثر مجھے

آہ تیرے سامنے آنے کے نا قابل ہوں میں
مُنہ چھپا کر مانگتا ہوں تجھ سے وہ سائل ہوں میں
محو اظہار تمنائے دلِ ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبالؔ کا ہم نام ہوں

ایسی مضطربانہ دُعا بھلا کیسے قبول نہ ہوتی۔ یہ دُعا یقیناً قبول ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے تصرف کے بالخت لارڈ کرزن نے انگریزی انصاف کی ساکھ رکھنے کے لئے اپنے طور پر واقعات کی تحقیق کرائی ہوگی اور اطمینان ہو جانے پر کہ مقدمہ بربنائے عداوت ہے نہ صرف اس میجر اور ھندو سب اوورسیر کو فوری تبدیل کرنے کا حکم صادر کیا بلکہ پولیٹیکل ایجنٹ کو بھی تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد مقدمہ میں کیا رکھا تھا۔ آبا جان باعزّت بری ہو گئے۔ ان کی سروس بُک جو میرے پاس موجود ہے میں بریت کے متعلق یہ اندراج ہے :۔

"ATTA MUHAMMAD HAS BEEN FOUND NOT GUILTY. HE SHOULD RECEIVE PAY AS IF RELEASED FREE OF SUSPICION"

(عطا محمد کے خلاف عاید کردہ الزام ثابت نہیں۔ چونکہ اُس کے بےقصور ہونے میں شُبہ تک نہیں لہٰذا اسے پوری تنخواہ ملنی چاہیئے)

یہاں یہ ذکر بھی کر دیا جائے کہ اس مقدمہ کے سلسلہ میں چچا جان نے اپنی "زمیں جُنبد نہ جُنبد گل محمد" والی عادت کے باوجود لاہور سے فورٹ سنڈیمن (بلوچستان) تک کا دشوار گزار سفر اختیار کیا۔ جس کے متعلق سیّد محمد تقی کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں :۔

" آج مقام .... کوٹ میں پہنچے۔ گھوڑے کا سفر اور گھوڑے سے اکتائے تو

اونٹ کا سفر۔ خدا کی پناہ۔ پہلے روز ۲۷ میل سفر گھوڑے پر کیا۔ آپ
اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجھے کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی۔ لیکن جو تکلیف
محبت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو وہ لذیذ ہو جاتی ہے۔ فورٹ سنڈیمن ابھی
یہاں سے ۵۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ پرسوں پہنچیں گے بشرطیکہ کوئی
بارش نہ ہوئی۔"

ہماری پھوپھی کریم بی بی کی روایت ہے کہ اس مقدمہ کے فیصلے کے بعد چچا جان نے بیرسٹری پاس کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کا پختہ فیصلہ کیا تھا۔ واللہ اعلم

چچا جان کی آخری علالت کے دنوں میں ابا جان لاہور آئے ہوئے تھے۔ اُن کی عمر اس وقت ۸۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ پیری و صد عیب۔ اس پر بھائی کی علالت کی تشویش کا اعصاب اور دل پر اثر۔ ان کے علاج کے سلسلہ میں معالجوں سے اُلجھتے۔ ایک دن ابا جان کے پاؤں پر خفیف ورم دیکھ کر میں نے ڈاکٹر عبدالقیوم مرحوم سے اس کا ذکر کیا۔ وہ ہمارے قریبی عزیز تھے۔ ان دنوں غالباً لاہور میں تعینات تھے کیوں کہ چچا جان کی علالت کی وجہ سے زیادہ وقت جاوید منزل میں رہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ابا جان کو سیالکوٹ واپس جانے پر آمادہ کرنا چاہیئے ورنہ اُن کے نروس بریک ڈاؤن کا اندیشہ ہے اور پھر ایک اور مریض کو سنبھالنا پڑے گا۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں رضامند کیا کہ وہ ہفتہ عشرہ کے لئے سیالکوٹ ہو آئیں۔ چچا جان کی وفات سے تین چار دن پہلے وہ سیالکوٹ چلے گئے۔ میری والدہ ان کے ساتھ گئیں۔ ۲۱ اپریل کی صبح جس وقت لاہور میں چچا جان اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر رہے تھے۔ ابا جان عین اس وقت سیالکوٹ میں دیوان حافظ سے ان کی صحت کے متعلق فال لے رہے تھے۔ فال لینے کے بعد اُسی وقت چچا جان کو یہ خط لکھا:

سیالکوٹ

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء

مژدہ اے دل کہ دگر باد صبا باز آمد

برادرِ عزیز! السلام علیکم۔ اگرچہ میں سیالکوٹ میں ہوں لیکن میرا خیال آپ کی طرف رہتا ہے۔ شاید کسی مچھر نے کاٹا ہوگا۔ یہاں آکر میرے پاؤں میں ورم ہوگیا ہے جس کے باعث رات کو خفیف سی حرارت بھی ہو گئی لیکن صبح ٹمپریچر نارمل ہوگیا لیکن ورم ابھی باقی ہے۔ دوچار روز میں اچھا ہوگیا تو حاضر ہوں گا۔ رات آپ کے متعلق ایک خواب دیکھا تھا۔ صبح بعد نماز میں نے آپ کی صحت کی فال نکالی تو اوپر والا مصرع برآمد ہوا۔ دل کو تسلی ہوئی۔ انشاءاللہ آپ کو شفا ہوگی اور میں جلد آپ کو شفایاب دیکھوں گا۔ اعجاز کی والدہ آپ کی صحت سلامتی کے واسطے دعا کرتی رہتی ہے۔ جاوید اور منیرہ کو پیار اور دُعا۔ اپنی صحت کے متعلق مجھے لکھتے رہیں تاکہ تسلی رہے اور خیال کی پریشانی دور رہے۔

عطا محمد سیالکوٹ

معلوم ہوتا ہے یہ خط اُسی صبح ڈاک میں ڈلوا دیا گیا کیونکہ لفافہ پر سیالکوٹ کے ڈاکخانہ کی مُہر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء A.M 10-20 کی ہے۔ وفات کا تار اس خط کے پوسٹ ہونے کے بعد ملا ہوگا۔ یہ خط دوسرے دن یعنی ۲۲ اپریل ۳۸ء کو جاوید منزل پہنچا جب مکتوب علیہ ایسی جگہ جا چکے تھے جہاں یہ خط انہیں ری ڈائرکٹ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خط کو خود لکھنے والے نے ہی برستی آنکھوں سے وصول کیا اور پھر دسمبر ۴۰ء تک جب انکی اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔ وہ آنکھیں بھائی کے غم میں برستی ہی رہیں۔ یہ خط ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔

میں تو اپنی جائے ملازمت (دہلی) چلا گیا تھا۔ پھوپھی جی کہتی تھیں کہ بھائی صاحب اکثر اپنے کمرے میں تنہا بیٹھے یہ اشعار پڑھتے اور زار زار روتے۔

اندھیرا صمد کا مکاں ہوگیا
وہ خورشید روشن نہاں ہوگیا

بیاباں ہماری سرا بن گئی

مسافر وطن کو رواں ہوگیا

گیا اُڑ کے وہ بلبل خوش نوا

چمن پائمال خزاں ہوگیا

گرا کٹ کے آنکھوں سے لختِ جگر

مرے صبر کا امتحاں ہوگیا

جیسا کہ سالک[1] نے "ذکر اقبال" میں لکھا ہے "ابّا جان" احمدی عقاید رکھتے تھے۔" وہ بفضلِ خدا سابقون میں سے تھے اور بحمد اللہ وفات تک اپنے عقیدے پر قائم رہے۔

---

[1] خان صاحب سراج الدین ریاست کشمیر کے انگریز ریزیڈنٹ کے میر منشی تھے۔ موسم سرما میں ریزیڈنٹ کا دفتر سرینگر سے سیالکوٹ منتقل ہو جاتا تھا اس لئے سردیوں میں خان صاحب کا قیام سیالکوٹ شہر میں رہتا تھا۔ چچا جان سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے۔" اقبال نامہ" میں ان کے نام چچا جان کے چار خطوط شائع ہوئے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ تعلقات گہرے دوستانہ اور بے تکلفانہ تھے اور ۱۹۰۲ء سے پہلے کے تھے۔ خان صاحب کو شعر و سخن سے دلی شغف تھا۔ وہ شگفتہ مزاج، سخن فہم، بذلہ سنج اور بڑی باغ و بہار طبیعت کے آدمی تھے۔ حافظہ غضب کا پایا تھا۔ اردو اور فارسی کے اساتذہ کے سینکڑوں اشعار انہیں یاد تھے۔ مجلس آرائی ان پر ختم تھی۔ سردیوں میں شہر سیالکوٹ کی ادبی مجلسوں اور مشاعروں کی رونق ان ہی کے دم سے تھی۔ چچا جان نے اُن کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔" آپ ہندوستان کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کو شاعری سے طبعی مناسبت ہے اور اگر نیچر ذرا فیاضی سے کام لیتی تو آپ کو زمرۂ شعرا میں پیدا کرتی۔" اس رائے کے اظہار میں ذرا بھی مبالغے سے کام نہیں لیا گیا۔ خان صاحب اپنے آپ کو زمرۂ شعرا میں شمار کرتے تھے نہ کراتے تھے لیکن تفریحاً شعر کہنے اور فی البدیہہ کہنے پر بخوبی قادر تھے۔ جن دنوں میں سیالکوٹ میں وکالت کرتا تھا ان دنوں رات کے کھانے کے بعد ہم چند احباب ایک دوست کے ہاں گپ بازی کے لئے جمع ہوتے۔ خان صاحب بھی اس محفل میں بلا ناغہ شامل ہوتے اور

سچ پوچھئے تو ان کے بغیر محفل جمتی ہی نہ تھی ۔ اگر خان صاحب سے کسی کا سہرا یا کسی مصرع طرح پر غزل کہنے کی فرمائش کی جاتی تو فرماتے اچھا لکھو ۔ نشست فرش پر ہوتی تھی ۔ خان صاحب اپنا داہنا گھٹنا ہلاتے جاتے اور گنگناتے ہوئے شعر پہ شعر کہتے جاتے ۔ مولانا میر حسن سے بڑی عقیدت تھی ۔ ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر علی نقی کے بیٹے مہدی علی اور ان کے چھوٹے بیٹے سید محمد ذکی کے بیٹے عابد علی کی شادیوں کے موقع پر خان صاحب نے جو سہرے کہے وہ بہت مشہور ہوئے ۔ ڈاکٹر علی نقی جو پنجاب گورنر ہاؤس کے ڈاکٹر تھے ملازمت سے ریٹائر ہو کر سیالکوٹ آ گئے تھے ۔ سیالکوٹ چھاؤنی میں ان کی ایک کوٹھی رام جی داس اینڈ سنز کے پاس کرایہ پر تھی ۔ جس میں فوجی افسران کی ضرورت کی اشیاء فروخت ہوتی تھیں ۔ رام جی داس سرکاری نیلام کنندہ بھی تھے ۔ ہر اتوار کو ان کے ہاں انگریز افسران کے پرانے سامان کا نیلام ہوتا ۔ ڈاکٹر صاحب بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرنے والوں میں سے تھے ۔ انہوں نے اپنے لئے بہت سا پرانا فرنیچر رام جی داس کے نیلاموں میں خرید کیا ۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خان صاحب نے سہرے میں یہ شعر کہا :-

لوگ ہیں آج کے جز رس کہیں ایسا نہ کریں
رام جی داس سے لے آئیں پرانا سہرا

اس شعر پر محفل جس میں سہرا پڑھا گیا زعفران زار بن گئی ۔ چچا جان بھی اس محفل میں شریک تھے ۔ وہ عام طور پر ہنسی کے موقع پر صرف تبسم پر اکتفا کیا کرتے تھے لیکن میں نے دیکھا کہ اس شعر پر ان کے لئے ہنسی کو ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا ۔

خان صاحب کی فی البدیہہ شعر گوئی اور زود گوئی کی بیسیوں مثالیں ان کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو یاد ہیں ۔ یہاں صرف دو مثالیں بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں ۔ ایک دن میرا ایک موکل میرے لئے گنے کے رس کا ایک گھڑا لایا جو لکڑی کے بیلنے سے تیار کیا گیا تھا ۔ چونکہ لوہے کے بیلنے سے گنے کا رس زیادہ نکلتا ہے ۔ اس لئے ان بیلنوں کا عام رواج ہو گیا تھا ۔ اور لکڑی کے بیلنے خال خال تھے ۔ لکڑی کے بیلنے سے تیار کئے جانے والے رس کا اپنا مزہ ہوتا ہے ۔ اس لئے ان دنوں وہ ایک تحفہ چیز سمجھی جاتی تھی ۔ میں نے ملازم کے ہاتھ وہ گھڑا خان صاحب کے ہاں بھجوا دیا ۔ ان کا مکان ہمارے مکان کے سامنے والی گلی میں دو منٹ کے فاصلہ پر تھا ۔ ملازم جلدی واپس آیا اور یہ منظوم شکریہ ساتھ لایا ۔

رسید

تم نے بھیجا ہے جو گھڑا رس کا — شکر اس کا نہیں مرے بس کا

ذائقہ میں ہے شہد سے شیریں — رنگ اس کا ہے ہلکی اطلس کا

اس کی ہر بات میں ہے اک اعجاز — اُسکی نکہت میں عطر ہے خس کا

ایک سال گرمیوں میں میرے دوست چودھری بشیر احمد اور راقم الحروف سرینگر گئے۔ایک شام خان صاحب کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے۔ وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ دوسرے دن علی الصبح یہ منظوم معذرت ہماری جائے قیام پر موصول ہوئی۔

نکر یک لحظ

وارد ہوئے گھر میں مرے کل شام دو محبوب

میں گھر میں نہ تھا مل نہ سکا آج ہوں محجوب

یہ دولت بیدار تو خود گھر میں ہو حاضر

پر میں رہوں غائب یہ نظر آئے ہے معیوب

مجرم ہوں۔ دل وجاں سے سزاوار ہوں سب کا

جو جو بھی سزائیں ہوں میرے نام سے منسوب

چچا جان پر لکھنے والوں نے اُن کے "احباب" ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے ہیں جن میں سے کچھ تو واقعی ان کے احباب کے زمرہ میں شامل تھے اور کچھ "ہمہ گفتند با ما آشنا بود" کی ذیل میں آتے ہیں۔خان صاحب ایسے دیرینہ دوست پر کسی کی نظر نہیں پڑی۔اس کمی کو سید نذیر نیازی نے اپنی تصنیف "دانائے راز" میں ایک حد تک پورا کیا ہے۔

ے سنگیں دل است مرکہ بظاہر ملائم است
پنہاں اندرون پنبہ پنبہ دانہ را

ے اقبال نامہ حصہ اوّل۔صفحات ۵۔۶ حصہ دوم صفحات ۲۹۸۔۲۹۹

ے ہمارے بڑے پھوپھا کرم الٰہی کوئٹہ میں کاروبار کرتے تھے۔انہوں نے اس مقدمہ میں بڑی دوڑ دھوپ کی۔مجھے واقعہ کی تفاصیل انہیں سے معلوم ہوئیں۔انہوں نے بتلایا کہ میجر نے

اسی محتاط میانہ روی کے ساتھ انہوں نے اپنی محدود آمدنی میں ایک متوسط حال انسان کی طرح زندگی بسر کی۔

لباس کے معاملہ میں ابّا جان خوش پوش تھے۔ خود بھی اچھا پہنتے اور متعلقین کو بھی اچھا پہناتے۔ چچا جان لباس کی طرف سے بالکل لاپرواہ تھے۔ انگلستان جانے تک تو ان کے لباس کا انتظام خود ابّا جان کرتے تھے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد لاہور میں مقیم ہوئے تو بے جی کی زندگی میں میاں جی کے خریدے ہوئے دیدہ زیب بارڈر والی بدیسی دھوتیوں کے جوڑے اور چابی مارکہ لٹھے کی شلواریں حافظ محمد حیات ٹیلر ماسٹر کی سلی ہوئی سیالکوٹ سے جاتی رہیں۔ پھر شادیاں ہوئیں تو یہ انتظام سردار بی بی جان نے سنبھالا۔ وہ اپنی پسند کا کپڑا منگوائیں اور جو لباس درکار ہوتا سلوا دیتیں۔ چچا جان نے نہ کبھی کپڑا پسند کرنے میں حصہ لیا نہ لباس کی تیاری میں۔ گھر میں گرمیوں میں زیادہ تر دھوتی اور بنیان پہنے رہتے۔ سردیوں میں قمیص اور شلوار۔ کچہری جاتے وقت کوٹ پتلون مجبوراً پہنتے۔ گھر آکر پہلا کام انھیں اتار پھینکنے کا کرتے۔ انگلستان میں سر پر فیلٹ ہیٹ استعمال کی ہوگی۔ کیونکہ ایک عرصہ تک ایک پرانی فیلٹ کو میں نے ان کے کمرے میں ایک کھونٹی پر لٹکے دیکھا ہے لیکن اپنے ملک میں کبھی انگریزی ٹوپی استعمال نہیں کی۔ پہلے ترکی ٹوپی پہنتے یا لنگی بغیر کلاہ باندھتے۔ بعد میں اُس قسم کی ٹوپی بھی پہنی جو اب جناح کیپ کہلاتی ہے۔

اولاد کی تربیت کے سلسلہ میں ابّا جان جسمانی سزا دینے کے قائل تھے۔ اس کے برعکس چچا جان نے ہمارے لڑکپن میں کبھی کسی کو جسمانی سزا نہیں دی۔ جاوید نے لڑکپن میں اُن سے ایک مرتبہ تین چار تھپڑ کھانے کا ذکر ایک مضمون میں کیا ہے لیکن جس قصور پر وہ سزا دی گئی اس کی نوعیت کے لحاظ سے وہ واقعہ ایک استثنا کی حیثیت رکھتا ہے چچا جان کے تادیباً سزا دینے کا ایک ہی واقعہ مجھے یاد ہے جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ چچا جان عدالت کی تعطیلوں میں سیالکوٹ آئے ہوئے

تھے۔ دوپہر کے وقت وہ حسبِ معمول بے جی کے کمرے میں آرام فرما تھے۔ یہ کمرہ گلی کی طرف ہے عین اس کمرے کے نیچے میدان میں ہم سب لڑکے کھیل رہے تھے۔ ہمارے پڑوس میں آٹھ نو سال کی ایک قبول صورت لڑکی یتیم ہونے کے باعث اپنی پھوپھی کے پاس رہتی تھی۔ اس کا نام اللہ رکھی تھا۔ وہ آئی تو اسے دیکھ کر آفتاب کی رگِ شاعری پھڑکی اور اُسے مخاطب کرتے ہوئے پنجابی میں یوں قافیہ آرائی کی:۔

رکھّی ۔ رکھّی ۔ رکھّی ۔ تیرے مُنہ تے بیٹھی مکھّی

لڑکی سخن شناس نہ سہی لیکن اتنا تو سمجھتی تھی کہ چہرے پر مکھّی بیٹھنا اُس کا قصیدہ نہیں ہجو ہے۔ اُس نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔ اُس کی رونے کی آواز سن کر اُس کی پھوپھی جو محلہ بھر میں کلّہ درازی اور گرم گفتاری کے لئے مشہور تھی آگئی۔ آفتاب بھائی کی قافیہ آرائی کا حال سُن کر اس نے نثر میں "شاعر" کی سات پشتوں کو پن ڈالا۔ یہ ہنگامہ برپا تھا کہ ملازم لڑکا ہماری طلبی کا حکم لے کر آیا۔ ہم سب ڈرتے ڈرتے چچا جان کے حضور حاضر ہوئے۔ یقین تھا کہ آج سب کی پٹائی ہو گی اور گیہوں کے ساتھ گھن بھی پِسے گا۔ چچا جان خاموشی سے اُٹھے۔ کھونٹی پر پھوپھی جی کا سفید ململ کا دوپٹہ لٹک رہا تھا۔ اُسے لے کر مکھّی کا قافیہ باندھنے والے "شاعر" کے دونوں ہاتھ باندھ دیئے اور کمرے کے کونے میں دیوار کی طرف مُنہ کرکے کھڑا کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد بے جی نے آکر ان کی خلاصی کرائی۔ آفتاب بھائی نے اپنی حیات میں فلسفہ، قانون اور نہ جانے اور کس کس میدان میں اپنے اشہبِ طبع کو دوڑایا لیکن قافیہ آرائی کے میدان کی طرف پھر رُخ نہیں کیا۔ شاید یہ چچا جان کے طریق تادیب کا نفسیاتی اثر ہو۔

ابّا جان سے تادیباً جسمانی سزا پانے میں اول نمبر پر میرا منجھلا بھائی اعجاز مرحوم تھا۔ اُسے تعلیم سے بے رغبتی تھی۔ مدرسہ جانے سے جی چُراتا تھا۔ پٹنے کے باوجود شاید چوتھی یا پانچویں جماعت سے آگے پڑھ کے نہیں دیا۔ اُس کی طبیعت کا

مرحومہ کی یاد ہیں" کہی تھی اُسے خوش نویس سے لکھوا کر میاں جی کے لئے بھیجا تھا۔ وہ نظم ابھی کسی اخبار یا رسالے کو اشاعت کے لئے نہیں دی گئی تھی۔ عدالت کی تعطیلوں میں چچا جان سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ ایک دن ڈاک میں ان کے نام منڈی بہاء الدین سے شائع ہونے والے ماہنامے "صوفی" کی ایک کاپی آئی جس میں وہ پوری نظم چھپی ہوئی تھی۔ چونکہ انہوں نے وہ نظم اشاعت کے لئے کسی کو نہ دی تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر انہیں خیال ہوا ہوگا کہ صوفی والوں کو یہ نظم سیالکوٹ سے ملی ہے اور سیالکوٹ میں میرے علاوہ ایسا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے چنانچہ مجھے بلوایا اور استفسار کیا کہ یہ نظم صوفی میں کیسے شائع ہو گئی۔ چونکہ میں نے نظم اشاعت کے لئے نہیں دی تھی میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ بظاہر خاموش ہو گئے لیکن چہرے کے تکدر سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ میرے انکار کو درست نہیں سمجھتے۔ کاغذ قلم منگوا کر صوفی والوں کو نوٹس تحریر کیا کہ ان کی نظم بغیر ان کی اجازت کے کیوں شائع کی گئی۔ ان کے ارشاد پر میں وہ نوٹس ڈاک خانہ جا کر رجسٹری کرا آیا۔ واپس آ کر بڑا پریشان تھا کہ اگرچہ ناکردہ گناہ ہوں لیکن چچا جان ضرور مجھے ہی مجرم سمجھے ہوئے ہیں۔ اسی پریشانی میں صوفی میں شائع شدہ نظم پڑھنے بیٹھ گیا۔ پڑھتے پڑھتے محسوس کیا کہ کچھ اشعار غیر مانوس ہیں۔ میں نے گھر میں نظم کی جو کاپی تھی اس کا مقابلہ "صوفی" میں شائع ہونے والی نظم سے کیا تو ایک دو نہیں پورے نو اشعار ایسے ملے جو سیالکوٹ والی کاپی میں نہ تھے۔ یہ انکشاف میرے لئے بڑی خوشی کا باعث ہوا کیونکہ میری بریت کا اس سے بہتر ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ صوفی میں شائع شدہ نظم میں نو اشعار ایسے ہیں جو سیالکوٹ والی کاپی میں نہیں وہ بہت متعجب ہوئے اور فرمایا "پھر تو نظم کسی طرح میرے ہاں سے اڑائی گئی ہے۔" میں نے اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کیا۔ "رسیدہ بود بلائے ولے بہ خیر گذشت۔"

ماہنامہ صوفی کے مالک و مدیر کے صاحبزادے ملک محمد اسلم قیام پاکستان کے بعد وزارت خوراک و زراعت میں کچھ عرصہ میرے ساتھ کام کرتے رہے ہیں اور اب بھی گاہے گاہے ان سے ملنا ہوتا ہے۔ میں نے جب بھی ان سے دریافت کیا ہے کہ وہ نظم

صوفی تک کیسے پہنچی تو انہوں نے ہنس کر ٹال دیا ہے۔صوفی والوں نے نوٹس کے جواب میں معافی مانگ لی تھی اور چچا جان نے کوئی مزید کارروائی نہیں کی۔

دوسرا واقعہ اس سے کئی سال بعد کا ہے۔چچا جان سیالکوٹ آئے ہوئے تھے ایک سہ پہر میاں جی کے کمرے کے باہر تخت پوش پر باپ بیٹا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ قریب ہی باورچی خانہ سے باہر بھابھی جی، پھوپھی جی اور خادمہ عورت رات کے کھانے کے اہتمام میں مشغول تھیں۔چچا جان نے آواز دے کر مجھے حقہ کی چلم بھرنے کا حکم دیا گھر میں دستور تھا کہ میاں جی کے لئے حقہ کی چلم بھابھی جی خود بھرتی تھیں۔ وہ کسی اور کی بھری ہوئی چلم فوراً پہچان لیتے اور کہتے "معلوم ہوتا ہے مہتاب آج گھر میں نہیں۔ حقے کا مزہ نہیں آیا۔" یہ جانتے ہوئے کہ حقہ میاں جی نے بھی پینا ہے۔میں نے حقہ سے چلم اٹھائی اور چولہے کے پاس جاکر وہ بھابھی جی کے ہاتھ میں دے دی۔ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا ہے۔چچا جان دھاڑ رہے تھے" کم بخت احمق آدمی۔میں نے تمھیں چلم بھرنے کو کہا تھا۔ تم نے چلم بھرنے کے لئے بھابھی جی کو دے دی ہے۔" میں تو اس غیر متوقع برہمی مزاج کی وجہ نہ سمجھ کر مبہوت ہوگیا۔لیکن پھوپھی کریم بی بی ان کے برہم ہونے کی وجہ سمجھ کر بولیں" میاں جی کو اور کسی کی چلم بھری ہوئی پسند نہیں آتی۔" بارے اس وضاحت سے میری صفائی ہوگئی اور چچا جان کا غصہ فرو ہو گیا۔ میں ڈانٹ کھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔تھوڑی دیر بعد چچا جان غالباً تلافیٔ مافات کے لئے میرے کمرے میں تشریف لائے۔ آتے ہی فرمایا" بھابھی جی میرے لڑکپن میں اس گھر میں بیاہ کر آئی تھیں۔میں شاید چوتھی یا پانچویں جماعت میں تھا۔انہوں نے مجھے بیٹوں کی طرح پالا اور میرے لئے وہ بے جی کی جگہ ہیں۔میں اُن سے اپنے لئے حقہ کی چلمیں نہیں بھروا سکتا۔" میں نے چلم بھابھی جی کے سپرد کرنے کی وہی وضاحت کی جو پھوپھی جی کر چکی تھیں تو فرمایا" میاں جی کی اور بات ہے۔" پھر اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ سنایا جو میں نے بھابھی جی سے بھی سنا ہوا تھا۔ فرمایا مجھے تعلیم کے لئے سکول جانے کا اتنا شوق تھا کہ رات کو نیند میں بھی سکول کے ہی خواب دیکھتا۔ایک رات خواب ہی دیکھا ہو

گا کہ سکول جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اُٹھ کر نیند میں ہی بستہ بغل میں داب گھر کے بند دروازے پر پہنچ گیا۔ اتنے میں بھابھی جی کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے آ کر مجھے پکڑ لیا اور پوچھا اس وقت کہاں جا رہے ہو۔ میں نے کہا سکول۔ انہوں نے کہا آنکھیں کھول کر دیکھو ابھی تو آدھی رات ہے۔ پھر مجھے بستر پہ لا کر سُلا دیا۔ اُس دن سے میری چارپائی کے ایک طرف بے جی کی چارپائی بچھتی اور دوسری طرف بھابھی جی کی تاکہ میں پھر کبھی رات کو سکول جانے کے لئے باہر نہ نکل کھڑا ہوں۔ پھر دیر تک بھابھی جی کی قصیدہ خوانی کرتے رہے جس میں ذرہ بھر مبالغہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ خاتون واقعی ایک مثالی خاتون تھیں۔ کم گو، حلیم طبع، بردبار، صابر، ہر ایک سے بھلائی کرنے والی۔ ہر ایک کے کام آنے والی فرشتہ سیرت جس کی زبان کبھی کسی کی بدگوئی سے آلودہ نہ ہوئی۔ یقین ہے اللہ تعالےٰ نے اپنے کمال فضل سے اُن کے ساتھ ویسا ہی رحمت کا سلوک کیا ہو گا۔ جیسا وہ اُس کے بندوں کے ساتھ کیا کرتی تھیں۔

دونوں بھائیوں کی مردم شناسی اور فراست میں بھی بڑا فرق تھا۔ ابّا جان جذباتی انسان تھے۔ چچا جان کے انتباہ کے باوجود اُن کی حیات میں اور اُن کی وفات کے بعد بھی بعض ایسے عزیزوں کی طرف داری کرتے رہے۔ جنہوں نے اُن کی وفات کے بعد اُن پر اتہام تراشی کر کے اُن کے سلوک کا بدلہ چکایا۔ خیر اب ہر دو فریق اپنے رب کے حضور میں ہیں اور وہ اُن کے مابین انصاف کرنے کے لئے کافی ہے۔

دونوں بھائیوں میں ایک قدر مشترک بھی تھی وہ یہ کہ دونوں کو موت کا ڈر نہ تھا۔ موت و حیات کے متعلق اپنا نظریہ چچا جان نے اپنے کلام میں کئی جگہ بیان کیا ہے اور نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" تو وضاحت سے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ زندگی کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔ اور "موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں۔" موت سے نہ ڈرنے اور "تبسم بر لب" اس کا استقبال کرنے کا سبق صرف "شاعری" نہ تھی۔ گھر میں بھی اس موضوع پر گفتگو ہوتی تو یہی تلقین فرماتے۔ ان کا قول تھا کہ موت سے وہی ڈرتا ہے جسے حیات مابعد الموت کا یقین نہ ہو۔ ۱۸ء میں آفتاب بھائی سینٹ سٹیفن

کالج دہلی میں پڑھتے تھے۔ وہاں بیمار ہو گئے۔ میاں جی نے چچا جان کے نام اپنے خط میں اس کا ذکر کیا تو جواب میں میاں جی کو لکھا۔ "آپ اُسے خط لکھیں اور تسلی دیویں کہ بیماری سے گھبرانا نہ چاہیئے اور نہ موت سے ڈرنا چاہیئے۔"[۵] فلسفی شاعر تے تو فلسفیانہ اور شاعرانہ رنگ میں اس موضوع پر بات کی ہے۔ ابا جان عملی انسان تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ اپنے عمل سے موت سے نہ ڈرنے کا مظاہرہ کیا۔ اس اجمال کی تفصیل شاید دلچسپی کا باعث ہو۔ ابا جان نے 'بے جی' کے مرقد کی تعمیر کرائی تو اُن کی قبر کے ساتھ دو قبریں اور تیار کرائیں۔ ایک میاں جی کے لئے اور دوسری اپنے لئے چچا جان کی بیٹی معراج آپا نے بستر مرگ پر ابا جان سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ انہیں اُس قبر میں دفن کیا جائے جو ابا جان نے اپنے لئے تیار کرائی تھی اور ان کی اس آخری خواہش کو پورا کیا گیا۔
کچھ سالوں بعد ابا جان نے اُسی قبرستان میں اپنے اور میری والدہ صاحبہ کے لئے دو قبریں تیار کرائیں۔ یہ قبریں ہمارے ایک قرابت دار بھائی محمد حیات کی زیر نگرانی تیار ہوئیں۔ ابا جان جو بقول چچا جان "قامت میں سرو بلند" تھے معائنہ کیلئے گئے تو بھائی حیات سے دریافت کیا "حیات میرے والی قبر کی لحد کی لمبائی تو ناپ کر دیکھ لی ہے۔" انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ ابا جان نے کہا "نہیں بھئی میں خود لیٹ کے دیکھ لوں کہیں دقت پر تم لوگوں کو مشکل نہ پڑے۔" چنانچہ قبر میں اُترے اور لحد میں لیٹ کر اطمینان کر لیا کہ لمبائی پوری ہے۔ شام کے وقت حسب دستور ڈاکٹر میر حیدر[۶] کی کلینک میں بے فکروں کی محفل جمی تو بھائی حیات کی زبانی اس واقعہ کا ذکر وہاں بھی پہنچا۔ اس مجلس میں ایک صاحب چودھری جلال خاں بھی روز کے آنے والے تھے۔ انہوں نے ابا جان سے دریافت کیا "بابو جی[۷] تُہانوں قبر وچ لیٹ دیاں ڈر نہ آیا؟" (آپ کو قبر میں لیٹتے ہوئے ڈر نہ آیا) ابا جان نے ہنس کر کہا "جلال خاں جتھے کُجھ دناں بعد تُساں مینوں لجا کے قیامت تک لئی لٹا آناں ایں اوتھے اَج لیٹن وچ ڈر کادا" (جہاں کچھ دنوں بعد تم لوگ مجھے لے جا کر قیامت تک کے لیے لٹا آؤ گے وہاں آج لیٹنے میں ڈر کیسا۔"

۱ سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۳۰

۲ مٹے لالہ نام (اشاعت اول ۱۹۶۶) تتمہ صفحہ ۱۶۷

۳ تیرے چہرے پہ بیٹھی مکھی

۴ STEFEN'S INK

۵ میاں جی کے نام محررہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۱۸ء

۶ ڈاکٹر میر حیدر چچا جان کے دوست سید بشیر حیدر کے والد اور مولانا میر حسن کے قرابت دار تھے۔ پنشن پانے کے بعد محلہ حکیم حسام الدین کے ایک یک منزلہ مکان میں ڈاکٹری کی پریکٹس کرتے تھے۔ ہاتھ میں شفا بھی تھی۔ اس لئے صبح کے وقت مریضوں کا ہجوم رہتا تھا۔ سہ پہر میں ان کا مطب ایک طرح کا کلب گھر تھا جس میں اُن کے احباب گپ بازی کے لئے جمع ہوتے۔

۷ انگریزی راج کے ابتدا میں انگریز فوجی افسران اپنے ماتحت دفتروں کے ہندوستانی ملازمین کو "بابو" کہتے تھے۔ فوج کی ملازمت میں یہ لفظ اباجان کے نام کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا۔

باب ۹

اقبال منزل

اقبال منزل یعنی وہ مکان جس میں چچا جان پیدا ہوئے شہر سیالکوٹ کے اقبال بازار میں واقع ہے۔ یہ بازار چوک دودروازے سے شروع ہو کر چوک اڈہ پسروریاں پر ختم ہوتا ہے۔ پہلے اس بازار کے چوک دودروازے طرف والے حصہ کو بازار دودروازہ کہتے تھے اور اڈہ پسروریاں طرف والے حصہ کو بازار اڈہ پسروریاں۔ درمیانی حصہ جو اقبال منزل کے سامنے ہے بازار چوڑی گراں کہلاتا تھا کیونکہ وہاں کانچ کی چوڑیوں کی بہت سی دکانیں تھیں۔ اگرچہ اس بازار سے بھی اقبال منزل کے رہائشی حصّہ میں جانے کے لئے ایک زینہ ہے لیکن مکان کا صدر دروازہ مغرب کی جانب محلہ چوڑیگراں میں ہے۔

ہمارے اجداد جب کشمیر سے آکر شہر سیالکوٹ میں آباد ہوئے تو ان کی سکونت پہلے محلہ کھٹیکاں میں تھی جس میں یہ لوگ برسوں آباد رہے۔ ۱۸۶۱ء کے شروع میں علامہ کے دادا شیخ محمد رفیق نے محلہ چوڑیگراں میں ایک یک منزلہ پختہ مکان ۱۵۰/- روپے میں خرید کیا جو اس وقت صرف دو کوٹھڑیوں، ایک دالان، ایک ڈیوڑھی اور صحن پر مشتمل تھا۔ اس مکان میں یہ خاندان ۳۱ سال مقیم رہا۔ اسی مکان کی ایک کوٹھری میں چچا جان ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ اسی میں انہوں نے اپنا لڑکپن گزارا اور اسی میں دسویں جماعت تک سکول کے تعلیمی

مراحل طے کئے۔

میرے ابا جان ۱۸۸۰ء سے فوج میں ملازم تھے۔ اُن کی ملازمت کی وجہ سے مستقل آمدنی کی صورت پیدا ہوئی تو گھر کی مالی حالت نسبتاً بہتر ہو گئی۔ ۱۸۹۲ء میں جب چچا جان کی نسبت گجرات شہر کے ایک خاندان میں طے پائی تو مکان میں توسیع کی ضرورت محسوس ہوئی۔ شادی ۱۸۹۳ء کے نصف اول میں ہوئی تھی اس لئے دسمبر ۱۸۹۲ء میں اس مکان کے ساتھ لگتا ایک دو منزلہ مکان ۴۰۰/- میں میاں جی کے نام خرید لیا گیا۔ پھر ۱۸۹۵ء کے شروع میں ان دو مکانات کے ساتھ لگتی بازار چوڑی گراں میں واقع دو دکانات بھی میاں جی کے نام خریدی گئیں۔ ان دو مکانات اور دو دکانات کو ملا کر ایک دو منزلہ مکان تعمیر کیا گیا جس میں ہم لوگ ۱۹۱۰ء تک سکونت پذیر رہے۔ ۱۹۱۰ء کے نومبر میں ابا جان ۱½ سال کی رخصت قبل از پنشن لے کر گھر آ گئے۔ آتے ہی پرانے مکان کو گرا کر نیا سہ منزلہ مکان تعمیر کرایا جس کو "اقبال منزل" کا نام دیا گیا۔ مکان کی تعمیر کے بعد جنوری ۱۹۱۲ء میں ابا جان واپس ملازمت پر گئے اور پھر ستمبر ۱۹۱۲ء میں پنشن پر ریٹائر ہو گئے۔ ابا جان نے ۱۹۱۵ء میں اقبال منزل کے ساتھ لگتی ایک اور دکان بازار چوڑیگراں میں خریدی اور اس پر سہ منزلہ عمارت تعمیر کر کے اُسے بھی اقبال منزل میں شامل کر دیا۔

اقبال منزل کے متعلق ان خشک تفاصیل کے بیان کی ایسی ضرورت تو نہ تھی لیکن چچا جان کے "کمرۂ ولادت" کے متعلق ایک غلط روایت کی تصحیح کے لئے ایسا کرنا پڑا ہے بزم اقبال لاہور کی شائع کردہ کتاب "ذکرِ اقبال" میں اقبال منزل کے بازار کے رُخ والے ایک کمرہ کی تصویر دی گئی ہے جسے "کمرۂ ولادت علامہ اقبال" بیان کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ جو تفاصیل اوپر بیان کی گئی ہیں اُن سے ظاہر ہے کہ ۱۸۷۷ء میں چچا جان کی ولادت کے وقت موجودہ اقبال منزل کا بازار چوڑیگراں کے رُخ والا حصہ ابھی اس خاندان کی ملکیت بھی نہ تھا۔ اُس وقت تک ان کی سکونت اس یک منزلہ مکان میں تھی جو محلہ چوڑیگراں میں ۱۸۶۱ء میں خریدا گیا تھا اور چچا جان کی ولادت اُسی مکان کی کسی ایک کوٹھری میں ہوئی ہو گی۔ اقبال منزل کی موجودہ صورت میں تو اس کوٹھری کی جگہ کی نشان دہی بھی ممکن نہیں کسی

فرضی کمرے کو ان کی ولادت کا کمرہ ظاہر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ولادت اس مکان میں ہوئی جو اب اقبال منزل کے نام سے موسوم ہے۔ پچھلے دنوں کراچی کے کثیر الاشاعت روزنامہ جنگ میں بھی اقبال منزل کے ایک کمرے کی تصویر شائع کی گئی جسے علامہ اقبال کے آبائی مکان کی وہ جگہ جہاں "علامہ بیٹھ کر تصنیف و تالیف کرتے تھے" بیان کیا گیا حالانکہ تصنیف و تالیف کا جو کام بھی انہوں نے کیا وہ لاہور والی رہائش گاہوں میں کیا۔ سیالکوٹ کے آبائی مکان میں انہوں نے کبھی تصنیف تالیف کا کام نہیں کیا۔ معلوم نہیں ایسے فرضی قصے بنانے کی کیا ضرورت پیش آتی ہے۔

ہمارا گھرانہ ایک متوسط حال گھرانہ تھا۔ اقبال منزل کے علاوہ اس سے ایک مکان چھوڑ ایک اور مختصر سا مکان ابا جان کی ملازمت کے دوران میاں جی کے نام خرید کر نو تعمیر کیا گیا تھا جس کا ذکر میاں جی کے ذکر میں بیان کیا جا چکا ہے۔ ساتھ والے محلہ چاہ دہاب میں بھی ایک یک منزلہ چھوٹا سا مکان میاں جی کے نام تھا جس کی قیمت ۱۹۳۰ء میں قریباً ۸۰۰/- تھی۔ خاندان کی غیر منقولہ جایئداد کے لحاظ سے "غرب اور کل کائنات اسکی یہی تھی"۔ میاں جی نے تو میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اپنا کاروبار بند کر دیا ہوا تھا اور خاندان کی گزر بسر ابا جان کی آمدن پر تھی۔ اس مختصر جایئداد کا بیشتر حصہ ابا جان کی کمائی سے خریدا ہوا تھا اور انہیں کی کمائی سے دونوں مکانات کی از سر نو تعمیر ہوئی تھی لیکن خاندان کے بزرگ ہونے کی وجہ سے یہ سب جایئداد کاغذات میں میاں جی کے نام تھی اور قانوناً انہیں کی ملکیت شمار ہوتی تھی۔ میاں جی کی وفات سے دو ایک سال پہلے کی بات ہو گی۔ چچا جان عدالتوں کی تعطیل میں سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ چونکہ خود قانون دان تھے اور قانونی پیچیدگیوں سے واقف تھے۔ اس لئے ایک دن ابا جان سے کہا کہ اگرچہ اس جایئداد کی خرید و تعمیر میں ان کا کوئی حصہ نہیں لیکن چونکہ جایئداد میاں جی کے نام ہے اس لئے ان کی وفات کے بعد قانون اس میں ان کو بھی حقدار قرار دے گا۔ لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ قانونی طریقہ سے وہ اپنے حصہ سے دستبردار ہو جائیں۔ ابا جان اس تجویز سے متفق نہ تھے۔ انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ جایئداد میں سے چچا جان کو کچھ بھی نہ ملے۔ آخر ابا جان کے اصرار پر چچا جان نے ساتھ والا چھوٹا مکان لینا منظور کیا۔ اس فیصلہ کو قانونی شکل

اس طرح دی گئی کہ چھوٹے مکان کا ہبہ نامہ میاں جی نے جاوید کے نام جو ابھی نابالغ تھا کر دیا اور میاں جی کی وفات کے بعد ستمبر سن ۳ء میں چچا جان نے باقی جائیداد میں اپنے حقوق سے دست برداری لکھ دی۔ دست برداری کی یہ تحریر اسٹامپ کے کاغذ پر بقلم چچا جان کی تحریر کردہ ہے۔ یہ دستاویز ۱۳ اکتوبر سن ۳ء کو سب رجسٹرار سیالکوٹ کے روبرو منشی طاہر دین نے چچا جان کے مختار خاص کے طور رجسٹری کرائی۔ دستاویز کا متن اس کتاب میں نقل کر دیا گیا ہے۔

جو مکان جاوید کے نام ہبہ کیا گیا تھا وہ کچھ عرصہ بعد چچا جان نے جاوید کے گارڈین کے طور پر ہمارے ایک عزیز کے ہاتھ جو اس محلہ میں مکان خرید کرنے کے خواہش مند تھے فروخت کر دیا۔ چونکہ اُن سے قرابت داری تھی اس لئے قیمت میں کچھ رعایت بھی کی گئی۔ اس سلسلہ میں ایک بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے چچا جان کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ اس مکان کے ساتھ لگتا مکان ایک مفتی صاحب کا تھا۔ وہ بھی اس کی خرید میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ہمارے عزیز کو اندیشہ تھا کہ مفتی صاحب قانون شفع کے تحت عدالتی کارروائی کر کے قیمت مندرجہ بیعنامہ ادا کر کے مکان ان سے لے سکیں گے لہٰذا اُن کی خواہش تھی کہ بیعنامہ میں باہمی طے شدہ قیمت سے زیادہ قیمت کا اندراج کیا جائے تاکہ اگر مفتی صاحب شفع کا دعویٰ کریں تو انہیں ہمارے عزیز کو زیادہ قیمت ادا کرنی پڑے۔ ان دنوں شفع کی کارروائی روکنے کے لئے یہ ترکیب اکثر عمل میں لائی جاتی تھی۔ چچا جان نے بیعنامہ میں اور رجسٹرار کے روبرو غلط بیانی کرنے سے انکار کر دیا۔ ہمارے عزیز کا کہنا تھا کہ رجسٹرار کے سامنے تو حقیقی رقم بیعنامہ میں لکھی جائے گی۔ وہ پوری ادا کی جائے گی لہٰذا چچا جان کوئی غلط بیانی نہیں کریں گے۔ لیکن یہ موشگافی بھی چچا جان کو اس تجویز کے ماننے پر آمادہ نہ کر سکی اور بیعنامہ میں اتنی ہی رعایتی قیمت لکھی گئی جو طے پائی تھی۔ بیعنامہ ہو جانے کے تھوڑا عرصہ بعد مفتی صاحب نے ہمارے عزیز کے خلاف حق شفع کا دعویٰ دائر کر دیا اور قیمت مندرجہ بیعنامہ (جو رعایتی قیمت تھی) ادا کر کے مکان کی ڈگری حاصل کر لی۔ ان عزیز کو عمر بھر چچا جان سے شکایت رہی۔ کہا کرتے تھے "جی اپناں سچ دی کس کم دا جدے

نال اپنیاں دا نقصان ہووے" (اتنی راست گوئی بھی کس کام کی جس سے اپنوں کا نقصان ہو)

اقبال منزل کے ذکر میں اُن دو ایک واقعاتی غلطیوں کی تصحیح کر دینا ضروری ہے جو کسی غلط فہمی کی وجہ سے سیّد نذیر نیازی کی " دانائے راز " میں در آئی ہیں۔ نیازی صاحب لکھتے ہیں :-

"شیخ نور محمد اسی محلے سے ملحق ایک چھوٹی سی گلی چوڑی گراں میں رہتے تھے۔ مکان چھوٹا تھا۔ اُن کے والد کا خرید کردہ کچھ کچا، کچھ پکا۔ ایک ڈیوڑھی، ایک آنگن۔ ایک دالان اور دو کوٹھریاں۔ حکیم الامّت اسی مکان میں پیدا ہوئے۔ یہ جو اس مکان سے ملحق اقبال منزل کے نام سے سر بازار ایک سہ منزلہ عمارت کھڑی ہے۔ ان کی جائے پیدائش نہیں ....

.... اصل مکان جسے ۳۸ء میں انہوں نے بڑے بھائی کے نام ہبہ کر دیا علیٰ حالہٖ قائم ہے۔"

یہ تو درست ہے کہ چچا جان اس مکان میں پیدا ہوئے جو اُن کے دادا نے ۱۸۶۱ء میں خرید کیا تھا۔ لیکن موقعہ پر دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ مکان " اقبال منزل سے ملحق علیٰ حالہٖ قائم " نہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ۱۸۹۲ء میں اس مکان کے ساتھ لگتا ایک دو منزلہ مکان اور پھر ۱۸۹۵ء میں اُن دونوں مکانوں کے ساتھ لگتی دو دوکانات واقع بازار چوڑیگراں خرید کر ان تینوں جائیدادوں کو ملا کر ایک مکان کی صورت میں تعمیر کیا گیا جس میں ہم لوگ ۱۹۱۰ء تک رہتے رہے پھر ۱۹۱۰ء میں اُسے گرا کر نو تعمیر کیا گیا جو اب اقبال منزل کے نام سے موسوم ہے۔ چونکہ ۱۸۶۱ء میں خرید کردہ مکان جس میں حکیم الامّت کی پیدائش ہوئی ۱۸۹۵ء سے اس مکان میں شامل ہو کر جو اب اقبال منزل کہلاتا ہے اُس کا حصہ بن چکا ہے اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ " اقبال منزل کے نام سے جو سر بازار ایک سہ منزلہ عمارت کھڑی ہے اُن (حکیم الامّت) کی جائے پیدائش نہیں"

نیازی صاحب کا یہ بیان کہ اصل مکان جس میں علامہ کی پیدائش ہوئی۔ انہوں نے

۱۹۳۰ء میں اپنے بھائی کے نام ہبہ کر دیا بھی کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ۱۹۳۰ء میں نہ وہ
مکان علیٰ حالہٖ قائم تھا نہ اس مکان کا یا کسی اور مکان کا ہبہ ۱۹۳۸ء میں علامہ نے اپنے بڑے
بھائی کے نام کیا۔ خاندان کی جو تھوڑی بہت جائیداد تھی اس کی باہمی تقسیم کا قصہ تفصیل سے
بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق میاں جی کی حیات میں چچا جان کے حصّہ میں آنے والے
مکان کا ہبہ نامہ میاں جی نے جاوید کے نام کر دیا تھا اور میاں جی کی وفات کے بعد اقبال
منزل وغیرہ میں اپنے حقوق سے دست برداری کی تحریر چچا جان نے ستمبر ۱۹۳۰ء میں تحریر کر
کے رجسٹری کرا دی تھی جس کی نقل اس کتاب میں شامل ہے۔ اس رجسٹری شدہ تحریر کے
۸ سال بعد ۱۹۳۸ء میں کسی ہبہ نامہ کے تحریر کئے جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی نہ کوئی ایسا ہبہ
نامہ تحریر ہوا۔ نیازی صاحب کا بیان ہے کہ اس دستاویز پر (جسے وہ ہبہ نام کہتے ہیں) اُن
کے دستخط بطور گواہ لئے گئے۔ ایک امکان یہ ہو سکتا ہے کہ یہ دستاویز جس پر نیازی صاحب
کے دستخط کرائے گئے۔ اُس مکان کا بیعنامہ ہو جو میاں جی نے جاوید کے نام ہبہ کیا تھا اور
جو بعد میں چچا جان نے جاوید کے ولی کی حیثیت میں ہمارے ایک عزیز کے پاس فروخت کر
دیا جس کی تفصیل بھی اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ بقول نیازی صاحب چچا جان نے دستاویز پہ
اُن سے دستخط کرانے وقت یہ الفاظ کہے "جاوید کا اپنا مکان موجود ہے۔ اُسے اس مکان کی
کیا ضرورت۔ بھائی صاحب کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ علی بخش یہ نامہ لے اور ان کے دستخط
لے لو۔" اِن الفاظ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ دستاویز اُس مکان کے متعلق تھی جو جاوید کے
نام ہبہ ہو کر اُس کی ملکیت ہو چکا تھا۔ جاوید منزل کی موجودگی میں چچا جان سمجھتے تھے کہ جاوید
کو ہبہ شدہ مکان کی کیا ضرورت ہے لہٰذا اُسے فروخت کر دینا چاہیئے۔ بھائی کے احسانوں
کا ذکر اس لیے کیا کہ مکان اُن کی بیٹی کے داماد کے پاس رعایتی قیمت پر فروخت کیا گیا جس
کے لئے اباجی نے سفارش کی ہو گی۔

عرصہ سے اخبارات میں لکھا جا رہا تھا کہ حکومتِ پاکستان کو اقبال منزل کو اپنی تحویل میں
لے کر اسے قومی یادگار بنا دینا چاہیئے۔ چنانچہ مئی ۱۹۷۱ء میں حکومتِ پاکستان کے محکمہ
آرکیالوجی نے اقبال منزل کو آپا جان کے ورثا سے خرید لیا۔ تب سے یہ مکان اُس محکمہ کی تحویل

میں ہے اُن دنوں میری والدہ صاحبہ فوت ہو چکی تھیں اور آبا جان کے ورثا میں سے کسی کی سکونت اقبال منزل میں نہ تھی۔ مکان خالی پڑا تھا۔ کچھ فرنیچر اور متفرق سامان مکان میں بند تھا۔ آرکیالوجی والوں نے خواہش کی کہ وہ سامان بھی محکمہ کو فروخت کر دیا جائے۔ ہم نے سامان فروخت کرنا مناسب نہ سمجھا اور بلا معاوضہ محکمہ کو پیش کر دیا۔ میں نے اُس سامان کی فہرست اور سامان کی بعض items کے متعلق وضاحتی نوٹ اپنے خط محررہ یکم جون ۱۹۷۱ء کے ساتھ ڈائریکٹر صاحب آرکیالوجی کو بھیج دی۔

اُس سامان میں بچے کا ایک جھولا (پنگوڑا) بھی تھا۔ یہ جھولا آپا جی نے میری بڑی بہن آپا اکبری کے پہلے بچے عبدالحق کی پیدائش پر اپنی جائے ملازمت سے بنوا کر بھجوایا تھا جو آپا جی کے بچوں کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ ڈائریکٹر آرکیالوجی کو جو سامان کی فہرست بھیجی گئی اس میں جھولے کے متعلق یہ وضاحت کر دی گئی۔ میں نے لکھا "یہ جھولا میری مرحومہ بہن کے بچوں کے لئے بنا تھا۔ اس کا علامہ اقبال سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ وضاحت اس لئے کی جا رہی ہے تاکہ اسے علامہ اقبال کے بچپن کا جھولا نہ سمجھ لیا جائے۔" (خط انگریزی میں تھا) اس وضاحت کے باوجود "اقبال منزل" میں علامہ اقبال کی جو یادگار اشیاء نمائش کے لئے رکھی ہیں ان میں یہ جھولا بھی شامل ہے اور اُس کو علامہ اقبال کے بچپن کا جھولا ظاہر کیا جا رہا ہے۔ اخبار جنگ نے ۱۹۸۲ء میں علامہ کے یومِ پیدائش پر جو اس اخبار کا اقبال ایڈیشن شائع کیا اُس میں اور یادگار اشیاء کی تصاویر کے ساتھ اس جھولے کی تصویر بھی شائع کی اور اُسے علامہ کے بچپن کا جھولا لکھا۔ نوادرات کے تاجروں کے متعلق تو سنا ہوا ہے کہ مشاہیرِ عالم کی فرضی یادگار بنا کر نوادرات جمع کرنے کے شائقین سے موٹی رقمیں وصول کرتے ہیں۔ یہاں تو چچا جان کی یادگار اشیاء کی فروخت کا سوال نہ تھا۔ پھر بچپن کا ایک فرضی جھولا بنانے کی کیا ضرورت تھی۔

خیر اب ایک سرکاری ادارے نے "بچپن کے جھولے" سے ابتداء تو کر دی ہے۔ دیکھیں یہ "بچپن کا کاروبار" کہاں تک چلتا ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است (اقبال)

دستاویز دست برداری

منکہ محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا لاہور ولد شیخ نور محمد مرحوم قوم سپرو (کشمیری پنڈت) سکنہ شہر سیالکوٹ حال بیرسٹر ایٹ لا لاہور کا ہوں۔ جو کہ والدم شیخ نور محمد مرحوم کی جائیداد غیر منقولہ واقعہ شہر سیالکوٹ حسب ذیل ہے۔

نمبر ۱۔ مکان سہ منزلہ تعمیر عمارت پختہ معہ تین دوکانات زیریں واقعہ بازار چوڑیگراں مالیتی تخمیناً بارہ ہزار روپیہ حدود اربعہ ذیل۔ شمال مکان مفتی میران بخش مرحوم جنوب مکان خواجہ حاکم دین میونسپل کمشنر و دکان معہ بالاخانہ ملکیتی برادرم شیخ عطا محمد گورنمنٹ پنشنر مشرق بازار چوڑیگراں مغرب زمین سفید و کوچہ شارع عام

نمبر ۲۔ مکان یک منزلہ مشتمل بر دو کوٹھری تعمیر عمارت کتہ متصل چاہ وہاب والا مالیتی آٹھ سو روپیہ حدود اربعہ حسب ذیل شمال مکان جان محمد مرحوم ککھی گر جنوب کوچہ شارع عام مشرق مکان جان محمد مرحوم ککھی گر مغرب کوچہ شارع عام

اب والدم مذکور وفات پا گئے ہیں اور مکان نمبر ۱، ۲ کے جائز وارث اور مالک مظہر اور برادرم شیخ عطا محمد ہوئے ہیں۔ چونکہ جائیداد متذکرہ کا زیادہ حصہ برادرم مذکور کی ذاتی کمائی سے خریدا ہوا ہے۔ نیز برادرم مذکور نے اپنی ذاتی کمائی سے اسے از سر نو تعمیر کیا

تھا اس لئے وہی اس کے زیادہ حصّہ کے حقدار ہیں۔ مزید برآں چونکہ ایک اور مکان جو والد مرحوم کی ملکیت تھا انہوں نے اپنی زندگی میں میرے پسر جاوید اقبال کو برضامندی برادرم شیخ عطا محمد ہبہ کر دیا تھا۔ لہٰذا میں بقائمی حواس خمسہ بلا جبر و اکراہ برضامندی خود مکانات نمبر ۱، ۲ کے نصف حصّہ سے جو بموجب شریعت و قانون میری ملکیت ہے دست بردار ہو کر اقرار کرتا ہوں کہ مکانات مذکورہ بالا نمبر ۱، ۲ سے میرا یا میری اولاد کا کسی قسم کا تعلق نہیں ہوگا اور ان کے واحد مالک و قابض برادرم شیخ عطا محمد ہوں گے لہٰذا یہ دستاویز بطور دست برداری حقوق بحق برادرم شیخ عطا محمد تحریر کر دیتا ہوں کہ سند رہے اور وقت پر کام آئے۔ ۲۷ نمبر ۳۰ء لاہور

العبـــــــــــــــــــد

محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا لاہور

ولد شیخ نور محمد مرحوم سکنہ سیالکوٹ

۱۔ یہ دستاویز ساڑھے سات روپیہ کے اسٹامپ پر بقلم چچا جان کی قلمی ہے۔

۲۔ دستاویز پر چودھری محمد حسین سپرنٹنڈنٹ دفتر ڈائریکٹر انفارمیشن بیرو پنجاب لاہور اور نواب دین بیرسٹرایٹ لا کے دستخط انگریزی میں بطور گواہ ثبت ہیں۔ موخر الذکر سیالکوٹ میں وکالت کرتے تھے۔ ہر دو اصحاب وفات پا چکے ہیں۔

۳۔ دستاویز ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو سردار رندھیر سنگھ سب رجسٹرار سیالکوٹ کے روبرو رجسٹری کے لئے منشی طاہر دین مختار خاص ڈاکٹر سر محمد اقبال نے پیش کی اور اسی روز رجسٹری ہوئی۔

باب ۱۰

علامّہ اقبال کی تاریخ پیدائش

"میں ۳ ذیقعد سنہ ۱۲۹۴ھ (سنہ ۱۸۷۶ء) کو سیالکوٹ۔ پنجاب (انڈیا) میں پیدا ہوا تھا۔"
یہ علامہ اقبال کے اُس مقالے کے خود نوشت تعارفی نوٹ[1] سے ایک اقتباس کا ترجمہ ہے جو انہوں نے قیامِ یورپ کے دوران سنہ ۱۹۰۷ء میں "ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا" کے موضوع پر لکھا جس پر جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے انہیں پی۔ ایچ ڈی (ڈاکٹر آف فلاسفی) کی ڈگری دی گئی۔ ۳ ذیقعد سنہ ۱۲۹۴ھ عیسوی تقویم کے حساب سے ۹ نومبر سنہ ۱۸۷۷ء تھا نہ کہ سنہ ۱۸۷۶ء۔ تعلیم کیلئے انگلستان جانے سے پہلے ہی علامہ اقبال سنہ ۱۸۷۶ء کو اپنا سال ولادت سمجھتے تھے۔ یہ اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ انگلستان پہنچنے پر سنہ ۱۹۰۵ء میں جب ٹرنٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا تو رجسٹر داخلہ کے سالِ ولادت کے خانہ میں اپنے قلم سے سنہ ۱۸۷۶ء لکھا[2]۔ اُسی سال ۶ نومبر کو بیرسٹری کے لئے لنکنز ان (LINCOLN'S INN) میں داخل ہوئے تو اپنی عمر ۲۹ سال لکھوائی جس کے رو سے سالِ ولادت وہی سنہ ۱۸۷۶ء نکلتا ہے۔ دو سال بعد سنہ ۱۹۰۷ء میں جرمنی کی میونخ یونیورسٹی کے لئے مقالہ لکھا۔ چونکہ یہ مقالہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے تھا۔ اس لئے اس کے تعارفی نوٹ میں پیدائش کی تاریخ و مہینہ بھی لکھنا چاہا جو انہیں معلوم نہ تھا۔ ظاہر ہے اس کے لئے اپنے والد کو لکھا ہوگا۔ میاں جی کو تو اُن کی تاریخ ولادت ہجری تقویم کے حساب سے ہی معلوم تھی یعنی ۳ ذیقعد سنہ ۱۲۹۴ھ جو انہوں نے بتلا دی۔ اُس وقت کنورشن ٹیبلز

(CONVERSION TABLES) سے عیسوی تقویم کے حساب سے تاریخ پیدائش معلوم کرا لیتے تو غلطی دور ہو جاتی ۔ معلوم ہوتا ہے یا تو یہ ٹیبلز آسانی سے دستیاب نہ ہو سکے یا انہوں نے سہل انگاری سے کام لیا اور صرف وہی غلط عیسوی سن ولادت جو اُن کے ذہن میں تھا یعنی ۱۸۷۶ء لکھنے پر اکتفا کیا ۔ انگلستان سے واپس آ کر بھی ۱۸۷۶ء کو ہی اپنا عیسوی سنِ ولادت سمجھتے اور بتاتے رہے ۔ ان کے متعلق شائع ہونے والی اکثر کتابوں اور مضامین میں یہی سال ولادت لکھا جاتا رہا ۔ ۱۹۳۱ء میں جب پاسپورٹ کے لئے درخواست دی تو اس میں بھی سن ولادت ۱۸۷۶ء ہی لکھا اور یہی سن ولادت ان کے پاسپورٹ میں درج ہوا ۔ علامہ کو اپنے عیسوی سنِ ولادت کے متعلق ایک سال کی غلطی کیسے لگی ۔ اس کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ انہوں نے ہجری تقویم کے مطابق تاریخ پیدائش جو انہیں اپنے والد سے معلوم ہوئی کی متبادل عیسوی تاریخ کنورشن ٹیبلز سے معلوم کرنے کی کبھی کوشش نہ کی ۔ پنجاب یونیورسٹی سے ۱۸۹۱ء میں مڈل کلاس پاس کرنے کی جو سند انہیں ملی اس میں مڈل پاس کرنے کے سال ان کی عمر ۱۵ سال لکھی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے ۱۸۹۱ء میں سے ۱۵ منہا کر کے اپنا عیسوی سن ولادت ۱۸۷۶ء سمجھ لیا ۔ درحقیقت مڈل کرنے کے سال ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ کے مطابق اُن کی عمر ۱۴ سال تھی ۔ اس طرح اس سہل انگاری کی وجہ سے وہ اپنا سن ولادت ۱۸۷۷ء کی بجائے ۱۸۷۶ء سمجھتے رہے چونکہ ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ کی متبادل عیسوی تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے[(۹)] ۔ اس لئے عیسوی تقویم کے مطابق یہی تاریخ اُن کی تاریخ پیدائش سمجھی جائے گی ۔ علامہ کی وفات کے بعد ان کی تاریخ ولادت کے متعلق جو اختلاف پیدا ہوا اس کی وجہ ایک بڑی غلط فہمی تھی جس کا بیان ذرا تفصیل سے کرنا ضروری ہے ۔

علامہ کی وفات کے بعد ابا جان ابھی لاہور میں ہی تھے کہ روزنامہ "انقلاب" لاہور کے رپورٹر نے اُن سے علامہ کی تاریخِ پیدائش کے متعلق دریافت کیا تو انہیں مہینہ دسمبر اور سال وہی ۱۸۷۶ء بتلایا گیا ۔ چنانچہ اپریل ۳۸ء کی ایک اشاعت میں جو ان کے مختصر سوانح حیات شائع کئے گئے اُن میں ابا جان کے حوالے سے ان کی پیدائش دسمبر ۱۸۷۶ء میں بیان کی گئی ۔ وفات کو دو ہفتے ہی گزرے ہوں گے کہ "انقلاب" کی ۷ مئی ۳۸ء کی اشاعت میں تاریخ پیدائش کے متعلق حسبِ ذیل نوٹ شائع ہوا ۔

"حضرت علامہ اقبال کے جو مختصر سوانح حیات" انقلاب "کی کسی گزشتہ اشاعت میں چھپے تھے ان میں شیخ عطا محمد صاحب برادر کلاں حضرت علامہ مرحوم کے تخمینی بیان کے مطابق حضرت مرحوم کی تاریخ پیدائش دسمبر ۱۸۷۶ء بتائی گئی تھی لیکن اب تحقیقی طور پہ یہ معلوم ہوچکا ہے کہ حضرت علامہ مرحوم ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے۔ اسلامی تاریخ ۲۲ ۲۴ ذی الحج ۱۲۸۹ھ تھی"۔ نوٹ میں یہ وضاحت نہ تھی کہ "انقلاب" کی بیان کردہ "تحقیق" کا ماخذ کیا ہے۔ نہ ہی بیان کردہ تاریخ کے درست ہونے کا کوئی ثبوت ہی نوٹ میں درج تھا۔ بعد میں جو حالات معلوم ہوئے اُن سے پتہ چلا کہ یہ نوٹ سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر پیدائش کے ایک اندراج پر انحصار کرتے ہوئے لکھا گیا جس کی نقل سیالکوٹ سے کسی "خدائی فوجدار" نے اخبار کو یہ کہہ کر بھیجی کہ یہ علامہ کی پیدائش کے اندراج کی نقل ہے۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت مولانا سالک اور مولانا مہر ایڈیٹران "انقلاب" نے علامہ کے مقالہ کا خود نوشت تعارفی نوٹ نہ دیکھا ہوگا ورنہ وہ علامہ اور اُن کے بڑے بھائی کی بیان کردہ تاریخ پیدائش سے مختلف تاریخ "انقلاب" میں شائع کرنے سے پیشتر ضرور کچھ مزید تحقیق کرتے اور رجسٹر پیدائش کے اندراج کی نقل جو موصول ہوئی اُس کو صحیفۂ آسمانی نہ سمجھ لیتے (اس اندراج کے متعلق آگے چل کر اظہار خیال کیا جائے گا) خیر روزناموں میں جو کچھ چھپتا ہے وہ کوئی ایسا دیرپا نہیں ہوتا لیکن علامہ کی وفات کے ۱۷ سال بعد ۱۹۵۵ء میں جب بزم اقبال لاہور نے مولانا سالک سے علامہ اقبال کے سوانح حیات "ذکر اقبال" کے نام سے لکھوائے تو اُس میں بھی مولانا نے بغیر مزید تحقیق اُسی اندراج رجسٹر پیدائش پر انحصار کرتے ہوئے ولادت کی تاریخ کا ذکر صرف ڈیڑھ سطر میں یہ لکھ کر ختم کر دیا کہ "علامہ کی ولادت ۲۴ ذوالحج ۱۲۸۹ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو ہوئی"۔ مزید غضب یہ کیا کہ فٹ نوٹ میں اس مبینہ تاریخ کے متعلق یہ لکھ دیا "تصدیق ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ بحوالہ رجسٹر پیدائش و اموات"۔ اس فٹ نوٹ نے یہ تاثر دیا گویا ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ نے تصدیق کیا ہے کہ علامہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے یا انہوں نے یہ تصدیق کیا ہے کہ یہ اندراج علامہ اقبال کی پیدائش کا اندراج ہے حالانکہ ۱۹۵۵ء کے صاحب ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ دونوں میں سے کسی ایک بات

کی تصدیق کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ تصدیق کر سکتے تھے کہ یہ اندراج رجسٹر پیدائش میں موجود ہے۔ مولانا سالک ایسے نامور ادیب اور صحافی "مستند تھا جن کا فرمایا ہوا"، کی تصنیف میں جو تاریخِ ولادت بیان کی گئی اور وہ بھی بہ "تصدیق ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ بہ حوالہ رجسٹر پیدائش" اُس کو اگر مستند سمجھ لیا گیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء میں علامہ کے بیسویں یومِ وفات پر پاکستان کے محکمۂ ڈاک نے جو یادگاری ٹکٹ جاری کیا اس پر یہی تاریخ پیدائش لکھی گئی۔ سیالکوٹ میں ہمارے جدی مکان "اقبال منزل" پر سنگ مرمر کی ایک یادگاری تختی ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ نے میری اجازت اور علم کے بغیر نصب کی۔ اس پر بھی یہی تاریخ پیدائش کندہ کی گئی۔ غرضیکہ یہ غلط تاریخ ولادت غلط العام ہو گئی۔ اگرچہ علامہ پر لکھنے والے بعض دانشور "ذکر اقبال" میں بیان کردہ تاریخ ولادت کے باوجود علامہ کے بیان کردہ سنِ ولادت (۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۵ء کو ہی ترجیح دیتے رہے ہیں[۵])

علامہ اقبال کی وفات کے کچھ دن بعد میں تو لاہور سے اپنی جائے ملازمت دہلی چلا گیا تھا اس لئے ۷ مئی ۱۹۳۸ء کے انقلاب میں جو تاریخ ولادت کی تصحیح شائع ہوئی وہ میری نظر سے نہیں گزری لیکن جب "ذکر اقبال" شائع ہوئی تو اُس میں تاریخ ولادت ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء پڑھ کر مجھے تعجب ہوا۔ اگرچہ اُس وقت تک علامہ کے مقالہ کا تعارفی نوٹ میں نے بھی نہیں دیکھا ہوا تھا لیکن مجھے یاد تھا کہ ابا جان نے انقلاب کے رپورٹر کو سن پیدائش ۱۸۷۶ء بتایا تھا اور یہی سن میں نے علامہ کی حیات میں اُن کے متعلق شائع ہونے والی اکثر کتابوں اور مضامین میں پڑھا ہوا تھا۔ ذکرِ اقبال میں شائع ہونے والی تاریخ پیدائش علامہ کے تعلیمی ریکارڈ اور میری تحقیق کے مطابق درست معلوم نہ ہوتی تھی۔ ایک دن ممتاز حسن مرحوم کے ہاں اس موضوع پر بات چھڑی تو میں نے اپنے شک کا اظہار کیا۔ اُن دنوں کرنل وحید الدین مرحوم جو اس مجلس میں موجود تھے "روزگار فقیر" (نقش ثانی) شائع کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ قرار پایا کہ تاریخ ولادت کے متعلق مزید تحقیق کی جائے اور کرنل صاحب اپنی کتاب میں اس موضوع پر لکھ کر غلط فہمی کا ازالہ کریں۔ یہ تحقیق ہو رہی تھی کہ خوش قسمتی سے ایک اہم دستاویزی ثبوت دستیاب ہو گیا۔ ایران کے متعلق علامہ کا مقالہ تو شائع

ہوچکا تھا لیکن اُس کے ساتھ ان کا خود نوشت تعارفی نوٹ شامل نہ تھا بلکہ ایسے کسی تعارفی نوٹ کا ۱۹۶۲ء تک یہاں پاکستان میں غالباً کسی کو علم بھی نہ تھا۔ اُن دنوں پاکستان میں ایک "پاکستان جرمن فورم" قائم تھا جس کے صدر ممتاز حسن مرحوم تھے۔ انہیں اس فورم کے لئے علامہ کے مقالہ کی اصل دستاویز کی فوٹو کاپی حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر ریچرڈ مونئنگ سے جو جرمنی کے ایک نیم سرکاری ادارے "انٹرنیشنز" (INTERNATIONS) کے سربراہ تھے اور جن سے ممتاز حسن کے مراسم تھے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر مونئنگ نے اصل مقالہ کی کئی فوٹو کاپیاں ممتاز حسن کو بھجوا دیں۔ چونکہ یہ اصل مقالہ کی فوٹو کاپیاں تھیں اسلئے خود نوشت تعارفی نوٹ بھی ساتھ شامل تھا جس میں علامہ نے ہجری تقویم کے مطابق اپنی ولادت کی تاریخ مہینہ اور سن ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ اور عیسوی تقویم کے مطابق سن ولادت ۱۸۷۶ء بیان کیا ہوا ہے۔ میرے مرحوم دوست حفیظ ہوشیارپوری تاریخ گوئی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے پاس کنورشن ٹیبلز قسم کی کوئی کتاب بھی تھی۔ اُن سے ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ کی متبادل تاریخ عیسوی تقویم سے نکلوائی گئی تو انہوں نے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بتلائی ہے یہ دستاویزی ثبوت جو بہت اہم تھا اور اس موضوع پر بعد تحقیق جو مواد جمع کیا گیا تھا کرنل صاحب کے حوالے کیا گیا۔ انہوں نے "روزگار فقیر" (نقش ثانی) میں جو ۱۹۶۳ء میں طبع ہوئی "تاریخ پیدائش۔ ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ" کے عنوان سے ایک باب میں یہ ثابت کیا کہ "ذکر اقبال" میں بیان کردہ تاریخ ولادت درست نہیں اور صحیح ولادت ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔

"روزگار فقیر" (نقش ثانی) کی اشاعت کے بعد ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو عام طور پر علامہ کی صحیح تاریخ ولادت تسلیم کر لیا گیا۔ اُن کے متعلق بعض لکھنے والوں نے تو اپنی اپنی کتابوں کی پہلی ایڈیشنوں میں دی ہوئی تاریخ ولادت کی تصحیح کرتے ہوئے نئی ایڈیشنوں میں ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو صحیح تاریخ ولادت بیان کیا۔ پاکستان کے محکمہ ڈاک نے جب ۲۱ اپریل ۱۹۶۷ء کو علامہ کے دو یادگاری ٹکٹ ڈاک جاری کئے تو اُن پر علامہ کا سن ولادت ۱۸۷۷ء دکھایا گیا۔ اس پر کسی اخبار میں ۱۹۵۸ء میں جاری ہونے والے یادگاری ٹکٹ کے حوالے سے جس پر تاریخ ولادت ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء لکھی تھی اعتراض کیا گیا کہ ولادت کا سن ۱۹۵۸ء والے یادگاری ٹکٹ ڈاک سے مختلف کیوں ہے۔ اس پر ۲۷ اپریل ۱۹۶۷ء کو ایک

سرکاری ہینڈ آؤٹ جاری کیا گیا جس کے اقتباس کا ترجمہ یہ ہے ۔ یادگاری ٹکٹوں پر ۱۸۷۷ء جو سن ولادت دکھایا گیا ہے اس کے صحیح ہونے کی تصدیق "اقبال اکادمی" اور "اقبال سرکل" کراچی نے کی ہے۔ کرنل وحیدالدین کی "اقبال ان پکچرز" میں بھی یہی سن ولادت لکھا ہے۔ چیکوسلواکیہ کی پراگ یونیورسٹی کے پروفیسر مارک بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ معترض اخبار نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ اُن میں جو سن ولادت دیا گیا ہے وہ درست نہیں۔"

یہاں یہ ذکر کر دیا جائے کہ ممتاز حسن مرحوم کی کوشش سے علامہ اقبال کے مقالہ کے تعارفی نوٹ کی نقل پاکستان میں تو ۱۹۶۲ء میں آئی جس کی بنا پر ۱۹۶۳ء میں "روزگار فقیر" میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا گیا لیکن اس سے بہت پہلے یورپ کے دو ایک محقق بھی مقالہ کے تعارفی نوٹ میں بیان کردہ تاریخ ولادت کی بنا پر ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو غلط اور ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو صحیح تاریخ ولادت قرار دے چکے تھے[۱۱]۔ خود ہمارے ملک میں بھی انگریزی روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے وفات کے دوسرے دن ۲۲ اپریل کی اشاعت میں علامہ کا سنِ ولادت ۱۸۷۷ء بیان کیا تھا[۱۲]۔

اپریل ۱۹۷۱ء میں میرے ایک ہمشیرہ زادے کی کتاب "اقبال درون خانہ" شائع ہوئی۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس عزیز نے بھی مولانا سالک کی طرح میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے رجسٹر پیدائش بابت ۱۸۷۳ء کے ایک اندراج پر انحصار کرتے ہوئے علامہ کی ولادت کی تاریخ ۲۲ فروری کی بجائے ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء بیان کی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے علامہ کی ولادت کی بیان کردہ دو مختلف تاریخوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا جو اُن دونوں سے مختلف ہے۔ مبینہ تین تاریخیں یہ ہیں۔ اوّل "ذکر اقبال" میں بیان کردہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء جو میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے رجسٹر پیدائش کے ایک اندراج پر مبنی ہے۔ دوسری "اقبال درون خانہ" میں بیان کردہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء جو رجسٹر پیدائش مذکورہ بالا کے ہی ایک اور اندراج پر مبنی ہے تیسری "روزگار فقیر" میں بیان کردہ ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ کی متبادل عیسوی تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء جو علامہ کے مقالہ کے تعارفی نوٹ پر مبنی ہے۔ ایک اور سن پیدائش ۱۲۹۲ھ بھی ہے جو علامہ کے لوحِ مزار پر کندہ ہے۔ یہ لوحِ مزار حکومت افغانستان نے کابل سے تیار کرا کر

بھیجی تھی۔ حکومتِ افغانستان نے یہ سنِ پیدائش کہاں سے لیا اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

تاریخ پیدائش کے متعلق متذکرہ بالا اختلاف کا جائزہ لے کر صحیح تاریخ پیدائش طے کرنے کے لئے بزمِ اقبال لاہور نے ۱۹۷۲ء کی آخری سہ ماہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی میں جسٹس رحمٰن مرحوم۔ مشہور دانشور اور محقق پروفیسر محمد عثمان جو اُن دنوں بزمِ اقبال لاہور کے معتمد تھے۔ مشہور دانشور اور ادیب ڈاکٹر وحید قریشی اور سید نذیر نیازی مرحوم جو اقبالیات کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے شامل تھے۔ شاید دو ایک اور حضرات بھی ہوں۔ موخر الذکر تین اصحاب نو سیالکوٹ بھی گئے اور اس سلسلہ میں وہاں بھی کچھ تحقیقات کی۔ بزمِ اقبال لاہور نے راقم الحروف کو بھی کمیٹی کے روبرو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی دعوت دی میں نے کمیٹی کے ارکان کے ملاحظہ کے لئے اس موضوع پر ایک مفصل تحریر لکھ کر دی اور کمیٹی کے دو تین اجلاسوں میں بھی شامل ہوا جن میں اِس موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔

ابھی یہ کمیٹی کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ بھارت کے اخبارات میں علامہ اقبال کی ولادت کی صد سالہ تقریب منانے کا چرچا ہوا۔ خبر تھی کہ یہ تقریب بھارت کی حکومت منائے گی اور تقریب کے انتظامات کے لئے جو کمیٹی مقرر ہوگی اندرا گاندھی وزیرِ اعظم اس کی صدر ہوں گی۔ اِن حالات میں حکومتِ پاکستان اور مسٹر بھٹو جو اُن دنوں وزیرِ اعظم تھے کیسے پیچھے رہ سکتے تھے چنانچہ پاکستان میں بھی علامہ کی پیدائش کی صد سالہ تقریب منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ پہلے حکومت کی سطح پر صحیح تاریخ پیدائش کا تعین کیا جائے۔ اس غرض کے لئے وزارتِ تعلیم نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے اراکین حسبِ ذیل تھے:۔

(۱) ڈاکٹر محمد اجمل سکریٹری وزارت تعلیم چیئرمین (۲) جسٹس (ریٹائرڈ) ایس اے رحمٰن مرحوم (۳) جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال (۴) پروفیسر حمید احمد خان مرحوم ناظم مجلس ترقیٔ ادب لاہور (۵) مسٹر ایس۔ اے واحد (مرحوم) وائس پریذیڈنٹ اقبال اکادمی کراچی (۶) پروفیسر محمد عثمان معتمد بزمِ اقبال لاہور (۷) ڈاکٹر سید عبداللہ (۸) پروفیسر ذوالفقار عظیم (مرحوم) (۹) ڈاکٹر وحید قریشی (۱۰) خواجہ عبدالرحیم (مرحوم) ایڈوکیٹ اور (۱۱) راقم الحروف اعجاز احمد۔ جنوری ۱۹۷۴ء

میں اس کمیٹی کے دو اجلاس ہوئے اور تیسرا اجلاس یکم فروری ۷۴ء کو ہوا۔ تینوں اجلاسوں میں تاریخ پیدائش کے موضوع پر سیر حاصل بحث ہوئی۔ بزمِ اقبال لاہور کی کمیٹی کے جو اراکین تحقیق کے لئے سیالکوٹ گئے تھے ان کی وہاں کی کارروائی بھی زیر بحث آئی۔ میں نے تاریخ پیدائش کے موضوع پر جو تحریر بزم اقبال کی کمیٹی کو دی تھی۔ اس پر بھی غور ہوا۔ یکم فروری ۷۴ء کو تیسرے اجلاس میں کمیٹی نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا۔

" یہ کمیٹی متعلقہ شواہد و قرائن کی چھان بین کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے پی۔ ایچ ڈی کے مقالے کے پیش لفظ میں جو تاریخ ولادت درج فرمائی ہے اُسے تسلیم کیا جائے۔ علامہ نے اپنی تاریخ ولادت تین ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ تحریر فرمائی ہے جو عیسوی سن کے اعتبار سے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہوتی ہے۔" متفقہ فیصلہ کی اس تحریر پر مندرجہ ذیل اراکین کمیٹی کے دستخط ثبت ہیں: محمد اجمل۔ ایس اے رحمٰن، سید عبدالواحد، محمد عثمان، وقار عظیم، حمید احمد خاں، وحید قریشی، سید عبداللہ، اعجاز احمد (جسٹس جاوید اقبال تو کمیٹی کے اجلاسوں میں شامل نہیں ہوئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہائیکورٹ کے ایک جج کی حیثیت میں ان کا کمیٹی کی کارروائی میں حصہ لینا مناسب نہیں۔ خواجہ عبدالرحیم یکم فروری والے اجلاس میں موجود نہ تھے) حکومتِ پاکستان نے کمیٹی کی اس متفقہ رپورٹ کی بنا پر ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو علامہ اقبال کی صحیح تاریخ ولادت قرار دے دیا۔ اسی تاریخ کے مطابق ولادت کی صد سالہ تقریبات منائی گئیں اور اب اسی تاریخ کو علامہ کا یوم ولادت منایا جاتا ہے۔ بھارت کی حکومت نے بھی اپنے ہاں ولادت کی صد سالہ تقریبات ۱۹۷۷ء میں منائیں [۳۱]

مناسب ہوگا اگر اس مرحلہ پر مرحوم پروفیسر حمید احمد خاں کی ایک خوبی کا ذکر کر دیا جائے۔ وہ مجلس ترقی ادب لاہور کے ناظم تھے۔ مجلس اُن دنوں ایک علمی مجلّہ "صحیفہ" شائع کرتی تھی جس کے مدیر اعزازی ڈاکٹر وحید قریشی تھے۔ مجلس نے "صحیفہ" کا اکتوبر ۷۳ء کا شمارہ (نمبر ۶۵) " اقبال نمبر" کے طور پر شائع کیا جس میں علامہ کے متعلق بڑے پایہ کے اور دلچسپ مضامین شائع ہوئے۔ ڈاکٹر محمد باقر نے جن کا ایک تحقیقی مضمون اس نمبر میں شامل تھا اس کی ایک کاپی مجھے عنایت فرمائی۔ رسالہ کے سرورق کے بعد ایک باریک کاغذ پر حسب

ذیل عبارت چھپی ہوئی تھی: "یہ کتاب علامہ اقبال کی ولادت کے جشن صد سالہ کی مناسبت سے شائع ہوئی۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۷۳ء" اس کا مطلب یہ تھا کہ مجلس ترقی ادب اور اُس کے ناظم نے ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو علامہ کی تاریخ ولادت تسلیم کر لیا ہے۔ جنوری ۱۹۷۴ء میں حکومت پاکستان نے جو کمیٹی صحیح تاریخ پیدائش کے تعین کے لئے تشکیل دی۔ پروفیسر حمید احمد خاں بھی اس میں شامل تھے۔ وہ کمیٹی کے پہلے اجلاس میں کسی وجہ سے شامل نہ ہو سکے لیکن دوسرے اجلاس میں جو ۲۵ جنوری ۱۹۷۴ء کو ہوا وہ شامل ہوئے اور کارروائی میں دلچسپی سے حصہ لیا۔ شروع میں وہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کی تائید کرتے رہے لیکن ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کے حق میں شواہد اور قرائن زور دار تھے۔ اجلاس شام تک جاری رہا۔ اجلاس کے اختتام پر انہوں نے فرمایا کہ وہ اس معاملہ پر مزید غور کریں گے۔ چنانچہ جاتے وقت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی تائید میں جو تحریری مواد تھا وہ ساتھ لے گئے۔ تیسرے اجلاس میں جو پنجم فروری ۱۹۷۴ء کو ہوا انہوں نے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی صحت کو تسلیم کر لیا۔ اجلاس کے آخر میں جو متفقہ فیصلہ تحریر میں آیا اس پر بغیر کسی ذہنی تحفظ (MENTAL RESERVATION) کے دستخط کئے، میرا خیال ہے اس فیصلہ کی وجہ سے پروفیسر صاحب نے "صحیفہ" اقبال نمبر کی اُن کاپیوں سے جو ابھی مجلس کے دفتر میں باقی تھیں وہ باریک کاغذ جس پر ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو تاریخ ولادت ظاہر کیا گیا تھا نکال دیا۔ کیونکہ کمیٹی کے فیصلہ کے بعد "صحیفہ" اقبال نمبر کی جو کاپی مجھے ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھیجی اُس میں وہ باریک کاغذ موجود نہیں۔ "صحیفہ" اقبال نمبر کی یہ دونوں کاپیاں میرے پاس محفوظ ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے اس موضوع پر مزید شواہد و قرائن معلوم ہونے پر جو پہلے اُن کے علم میں نہ تھے اپنی پہلی رائے کو ترک کر کے اپنی بڑائی کا اور صحیح محقق ہونے کا ثبوت دیا۔

مقالہ کے تعارفی نوٹ میں علامہ کی بیان کردہ تاریخ ولادت جو دراصل اُن کے والد کی بتلائی ہوئی تھی ایک وزن دار شہادت ہے لیکن کمیٹی نے صرف اسی شہادت کی بنا پر ہی ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کے حق میں فیصلہ نہیں کیا تھا بلکہ جیسا کہ کمیٹی کے فیصلہ میں لکھا ہے۔ متعلقہ شواہد اور قرائن کی چھان بین بھی کی گئی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِن شواہد اور

قرائن کو ریکارڈ کر دیا جائے۔

تعلیمی ریکارڈ: علامہ اقبال کو سب سے پہلی تعلیمی سند ۱۸۹۱ء میں مڈل کلاس کا امتحان پاس کرنے پر پنجاب یونیورسٹی سے ملی تھی اور صرف اسی سند میں اُن کی عمر کے متعلق اندراج ملتا ہے۔[۵] سند کی پشت پر DESCRIPTIVE ROLL کے عنوان کے تحت "امتحان پاس کرنے کے سال میں عمر" کے خانے میں "صرف پندرہ سال" لکھا ہے۔ یہ اندراج اُن کے اسکول کے ریکارڈ سے کیا گیا ہوگا۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ اسکول میں داخلہ کے وقت ولادت کی تاریخ مہینہ اور سال درج نہیں ہوا اور داخلہ کے وقت صرف عمر کا اندازہ لکھ دیا گیا۔ یہ اس وجہ سے ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اسکول میں داخلہ کے لیے مولانا میر حسن خود لے کر گئے تھے۔ انہیں ولادت کی تاریخ مہینہ سال معلوم نہ ہوگا اور انہوں نے اندازاً عمر لکھا دی ہوگی اس بات کا ناقابل تردید تحریری ثبوت موجود ہے کہ علامہ نے پہلی جماعت کا امتحان ۸ راپریل ۱۸۸۵ء کو پاس کیا لہٰذا وہ ۱۸۸۴ء میں پہلی جماعت میں داخل ہوئے جس وقت ان کی عمر ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کے حساب سے ۷ سال تھی۔ چونکہ قد کاٹھ اچھا تھا مولانا نے ۸ سال عمر لکھا دی ہوگی جس کی وجہ سے ۱۸۹۱ء میں سند میں عمر ۱۵ سال لکھی گئی۔ اگر ولادت ۱۸۷۳ء کی ہوتی تو ۱۸۹۱ء میں مڈل کلاس پاس کرتے وقت ان کی عمر ۱۸ سال ہوتی۔ سند میں عمر کا یہ اندراج ۱۸۷۳ء میں ولادت کی تردید کرتا ہے۔

(۲) تعلیمی ریکارڈ سے عمر کے متعلق دوسری شہادت پنجاب یونیورسٹی کے کیلنڈر برائے ۹۷-۱۸۹۶ء سے ملتی ہے۔ علامہ نے اس یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان ۱۸۹۶ء میں پاس کیا۔ اس کے متعلق یونیورسٹی کے کیلنڈر میں جو اندراج ہے اُس میں "درخواست داخلہ میں دی گئی عمر" کے خانہ میں ۱۹ سال لکھا ہے۔ درخواست ۹۶ء میں دی گئی۔ اس حساب سے بھی سال پیدائش ۱۸۷۷ء ہوا۔

افرادِ خاندان کی شہادت: (۱) علامہ نے جو تاریخ پیدائش اپنے مقالہ کے تعارفی نوٹ میں لکھی وہ انہیں اُن کے والد نے ہی بتلائی ہوگی۔ لہٰذا اُن کے والد کے بیان کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ ہے

(۲) علامہ کی وفات کے بعد انقلاب کے رپورٹر کے سوال پر اُن کے بڑے بھائی نے اُن کا سنِ ولادت ۱۸۷۶ء بتایا جو علامہ بجائے ۱۸۷۷ء اپنا سال ولادت سمجھتے رہے۔

(۳) بزم اقبال لاہور نے تاریخ پیدائش کے تعین کے لئے جو سب کمیٹی تشکیل دی۔ اس کے ایک رکن سید نذیر نیازی مرحوم تھے جن کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ آفتاب اقبال مرحوم سے جو علامہ کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے علامہ کی تاریخ پیدائش کے متعلق استفسار کریں۔ آفتاب اقبال کراچی میں مقیم تھے۔ نیازی صاحب نے یہ کام اپنے دوست محمد منظفر سابق چیئرمین بروک بانڈ کمپنی جو کراچی میں مقیم تھے کے سپرد کیا۔ نیازی صاحب اپنے خط محررہ ۲۳ جنوری ۱۹۷۴ء بنام پروفیسر محمد عثمان معتمد اعزازی بزم اقبال لاہور لکھتے ہیں "منظفر صاحب آفتاب صاحب سے ملے تو انہوں نے کہا میرا سال ولادت ۱۸۹۸ء ہے۔ اس وقت حضرت علامہ کی عمر اکیس سال تھی۔ اگر آفتاب صاحب کا بیان صحیح ہے اور ان کی یادداشت نے غلطی نہیں کی تو ماننا پڑے گا کہ حضرت علامہ کا سال ولادت ۱۸۷۷ء ہے"۔ یہ خط بزم اقبال کے ریکارڈ میں موجود ہونا چاہیئے فوٹو کاپی میرے پاس محفوظ ہے۔

(۴) ۱۹۶۳ء میں شائع ہونے والے "روزگار فقیر" (نقش ثانی) میں راقم الحروف کی روایت بیان کی گئی ہے کہ علامہ کی وفات کے بعد جولائی ۱۹۳۸ء میں میرے ابا جان نے اپنے ایک خط میں علامہ کی پہلی بیوی (والدہ آفتاب اقبال) کے متعلق لکھا کہ وہ علامہ سے دو تین سال بڑی تھیں۔ اُن دنوں ابا جان اصرار کر رہے تھے کہ جو ماہانہ رقم علامہ اپنی زندگی میں اپنی پہلی بیوی کو دیا کرتے تھے نابالغان کے اولیاء کو اُس کی ادائیگی جاری رکھنی چاہیئے۔ میں بچے از اولیاء تھا۔ میرے دوسرے دو رفقائے کار اس ادائیگی کے فیصلہ میں شامل تھے۔ ابا جان نے اس سلسلہ میں لکھا تھا کہ علامہ کی پہلی بیوی جو زندہ ہیں وہ علامہ سے دو تین سال بڑی تھیں اس لئے وہ اور کتنے سال زندہ رہیں گی۔ لہٰذا اولیاء کو چاہیئے کہ ان کے ماہانہ کی ادائیگی جاری رکھیں۔ حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی کے ایک اجلاس میں جسٹس رحمٰن مرحوم کی تحریک پر کمیٹی نے وزارت متعلقہ سے درخواست کی کہ وہ ڈپٹی کمشنر گجرات سے ڈاکٹر عطا محمد (علامہ اقبال کے خسر) کی ان صاحبزادیوں کی تاریخ ہائے ولادت کی نقول منگوائیں جو ۱۸۷۰ء اور

۱۸۸۰ء کے درمیان پیدا ہوئیں تاکہ علامہ کی پہلی بیوی کی تاریخ ولادت کا تعین ہو سکے اور اس کی نسبت سے علامہ کی تاریخ یا سال ولادت کا۔ رجسٹر پیدائش سے دو صاحبزادیوں کے اندراجات پیدائش کی نقول موصول ہوئیں۔ ایک صاحبزادی ۲۲ مارچ ۱۸۷۴ء کو اور دوسری ۲۰ اپریل ۱۸۷۸ء کو پیدا ہوئی تھیں۔ علامہ کی پہلی بیوی ڈاکٹر عطا محمد صاحب کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں یعنی وہ جو ۲۲ مارچ ۱۸۷۴ء کو پیدا ہوئیں۔ اس سے بھی علامہ جو بقول اُن کے بڑے بھائی کے پہلی بیوی سے دو تین سال چھوٹے تھے کا سن ولادت ۱۸۷۷ء ہی نکلتا ہے۔ اندراجات کی یہ نقول وزارت متعلقہ کی فائل پر ہوں گی۔ میرے ریکارڈ میں ان کی فوٹو کاپیاں محفوظ ہیں۔

۵۔ ۱۹۶۳ء میں شائع ہونے والے "روزگار فقیر" میں راقم الحروف کی یہ روایت بھی بیان کی گئی ہے کہ علامہ کی پیدائش جمعہ کے دن ہوئی تھی۔ یہ بات راقم الحروف نے اپنی ایک پھوپھی سے سنی جنہوں نے بے جی یعنی ہماری دادی صاحبہ سے سنی ہوئی تھی۔ یہ روایت میں نے اُس تحریر میں بھی دہرائی ہے جو میں نے اس موضوع پر بزم اقبال کی مقرر کردہ کمیٹی کو دی۔ جوہر تقویم مرتبہ ضیاء الدین لاہوری (۱۹۸۳) سے ثابت ہوتا ہے کہ ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ جمعہ کا ہی دن تھا اور "ذکر اقبال" میں بیان کردہ تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء جمعہ کا دن نہ تھا بلکہ ہفتہ تھا۔ اسی طرح "اقبال درون خانہ" میں بیان کردہ تاریخ پیدائش یعنی ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو بھی جمعہ کا دن نہ تھا بلکہ سوموار تھا۔ اس سے بھی ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ کے صحیح تاریخ پیدائش ہونے کی تائید ہوتی ہے۔[15]

حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی کے اجلاسوں میں سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر پیدائش کے ان اندراجات کا بھی جائزہ لیا گیا جن کی بنا پر علامہ کی "تاریخ پیدائش" "ذکر اقبال" میں ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء اور "اقبال درون خانہ" میں ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء بیان کی گئی ہے۔ موخر الذکر کتاب میں مندکرہ بالا دو تاریخوں کے اندراجات کے علاوہ اپنے بیان کی تائید میں دو اور تاریخوں کے اندراجات پر بھی انحصار کیا گیا ہے۔ ان چاروں اندراجات مندرجہ "اقبال درون خانہ" کو ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے تاکہ بات بخوبی سمجھ میں آ جائے:

نمبر	تاریخ پیدائش	لڑکا/لڑکی	ولدیت	محلہ	پیشہ۔ قوم و مذہب	اطلاع کنندہ
۴۳۳	۱۶ر ستمبر ۱۸۷۰ء	لڑکی	نتھو	چوڑیگراں	کشمیری	رفیق
۱۴۰	۲۲ر فروری ۱۸۷۳ء	لڑکا	نتھو	کشمیر باب	کشمیری	نتھو
۱۰۴۸	۲۹ر دسمبر ۱۸۷۳ء	لڑکا	نتھو	چوڑی گراں	مسلمان خیاط	علی محمد ولد غلام محی الدین
۹۶۲	۱۴ر نومبر ۱۸۷۶ء	لڑکی	نتھو ولد محمد رفیع	کشمیر باب	مسلمان کشمیری	نتھو

ان چاروں اندراجات کے ولدیت کے خانہ میں تین میں نتھو اور چوتھے میں نتھو ولد محمد رفیع درج ہے۔ "اقبال درونِ خانہ" میں ان چاروں اندراجات کو علامہؒ کے والد کے ہاں دو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہونے کے اندراجات بتلایا گیا ہے۔ علامہؒ کے والد کا نام نور محمد اور عرف نتھو تھا۔ اس عرف کی وجہ تسمیہ اس کتاب کے باب "علامہؒ اقبال کے والد" میں بیان کی گئی ہے۔ شہر سیالکوٹ میں صرف علامہؒ کے والد کا ہی عرف نتھو نہ تھا۔ اور بھی کئی یہ عرف رکھتے تھے۔ حکومتی کمیٹی کے رکن پروفیسر محمد عثمان بزمِ اقبال لاہور کی اس کمیٹی کے بھی رکن تھے جو تحقیق کے لئے سیالکوٹ گئی تھی۔ وہ ٹھہرے محقق، معلوم ہوتا ہے سیالکوٹ میں انہوں نے میونسپل کمیٹی کے رجسٹر پیدائش کا ایک محقق کی نظر سے جائزہ لیا۔ وہ اپنے نوٹ میں جو کمیٹی کے اجلاس میں پیش کیا گیا لکھتے ہیں :۔ "رجسٹر پیدائش سے ثابت ہے کہ کم از کم پچیس تیس نتھو سیالکوٹ کے مختلف محلوں میں اس زمانے میں آباد تھے۔" اس سے ان کا یہ استدلال تھا کہ ولدیت کے خانہ میں اگر نتھو لکھا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہو گا کہ وہ علامہؒ کے والد ہی ہیں۔ اندراج کے باقی خانوں کو بھی دیکھنا ہو گا تا تشخص ہو سکے کہ یہ کون نتھو ہیں۔ اس نوٹ میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے :۔

موقعہ پر تحقیق کے بعد اس امر میں کوئی شک و شبہہ باقی نہیں رہتا کہ محلہ چوڑیگراں اور محلہ کشمیر باب دو واضح طور پر الگ الگ محلے تھے اور علامہؒ اقبال کا آبائی مکان بلا اشتباہ

محلہ چوڑی گراں میں واقع ہے۔ علامہ اقبال کا آبائی مکان چوڑی گراں کے محلے میں ایک ایسے محل وقوع پر ہے کہ اسے سیالکوٹ کا کوئی بے علم شخص بھی محلہ کشمیریاں نہیں بتائے گا۔" انہوں نے میونسپل کمیٹی سیالکوٹ سے مختلف محلوں کا ایک نقشہ بھی تیار کرایا ہوا تھا جو کمیٹی کے ملاحظہ کے لئے پیش کیا گیا۔ ان تصریحات کی روشنی میں پروفیسر محمد عثمان نے "اقبال درون خانہ" میں مندرجہ چاروں اندراجات کے متعلق یہ رائے ظاہر کی کہ ۲؍ ستمبر ۱۸۷۰ء کا اندراج تو یقیناً علامہ کے والد کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہونے کا اندراج ہے۔ کیونکہ محلہ بھی چوڑی گراں درج ہے اور قوم بھی کشمیری اور اطلاع کنندہ رفیق علامہ کے دادا تھے لیکن ۲۲؍ فروری ۱۸۷۳ء والا اندراج کسی ایسے نتھو کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہونے کے متعلق ہے جو محلہ کشمیریاں میں سکونت پذیر تھا۔ اسی طرح ۲۹؍ دسمبر ۱۸۷۳ء والا اندراج اُس نتھو کے متعلق ہے جس کی سکونت تو محلہ چوڑی گراں میں تھی لیکن وہ کشمیری نہ تھا بلکہ خیاط برادری سے تھا جو سیالکوٹ کی ایک معروف برادری ہے۔ ۱۴؍ نومبر ۱۸۷۶ء والا اندراج بھی محلہ کشمیریاں میں رہنے والے نتھو کے متعلق ہے جس کے والد کا نام محمد رفیع تھا۔ علامہ کے والد کا نام محمد رفیق تھا اور "اقبال درون خانہ" میں بیان کردہ اس مفروضے کو قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ محمد رفیع سہواً لکھا گیا۔ غرضیکہ پروفیسر عثمان کی رائے میں ان چاروں اندراجات میں سے صرف ۲؍ ستمبر ۱۸۷۰ء والا اندراج علامہ کے والد کے متعلق ہے باقی تینوں ان کے متعلق معلوم نہیں ہوتے۔ نتھو عرف کے مختلف اشخاص کے اندراجات کو علامہ کے والد کے متعلق ظاہر کر کے "کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا" والا معاملہ کیا گیا ہے۔ کمیٹی نے پروفیسر محمد عثمان کی رائے سے اتفاق کیا۔ یہاں مجھے یہ اعتراف کرنا چاہیئے کہ اندراجات رجسٹر پیدائش کی گتھی کو سلجھانے کا سہرہ عثمان صاحب کے سر ہے۔

تاریخ پیدائش کا فیصلہ حکومتی سطح پر ہونے کے بعد عام طور پر اب ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو علامہ کی صحیح تاریخ پیدائش تسلیم کیا جاتا ہے لیکن "میں نہ مانوں" والا عنصر ہر معاشرہ میں ہوتا ہے اسلئے دو ایک "میں نہ مانوں" والے "میں نہ مانوں" کی رٹ لگائے جا رہے ہیں۔

لے تھاٹس اینڈ ریفلیکشنز آف اقبال ۔ سید عبدالواحد، صفحہ ۲۸

لے روزنامہ جنگ کراچی، جشن صد سالہ اقبال ایڈیشن نومبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۱۰

۱۹لے جوہر تقویم ۔ ضیاء الدین لاہوری (۱۹۸۳)

ٓلے (الف) اے وائس فرام دی ایسٹ (انگریزی) مصنفہ نواب سر ذوالفقار علی خاں جو علامہؒ کے گہرے دوست تھے۔ شائع شدہ ۱۹۲۲ء (ب) نیرنگ خیال اقبال نمبر ۱۹۳۲ء میں محمد دین فوقؔ کا علامہ اقبال پر مضمون ۔ یہی مضمون پہلے فوق نے مشاہیر کشمیر میں شائع کیا تھا جس میں سن پیدائش ۱۸۷۵ء لکھا تھا ۔ علامہ سے گہرے مراسم تھے ۔ علامہ نے سن پیدائش کی صحت کی تو نیرنگ خیال میں اُسی مضمون میں سن پیدائش کی تصحیح کرتے ہوئے ۱۸۷۶ء لکھا (ج) اسی نیرنگ خیال اقبال نمبر ۱۹۳۲ء میں ملک راج آنند کا علامہؒ پر مضمون (د) شارٹ ہسٹری آف اردو لٹریچر مصنف ڈاکٹر سید اعجاز حسین شائع شدہ ۱۹۳۴ء (ہ) تاریخ شعرائے پنجاب، نسیم رضوانی ۱۹۳۷ء

ٓلے روزگار فقیر (نقش ثانی) صفحہ ۲۳۲ کے مقابل پاسپورٹ کے متعلقہ صفحہ کا فوٹو

ٓلے اقبال ان پکچرز کرنل وحید الدین، سند مذکورہ کی فوٹو۔ نیز بزم اقبال کے سہ ماہی رسالہ "اقبال"، بابت جنوری ۱۹۷۳ء میں سند کی فوٹو اصل سند اب نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے ۔

ٓلے بزم اقبال لاہور کے سہ ماہی رسالہ "اقبال" بابت جنوری ۱۹۷۳ء میں اس نوٹ کا انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے ۔

ٓلے "ذکر اقبال"، مصنفہ مولانا سالک صفحہ ۱۰

ٓلے (الف) شاعر مشرق، محمد عبدالسلام (۱۹۵۹)۔ آئینہ ادب چوک مینار، انار کلی لاہور ۔ (ب) "نقوش" مکاتیب نمبر (جنوری فروری ۱۹۵۹) (ج) "نقوش" لاہور نمبر (فروری ۱۹۶۲ء) (د) دائرۃ المعارف (جلد ۳) (اگست ۱۹۵۶ء) (ہ) مرقع شعرائے اردو مدیرہ حسن نورانی (۱۹۵۷)

ٓلے روزگار فقیر (نقش ثانی) ۱۹۶۳ ۔ صفحہ ۲۲۹

نلے (الف) سیرت اقبال ۔ محمد طاہر فاروقی (۱۹۳۹ء و ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۹ء کی ایڈیشنوں میں تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء لکھی تھی ۔ چوتھے ایڈیشن میں جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا اس کی تصحیح کر کے ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ء (۹ نومبر ۱۸۷۷ء) کی گئی (ب) اقبال ہنر آرٹ اینڈ تھاٹ (انگریزی) سید عبدالواحد (۱۹۵۹) میں تاریخ

پیدائش ۲۲ر فروری ۱۸۷۳ء لکھی تھی پھر اپنی تصنیف تھاٹس اینڈ ریفلیکشنز آف اقبال (۱۹۶۴) میں تصحیح کر کے ۳ر ذیقعد ۱۲۹۴ھ مطابق ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء لکھی گئی (ج) بابو رام سکسینہ کی انگریزی کتاب ہسٹری آف اردو لٹریچر کے اردو ترجمہ "تاریخ ادب اردو" ترجمہ عسکری میں پہلے سن پیدائش ۱۸۷۵ء لکھا تھا۔ جب ۱۹۶۵ء میں اسے دلی سنز کرشن نگر لاہور نے مرتضیٰ حسین فاضل سے نظر ثانی کرا کر شائع کیا تو تاریخ ولادت ۳ر ذیقعد ۱۲۹۴ھ لکھی (د) "نقوش" ماہنامہ نے اپنے غزل نمبر (۱۹۵۴) میں سن ولادت ۱۸۷۶ء لکھا۔ پھر مکاتیب نمبر (۱۹۵۷) اور طنز و مزاح نمبر (۱۹۵۹) میں سن ولادت ۱۸۷۵ء لکھا۔ آخر کار آپ بیتی نمبر (۱۹۶۴) میں ۳ر ذیقعد ۱۲۹۴ھ اختیار کیا۔ (ہ) انسائیکلوپیڈیا برطانیہ جلد ۱۲ (۱۹۶۸) میں ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء تاریخ پیدائش اختیار کی۔

[۱۱] (الف) جے۔ سی۔ رائے۔ بون مغربی جرمنی (۱۹۵۷)

(ب) جان مارک۔ اقبال کی تاریخ پیدائش (۱۹۵۸ء)

(ج) جان رائی پکا صفحہ ۳۱ (1956) "DEJING PER'S LEA TADZICHE LITERATURY"

(د) جے۔ ڈبلیو فلک۔ وزبیڈن (۱۹۵۴)

[۱۲] اس نوٹ کا اردو ترجمہ حمید نظامی کا کیا ہوا "ہمدرد صحت ڈائجسٹ" بابت اپریل ۶۸ء میں شائع ہوا ہے۔

[۱۳] ان تقریبات کے سلسلہ میں حکومتِ ہند کی وزارتِ اطلاعات و نشریات نے ایک "مرقع اقبال" شائع کیا جسے مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد نے مرتب کیا۔ مرقع میں جو تصاویر شامل ہیں ان کے جمع کرنے میں مرتب نے خاصی محنت کی ہوگی اور مرقع کی دیدہ زیب طباعت پر کافی خرچ ہوا ہوگا۔ جگن ناتھ آزاد کو علامہ اقبال سے گہری عقیدت ہے جو انہیں اپنے والد عظیم شاعر تلوک چند محروم سے ورثہ میں ملی ہے۔ اس لئے مرقع کے مرتب کرنے میں انہوں نے جو محنت کی وہ LABOUR OF LOVE تھی۔ ہندو پاکستان کے درمیان آنے جانے اور رسل و رسائل کی جو پابندیاں ہیں شاید ان کی وجہ سے مرتب مرقع میں دیئے گئے "شجرہ نسب اور توقیت اقبال" کی اچھی طرح چھان بین نہ کر سکے۔ اس لئے ان میں کچھ غلطیاں در آئی ہیں۔ امید ہے اگر مرقع کی دوبارہ اشاعت کی نوبت آئی تو اس میں ان غلطیوں کی صحت کر دی جائے گی۔

[۱۴] ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ گورنمنٹ ڈگری کالج پسرور میں اردو کے لیکچرار ہیں۔ بقول ان کے "تحقیق و جستجو اُن کا بہترین مشغلہ ہے۔ خصوصًا ایسے موضوعات کی تحقیق جس پر

کسی شخص نے قلم نہ اٹھایا ہو۔" عرصہ سے وہ علامہ اقبال پر بھی تحقیق کر رہے ہیں۔ انہوں نے رائے گوپال سنگھ انسپکٹر آف سکولز لاہور سرکل کی ۸ ر اپریل ۱۸۸۵ء کی رپورٹ ڈھونڈ نکالی ہے جو سکاچ مشن سکول سیالکوٹ کے پرائمری حصّہ کے امتحان کے متعلق ہے جو انہوں نے ۱۸۸۵ء میں ماہ اپریل کی ابتدائی تین تاریخوں میں لیا۔ جو طلبا لوئر پرائمری (پہلی جماعت) کے امتحان میں کامیاب ہوئے ان میں سرِ فہرست علامہ کا نام ہے۔ اس تحقیق کے متعلق ان کا مقالہ "اقبال کی پہلی جماعت کا نتیجہ" کے عنوان سے اقبال اکادمی لاہور کے "اقبال ریویو" بابت اگست ۱۹۸۳ء میں شائع ہو گیا ہے۔ پچھلے دنوں جنگ کراچی (۱۵؍۲؍۸۴) میں "اقبال درونِ خانہ" کے مصنف کے والد محترم کا ایک مضمون ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی تردید میں شائع ہوا تھا جس میں دکھایا گیا تھا کہ علامہ اپریل ۱۸۸۵ء میں چوتھی جماعت میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر سید سلطان محمود کا مقالہ اس مفروضے کی تردید کرتا ہے کیونکہ رائے گوپال سنگھ کی رپورٹ کے مطابق ۸ اپریل ۱۸۸۵ء کو علامہ نے پہلی جماعت پاس کی تھی۔

۱۵ علامہ اقبال کے جمعہ کے دن پیدا ہونے کی روایت کی صحت "اقبال درونِ خانہ" کے مصنف کے والد محترم کو بھی تسلیم ہے۔ کتاب مذکورہ بالا میں ۲۹ ر دسمبر ۱۸۷۳ء کو تاریخ پیدائش بیان کرتے وقت یہ روایت شاید ذہن میں نہ تھی۔ گیارہ سال بعد اب انہوں نے اس موضوع پر اپنے ایک مضمون میں جو جنگ کراچی کی ۱۵ جنوری ۸۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ تاریخ پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کی بجائے ۲۶ ر دسمبر ۱۸۷۳ء بیان کی ہے کیونکہ وہ جمعہ کا دن تھا۔ اس تبدیلی پر رائے زنی کرنے کی ضرورت نہیں۔ قارئین خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔

۱۶ میرے چھوٹے بھائی شیخ مختار احمد نے بزمِ اقبال کو تحریری بیان دیا کہ سیالکوٹ کی خیاط برادری کے ایک نتھو محلہ چوڑی گراں میں رہتے تھے جن کا پوتا ان کا ہم جماعت تھا۔ ان کا اور راقم الحروف کا بھی یہ بیان ہے کہ حاجی محمد ولد غلام محی الدین جو اس پیدائش کے اطلاع کنندہ ہیں نہ ہمارے رشتہ داروں میں ہیں نہ ہمارے خاندان سے تعلق رکھنے والوں میں نہ کبھی ایسے نام کے کسی شخص کا ہم نے نام ہی سُنا۔ مزید برآں "اقبال درونِ خانہ" کے مصنف کے والد محترم نے اب اپنے ایک مضمون (جنگ کراچی ۱۵؍۲؍۸۴) میں تاریخ پیدائش ۲۹ ر دسمبر ۱۸۷۳ء کی بجائے ۲۶ ر دسمبر ۱۸۷۳ء بیان کی ہے۔

باب ۱۱

علامہ اقبال کی شادیاں

چچا جان نے تین شادیاں کیں۔ اُن کی پہلی شادی شروع ۱۸۹۳ء میں ہوئی جب ان کی عمر ابھی پورے سولہ سال بھی نہ تھی۔ انہوں نے دسویں جماعت کا امتحان دیا ہوا تھا۔ اُس میں پاس ہونے کی خبر برات والے دن ملی۔ یہ شادی گجرات شہر میں ایک خاندان میں ہوئی جن کی مالی حالت اُن دنوں ہم سے کہیں بہتر تھی۔ اس شادی سے ۱۸۹۶ء میں ایک دختر (معراج بیگم) پیدا ہوئی اور اس کی پیدائش کے کوئی دو یا اڑھائی سال بعد ایک لڑکا (بھائی آفتاب) وسط ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوا۔ یہ شادی کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ زوجین کے مزاجوں میں ہم آہنگی نہ تھی۔ مزاجوں کا اختلاف دن بدن بڑھتا گیا۔ شادی کے دو سال بعد سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد چچا جان مزید تعلیم کے لئے لاہور چلے گئے۔ چار سال گورنمنٹ کالج میں زیر تعلیم رہ کر ۱۸۹۹ء میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ ان چار سالوں میں اُن کا قیام گورنمنٹ کالج کے ہاسٹل میں تھا۔ اس لئے گجرات والی چچی جان کے لاہور جا کر رہنے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں ایم اے پاس کرنے کے بعد انہیں پہلے اورنٹیل کالج لاہور میں اور کچھ مدت بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں ملازمت مل گئی، جس پر وہ ۱۹۰۵ء میں مزید تعلیم کے لئے انگلستان جانے تک فائز رہے۔ اس پانچ چھ سال

کے عرصہ میں اُن کا قیام بھاٹی دروازہ کے اندر ایک مختصر مکان میں رہا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس عرصہ میں بھی چچی جان لاہور جاکر ان کے ساتھ نہیں رہیں۔ ان کا قیام کبھی سیالکوٹ اپنے سسرال میں اور زیادہ تر اپنے میکے میں اپنے والد کی جائے ملازمت پر رہتا۔ ۱۹۰۸ء کے وسط میں چچا جان انگلستان سے واپس آئے اور لاہور ہائیکورٹ میں پریکٹس شروع کی۔ اُن ایام میں بھی وہ لاہور میں تنہا رہتے تھے۔ چونکہ بیگم سے تعلقات خوش گوار نہ تھے اس لئے اپنے والدین اور بڑے بھائی سے دوسری شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میاں جی اور آبا جی نے بہت کوشش کی کہ دوسری شادی کی نوبت نہ آئے اور میاں بیوی میں موافقت ہو جائے لیکن معلوم ہوتا ہے اختلافات گہرے تھے اس لئے مفاہمت کی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ یہ ۱۹۰۹ء کی بات ہے جیسا کہ چچا جان کے عطیہ بیگم کے نام کچھ خطوط سے ظاہر ہوتا ہے وہ اُن دنوں بڑے دل گرفتہ اور زندگی سے بیزار تھے۔ یہ خطوط ہیجانی کے زیر اثر مکتوب علیہ کو ہمدرد جانتے ہوئے صرف اپنے دردِ دل کے اظہار کے لئے لکھے گئے تھے۔ عطیہ بیگم کا انہیں شائع کر دینا اور پھر چچا جان پر لکھنے والوں کا اُن خطوط کے مضمون کو اچھالنا مناسب نہ تھا۔ چونکہ چچا جان کو دوسری شادی پر اصرار رہا اس لئے اُن کے بزرگوں کو آخر کار متفق ہونا پڑا۔

میاں جی کے ذکر میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ جب کسی امر کی تاکید کرتے یا کسی بات سے منع کرتے تو اکثر قرآنِ کریم یا اسوۂ رسولِ کریمؐ کے حوالے سے کرتے۔ چچا جان کے ساتھ یہ تکنیک خصوصیت سے استعمال کی جاتی اور وہ اپنی بات پر کتنے ہی اڑے ہوئے ہوتے۔ قرآنِ کریم اور اسوۂ رسولِ کریمؐ کی سند سنتے ہی اپنی بات چھوڑ دیتے۔ اس کی دو ایک مثالیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ میاں جی کی اس خصوصیت کا ذکر میرے حوالے سے روزگار فقیر حصہ دوم جو ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا میں بھی کیا گیا ہے۔ ہماری پھوپھی کریم بی بی نے روزگار فقیر میں یہ ذکر پڑھا تو ایک دن مجھے بتلایا کہ تمھارے چچا جان نے بھی میاں جی سے اپنی دوسری شادی کی تجویز منوانے کے لئے یہی حربہ استعمال کیا تھا۔ انہوں نے بتلایا کہ بے جی تو بھائی صاحب (علامہ اقبال) کی بے کیف زندگی کو دیکھتے ہوئے اُن کے دوسری شادی کر لینے پر رضامند

ہو چکی تھیں لیکن میاں جی ابھی حیص بیص میں تھے۔ ایک دن میاں جی اور بھائی صاحب میں کچھ علمی گفتگو ہو رہی تھی۔ بھائی صاحب نے میاں جی سے دریافت کیا کہ قرآن کریم کی آیت" هُوَ الَّذِی خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا " میں" نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ "سے کیا مراد ہے۔ میاں جی سمجھ گئے کہ بھائی صاحب " نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ "کا مطلب نہیں پوچھ رہے بلکہ اپنی بے سکون زندگی کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ میاں جی نے خلاف معمول سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہے۔ دوسرے دن بے جی سے دریافت کیا" اقبال کے لئے کوئی رشتہ تلاش کیا؟" انہوں نے جواب دیا "آپ تو منہ میں گھنگنیاں بھرے بیٹھے ہیں۔ نہ ہاں کہتے ہیں نہ ناں۔ میں رشتہ کیسے تلاش کروں"
میاں جی نے کہا" اب تلاش کر ہی لو۔"

میاں جی رضامند ہو گئے تو رشتہ کے لئے تلاش شروع ہوئی۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے بے جی چاہتی تھیں کہ رشتہ ایسے گھرانے میں ہو جو ہماری طرح متوسط حال ہو۔ متمول نہ ہو اور لڑکی کی عمر بیس سال سے کم نہ ہو۔ چچا جان کے دوست شیخ گلاب دین وکیل نے جو ہمارے شہر کے رہنے والے تھے اور لاہور میں وکالت کرتے تھے۔ موچی دروازہ لاہور کے ایک کشمیری خاندان میں ایک ایسے رشتہ کی نشان دہی کی۔ ان کے جاننے والے ان کے ایک ہمنام کسی دفتر میں ملازم تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کے ایک بھتیجے اور ایک بھتیجی کو جو بچپن میں یتیم ہو گئے تھے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ ان کی بیگم کی بھتیجی کے رشتہ کی تجویز تھی۔ اس رشتہ کی اطلاع ملی تو بے جی لاہور گئیں اور اس رشتہ کو ہر طرح مناسب پایا کچھ دنوں بعد بات پکی ہونے پر نکاح ہو گیا اور رخصتی کچھ عرصہ بعد قرار پائی۔

نکاح تو ہو گیا لیکن معلوم ہوتا ہے چچا جان کی متاہل زندگی کا ستارہ ابھی گردش میں تھا۔ منکوحہ خاتون کے پھوپھا کے قرابت داروں میں ایک وکیل صاحب تھے۔ انہوں نے اپنے لڑکے کے لئے یہ رشتہ مانگا تھا جسے منظور نہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے چچا جان کو چند گمنام خط لکھوائے جن میں اس خاتون کے متعلق کچھ شکایات درج تھیں۔ چچا جان سخت پریشان ہو گئے۔ رخصتی کا معاملہ ملتوی کر دیا اور طلاق کا ارادہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد چچا جان کے ایک دوست سید

بشیر حیدر جو اُن دنوں لدھیانہ میں ایکسائز انسپکٹر تھے لدھیانہ کے ایک خاندان سے رشتہ کا پیغام لے کر آ گئے۔ سیّد بشیر حیدر سیالکوٹ کے رہنے والے اور مولانا میر حسن کے قرابت دار تھے۔ جس خاندان سے رشتہ لائے اس کے سربراہ ڈاکٹر سبحان علی بڑے امیر کبیر تھے۔ ان کی اپنی اولاد دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں لیکن اپنے ہم زلف کے ایک لڑکے اور ایک لڑکی کو بھی ہم زلف کی وفات پر ساتھ رکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر سبحان علی کے انتقال کے بعد چونکہ اُن کی اپنی اولاد ابھی کم عمر تھی۔ ان کے ہم زلف کا بیٹا غلام محمد خاندان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ سیّد بشیر حیدر جو رشتہ لائے وہ غلام محمد کی ہمشیرہ کا تھا۔ رشتہ طے پاتے پر اس خاتون سے نکاح ہو گیا۔

یہاں مجھے یہ اعتراف کر لینا چاہیئے کہ چچا جان کا گمنام خطوط میں لکھی ہوئی باتوں کا بغیر تحقیق اتنا اثر لینا اصول انصاف پر پورا نہیں اُترتا اور اُن کی سخت ذہنی پریشانی پر دلالت کرتا ہے۔ اگر گمنام خطوط کے متعلق مناسب تحقیق کر لی جاتی جیسا کہ بعد میں کی گئی تو لدھیانہ میں شادی کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ بہر حال شادی ہو گئی اور کچھ دن لدھیانہ ٹھہر کر وہ لدھیانہ والی چچی مختار بیگم کو سیالکوٹ لے آئے۔ انہیں لاہور لے جانے سے قبل انہوں نے بڑی چچی جان کو بھی لاہور چل کر اُن کے ساتھ رہنے کے لئے کہا۔ چنانچہ دونوں بیگمات لاہور گئیں اور کچھ عرصہ انارکلی بازار والے مکان میں ساتھ ساتھ رہیں۔ لیکن یہ صورت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور کچھ مہینوں بعد بڑی چچی جان پھر اپنے میکے چلی گئیں۔

لاہور والی بیگم کا معاملہ ابھی معلق تھا۔ اُن کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے۔ انہوں نے چچا جان کو ایک خط لکھا جس میں گمنام خطوط میں لگائے گئے بہتان پر بغیر تحقیق کئے یقین کر لینے پر احتجاج کرتے ہوئے لکھا کہ میرا نکاح تو آپ سے ہو چکا۔ اب خواہ آپ طلاق دے دیں میں اسی حالت میں زندگی بسر کر دوں گی اور روزِ حشر اس بے انصافی کے لئے آپ کی دامن گیر ہوں گی۔ اس "مواخذہ روزِ محشر" والی بات سے چچا جان کو تشویش لاحق ہوئی۔ گمنام خطوط کے مندرجات کے متعلق جو تحقیق پہلے ہونی چاہیئے تھی۔ اب کی جانے لگی۔ جس وکیل نے گمنام خطوط لکھوائے تھے اُس کے منشی نے کہ وہ اس سازش میں شریک تھا اپنے کسی رنیق

سے یہ راز کی بات کہہ دی اور پھر بقول "منہ سے نکلی بات پرائی" ہائیکورٹ کے منشی طبقہ میں یہ بات پھیل گئی۔ مرزا جلال دین کو اپنے منشی سے معلوم ہوا تو انہوں نے متعلقہ وکیل کے منشی سے پوچھ گچھ کی پہلے انکاری ہوا لیکن مرزا صاحب کی جرح پر سب کچھ اگل دیا وکیل صاحب بار روم میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ پھر چپکے چپکے محلے برادری کی مستورات سے مرزا جلال دین کی بیگم نے پوچھ گچھ کی تو سب نے گمنام خطوط میں لگائے گئے بہتان کی تردید کی۔ اس تحقیق سے چچا جان کو اطمینان ہوگیا اور وہ رخصت کرالانے پر آمادہ ہوگئے۔ اب انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ چونکہ ایک وقت میں انہوں نے طلاق دینے کا ارادہ کر لیا ہوا تھا کہیں شرعاً طلاق تو نہیں ہو چکی لہٰذا مرزا جلال دین کو قادیان بھیجا کہ حضرت مولانا نور الدین (اللہ تعالےٰ ان سے راضی ہو) سے مسئلہ پوچھ آئیں۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ شرعاً تو صرف ارادے سے طلاق نہیں ہوتی لیکن دل میں وسوسہ ہے تو دوبارہ نکاح کر لیں۔ چنانچہ دوبارہ نکاح پڑھا گیا اور وہ لاہور والی سردار چچی جان کو رخصت کرا کر پہلے سیالکوٹ لے گئے اور پھر لاہور اور لدھیانہ والی دونوں بیگمات لاہور آگئیں۔ یہ ۱۹۱۳ء کی بات ہے۔ ۱۹۲۴ء میں مختار چچی جان کی وفات تک قریباً گیارہ سال دونوں بیگمات پہلے انار کلی والے مکان اور پھر میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں چچا جان کے ساتھ رہیں۔ اس طویل عرصہ میں ان کے درمیان سوکنوں والا تنازعہ کبھی میرے علم میں نہیں آیا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ چچا جان دونوں میں انتہائی عدل مدِنظر رکھتے تھے اور ایک کو دوسری پر کسی قسم کی فوقیت نہ دیتے تھے۔

محقق حضرات جاننا چاہیں گے کہ پہلی بیگم سے ناموافقت کے کیا اسباب تھے۔ میاں بیوی میں ناموافقت کوئی ایسی انوکھی بات نہیں جس پر تعجب کیا جائے۔ کئی شادیاں خصوصاً وہ جو کم عمری میں والدین کے انتخاب سے کی جائیں مزاجوں میں اختلاف کی وجہ سے ناکام ہو جاتی ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ چونکہ علامہ مشاہیر قوم سے ہیں اُن کے ذاتی معاملات کی بھی چھان بین کی جائے۔ میاں بیوی دونوں وفات پا چکے ہیں اور اب تو بھائی آفتاب بھی اللہ کو پیارے ہو چکے لہٰذا ان کے اختلافات کے گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا حاصل۔ میں نے تو اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے بعض دستاویزات کے ذکر سے پرہیز کیا ہے اور چچا جان کے جو خطوط اس

کتاب میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ اُن کے وہ حصّے بھی حذف کر دیئے جو زوجین کے مابین ناموافقت اور بھائی آفتاب سے کشیدہ تعلقات کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بعض عزیز ایسا کرنے کے حق میں نہ تھے کیونکہ اُن دستاویزات سے چچا جان پر "اپنے بیوی بچوں سے غافل ہو کر جوان بیویاں ڈھونڈتے پھرنے" اور اسی طرح کے اور ناروا الزامات جو ۱۹۶۷ء میں "مجلس محبّانِ اقبال" (برعکس نہند نام زنگی کافور) کی شائع کردہ ایک کتاب میں لگائے گئے غلط ثابت ہوتے ہیں۔ نیز اس اتہام کی بھی تردید ہوتی ہے کہ زوجین کی ناموافقت میں چچا جان کے بڑے بھائی کا ہاتھ تھا۔

جیسا کہ خود اس کتاب میں لکھا ہے اس کتاب کو لکھوانے اور شائع کرانے والوں کو اُن کی ایک عزیزہ نے مشورہ دیا کہ "آپ بھی اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لئے ضرور کوششیں کیجئے۔ پروپیگنڈا بڑی طاقت ہے۔" اگر علامہ اور اُن کے بڑے بھائی کو بُرا بھلا کہہ کر پروپیگنڈا کرنے والوں کو اُن کا صحیح مقام حاصل ہو گیا تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔

اس کتاب کے لکھنے والے صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ ازدواجی زندگی میں "بلاشبہ حصولِ مسرّت کا حق ہر ایک کو حاصل ہے"۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ "بے شک تعدّدِ ازدواج اسلام میں جائز ہے۔" لیکن بقول اُن کے "اس کے جواز کی شرطِ اوّل ہے عدل۔ اور جب پہلی بیوی کو نہ طلاق دی جائے۔ نہ مہر دیا جائے۔ نہ اس کے دیگر حقوق کی نگہداشت کی جائے تو ایسے شخص کو دوسری تیسری بیوی کرنے کا نہ شرعاً حق ہے نہ عرفاً نہ عقلاً نہ اخلاقاً۔" دوسرے الفاظ میں وہ چچا جان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے پہلی بیوی کو نہ طلاق دی نہ مہر دیا نہ اس کے دیگر حقوق کی نگہداشت کی اس لئے انہیں نکاحِ ثانی کا شرعاً اور اخلاقاً حق نہ تھا۔ یہ غلط الزام ایسا ہے کہ ریکارڈ درست رکھنے کے لئے اس کی تردید ضروری ہے۔ ایسا کرنے میں مجھے چچا جان کے خطوط کے وہ حصّے جو اس المیہ کے متعلق ہیں حذف کر دینے کے اپنے فیصلے سے تھوڑا سا انحراف کرنا پڑے گا۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ چچا جان جب لدھیانہ والی مختار چچی جان کو سیالکوٹ سے لاہور لے جانے لگے تو انہوں نے بڑی چچی جان کو بھی لاہور چل کر ان کے ساتھ رہنے کے

لئے کہا چنانچہ وہ لاہور تشریف لے گئیں اور کچھ عرصہ تک انار کلی والے مکان میں دونوں بیگمات ان کے ساتھ رہیں۔ کچھ مہینوں بعد بڑی چچی جان لاہور چھوڑ کر اپنے میکے گجرات چلی گئیں۔ کچھ عرصہ بعد چچا جان نے ابّا جان کو لکھا کہ وہ (بڑی چچی جان) اپنی مرضی سے گئی تھیں اور باوجود ہمارے روکنے کے وہ سیالکوٹ نہ رہیں۔ انہوں نے ابّا جان کو کہا کہ وہ حافظ صاحب (بڑی چچی جان کے والد محترم) کو اس بارے میں خط لکھیں تاکہ کوئی قابلِ عمل فیصلہ ہو جائے اور آئندہ کے لئے اس خلش سے رہائی ہو۔ اُن کی تجویز تھی کہ اگر بڑی چچی جان شرعی طور پر قطع تعلق چاہیں تو وہ ان کا حق مہر ادا کر دیں گے۔ اگر وہ ایسا کرنا پسند نہ کریں تو وہ جب تک زندہ ہیں نان نفقہ کے طور پر ماہوار رقم ادا کرتے رہیں گے۔ بڑی چچی جان نے جیسا کہ ان کی نجابت کا تقاضا تھا شرعی قطع تعلق پسند نہ فرمایا۔ چنانچہ اپنی وفات تک چچا جان باقاعدہ ماہوار رقم ادا کرتے رہے جو اُس رقم کے علاوہ تھی جو وہ ماہوار آفتاب بھائی کو کالج کی تعلیم کے لئے دیتے تھے۔ نان نفقہ کی رقم جہاں تک مجھے یاد ہے پہلے -/۳۰ روپے ماہوار تھی۔ پھر -/۵۰ روپے ماہوار کر دی گئی اور آخری سالوں میں تو -/۱۰۰ روپے ماہوار بھی ادا ہوا۔ سیّد نذیر نیازی آخری ایّام میں چچا جان کے حاضر باش احباب میں سے تھے۔ ان کی روایت ہے کہ اپریل ۳۸ء یعنی جس مہینے میں چچا جان کا وصال ہوا کی آخری ادائیگی کا منی آرڈر ان کے ہاتھ سے گیا[۴] جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اُس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ معترض کا الزام کہ "پہلی بیوی کو نہ طلاق دی نہ مہر دیا نہ اس کے دیگر حقوق کی نگہداشت کی" کہاں تک صحیح ہے۔

اس سلسلہ میں بڑی چچی جان کے دو ایک قریبی عزیزوں کی روایات بھی بیان کر دوں۔ سیّد نذیر نیازی "دانائے راز" میں رحیم بخش شاہین کے IQBAL MEMO-NTOS کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔ "کرنل خواجہ عبدالرشید کہ اُن (بڑی چچی جان۔ ناقل) کے قرابت داروں میں ہیں لکھ چکے ہیں کہ محمد اقبال والدہ آفتاب کا بڑا خیال رکھتے۔ اُن کی عزت کرتے۔"[۵] "روایاتِ اقبال" مرتبہ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی میں بڑی چچی جان کے بہنوئی خواجہ فیروز الدین بیرسٹر کی یہ روایت بیان کی گئی ہے۔ "ڈاکٹر صاحب کی پہلی اولاد ایک بیٹی

تھی جو آفتاب اقبال سے بڑی تھی۔ اُس کا نام معراج بیگم تھا۔ خدا نے اُسے سیرت اور صورت دونوں سے ایسا نوازا تھا کہ ہزاروں میں فرد تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ بچوں کو لے کر گجرات چلی گئی تھیں۔ وہاں بچّی کچھ بیمار ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب کو بے حد خیال تھا کہ بچے اور ان کی والدہ ان کے پاس رہیں تاکہ بچی کا پورا علاج ہو سکے۔ انہیں یہ خیال بھی تھا کہ میری بچّی بہت عقلمند ہے وہ اپنی والدہ کو ضرور راضی کر سکتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور بچی گجرات میں فوت ہو گئی۔"

بڑی چچی جان کے قریبی عزیزوں کی روایات سے "مجلس محبان علامہ اقبال" کے غلط الزامات کی کماحقہٗ تردید ہوتی ہے اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ چچا جان کی خواہش تھی کہ بڑی چچی جان اور ان کی اولاد ان کے پاس رہیں لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ یہاں یہ بھی بیان کر دیا جائے کہ معراج آپا کے گجرات میں فوت ہونے کے متعلق خواجہ فیروزالدین صاحب کا بیان ان کی یادداشت کی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔ معراج آپا گلے کے خنازیر کی موذی مرض میں گرفتار ہو گئی تھیں۔ اُن دنوں اس بیماری کا کوئی قطعی علاج معلوم نہ تھا۔ آپریشن سے متاثرہ غدود نکال دیتے تھے۔ آپا کے نانا ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے دو تین مرتبہ آپریشن کیا لیکن بیماری عود کر آتی تھی۔ آپا نے بڑی تکلیف اٹھائی۔ اُن کی عمر تو سترہ اٹھارہ سال ہو گی لیکن فہم و فراست میں پختہ عمر والوں کو مات کرتی تھیں جب انہیں یقین ہو گیا کہ بیماری لاعلاج ہے تو اصرار کیا کہ وہ اپنے ددھیال جا کر رہنا چاہتی ہیں۔ مجبوراً بڑی چچی جان انہیں سیالکوٹ لے آئیں جہاں وہ سب کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ مجھے یاد ہے انہیں سفید رنگ کا بدبودار کاڈلیور آئل پینا پڑتا تھا۔ وہ روزانہ صبح بڑی کراہت لیکن بڑی باقاعدگی سے اُسے پیتی تھیں۔ آخر اس موذی مرض نے جواں عمری میں انہیں ہم سے جدا کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون بے جی کی قبر تیار کراتے وقت ابا جان نے ان کی قبر کے پہلو میں اور دو قبروں کی جگہ بھی تیار کرائی تھی۔ ایک میاں جی کے لئے اور ایک اپنے لئے۔ معراج آپا کی آخری خواہش کے بموجب ابا جان نے انہیں اپنے لئے مخصوص کی ہوئی جگہ میں دفن کیا۔ اگر ددھیال میں ان کی والدہ اور اس کی اولاد پر ظلم و ستم کے وہ پہاڑ ڈھائے جاتے تھے جو اس کتاب

کے لکھنے والے نے "پروپاگنڈہ بڑی طاقت ہے" کا مظاہرہ کرنے کے لئے اپنے قلم کے زور سے رائی کے ایک دانے کے بغیر کھڑے کئے ہیں تو کیا معراج آپا زندگی کے آخری ایام اُن "ظالموں" کے درمیان بسر کرنے کے لئے اصرار کرکے سیالکوٹ آتیں ؟ خواجہ فیروز الدین نے صحیح کہا کہ معراج آپا کو اللہ تعالیٰ نے سیرت اور صورت دونوں سے ایسا نوازا تھا کہ ہزاروں میں فرد تھیں ۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان میں اپنے ننھیال کی امارت اور بڑائی کا وہ متکبرانہ تفاخر بالکل نہ تھا۔ جو مذکورہ بالا کتاب کے ہر صفحہ پر بکھرا ہوا ہے۔ شاید آپا چچا جان کو اسی خوبی کی وجہ سے عزیز تھیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائیں ۔

شادیوں کے سلسلہ میں ایک سراسر غلط روایت کی تردید ضروری ہے جو مجھے پروفیسر محمد عثمان نے سنائی۔ بقول ان کے ان سے یہ قصّہ ایک معلوم الاسم " اقبالیئے " نے بیان کیا میرا حُسن ظن ہے کہ وہ بزرگ خود روایت سازی نہیں کرتے۔ یادداشت کبھی ساتھ چھوڑ جائے تو ادر بات ہے لیکن جو بات واقعہ ہی نہیں ہوئی اُس میں یادداشت کی غلطی کا تو سوال پیدا نہیں ہوتا اس لئے میرا خیال ہے کسی روایت ساز نے یہ قصّہ اُن سے بیان کیا اور انہوں نے اپنی طبیعت کی سادگی کی وجہ سے اُسے صحیح سمجھ لیا۔ روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ لدھیانہ میں نکاح کے بعد جب چچا جان لاہور واپس آئے تو نئی بیگم کو لاہور اسٹیشن سے انارکلی والے مکان بھجوا دیا ۔ اور خود ایک کرایہ کے تانگے میں سیدھے لاہور والی منکوحہ کے میکے گئے اور اُسی دن اُسے رخصت کرا کر انارکلی والے مکان لے آئے ۔ یہ ایک من گھڑت افسانہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ۔ چچا جان اور میرے ابّا جان جو شادی کے لئے ان کے ساتھ لدھیانے گئے تھے لدھیانہ والی چچی جان کو سیدھے سیالکوٹ لائے تھے۔ ولیمہ کی مختصر دعوت سیالکوٹ میں ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ انہیں اور بڑی چچی جان کو لاہور لے گئے۔ لاہور والی سردار چچی جان کی رخصتی تو اِس کے کچھ عرصہ بعد ان سب مراحل کے طے ہو جانے کے بعد ہوئی جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ۔

۱؎ " علامہ اقبال اور اُن کی پہلی بیوی یعنی والدہ آفتاب اقبال" مطبوعہ جون ۶۷ء
۲؎ " علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی" صفحات ۱۵۱ ـ ۱۵۰
۳؎ ایضاً صفحہ ۱۳۱
۴؎ " دانائے راز" سید نذیر نیازی صفحہ ۹۶

باب ۱۲

علامہ اقبال کا سجع

جن دنوں علامہ انار کلی بازار والے مکان میں فروکش تھے اُن کا حسبِ ذیل سجع نہایت خوشخط لکھا ہوا ایک خوبصورت فریم میں درمیانی کمرہ کے آتش دان پر پڑا ہوتا تھا۔

دارد اُمید شفاعت ز محمدؐ اقبال

سجع کی کتابت حکیم فقیر محمد چشتی نظامی نے کی تھی جو ایک حاذق طبیب ہونے کے علاوہ بڑے صاحب ذوق اور پائے کے خوشنویس بھی تھے۔ علامہ سے اُن کے گھرے تعلقات تھے۔ "اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" کے پہلے ایڈیشن انہیں کے اہتمام سے طبع ہوئے تھے۔ "روزگار فقیر" کے مصنف کرنل وحید الدین مرحوم نے لکھا ہے کہ اپنا یہ سجع خود علامہ نے کہا تھا۔ میں اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ سجع کہا بھی حکیم صاحب نے ہی ہو۔ یہ فریم شدہ سجع میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں دیکھنا مجھے یاد نہیں۔ نہ معلوم کون لے گیا۔

باب ۱۳

ایک کشف

چچا جان کو لاہور میں وکالت کا کام شروع کئے دو تین سال ہوئے ہوں گے۔ ابھی دوسری اور تیسری شادی نہیں ہوئیں تھیں۔ انارکلی بازار والے مکان میں رہائش تھی۔ گرمیوں میں ایک رات مکان کی بالائی منزل میں چھت پر سونے کے لئے لیٹے ہوئے تھے۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ اشعار موزوں ہو گئے۔ چاہا کہ انہیں لکھ لیا جائے۔ اتنی رات گئے علی بخش کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ خود ہی لالٹین اٹھائی اور نچلی منزل میں دفتر کے کمرے میں جو انارکلی بازار کے رُخ تھا جا کر اشعار قلم بند کر لئے۔ واپس چھت پر جانے کے لئے اٹھے تو دیکھا کہ کمرے میں ایک دراز قد، سفید ریش، متبرک صورت بزرگ سفید لباس میں ملبوس کھڑے ہیں۔ یہ کچھ متعجب تو ہوئے لیکن اتنا سمجھ گئے کہ کوئی زندہ انسان بند دروازوں سے اندر نہیں آ سکتا۔ انہوں نے دریافت کیا آپ کون ہیں اور کیسے تشریف لائے ہیں۔ بزرگ نے جواب میں کہا میں یہ کہنے آیا ہوں کہ تم پانچ سو آدمی تیار کرو۔ پانچ سو آدمی تیار کرو۔ اتنا کہا اور نظروں سے غائب ہو گئے۔ صبح بیدار ہوئے تو رات کا واقعہ یاد آیا۔ انہیں خیال ہوا کہ شاید خواب دیکھا ہے لیکن دفتر میں آئے تو رات کے قلم بند کئے ہوئے اشعار موجود پائے۔ کچھ دنوں بعد عدالت کی موسم گرما کی تعطیلات میں

سیالکوٹ آئے۔ رات کو سونے کے لئے لیٹے تو میاں جی سے اس واقعہ کا ذکر کیا اور پوچھا کہ یہ بزرگ کون تھے اور پانچ سو آدمی تیار کرنے کے ارشاد کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔
میاں جی نے جواب دیا ان دنوں مسلم قوم کی حالت ناگفتہ بہہ ہے اور یہی حالات رہے تو اسلام کے لئے اس سے بھی زیادہ نازک زمانہ آنے والا ہے۔ مسلمان نام کو تو زندہ ہیں لیکن مُردوں سے بدتر۔ اُن میں جذبہ ہے لیکن کوئی صحیح راہنمائی کرنے والا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں تمہیں ہدایت ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو صحیح معنوں میں زندہ کرنے اور انہیں "آدمی" بنانے والی پانچ سو اشعار کی کتاب لکھو۔ باپ بیٹے کی اس گفتگو کے وقت میں میاں جی کا بدن دبا رہا تھا۔ اُن کی گفتگو سے جو کچھ یاد رہا اُسے اپنے الفاظ میں مختصراً بیان کیا ہے۔
۱۹۶۳ء میں جن دنوں فقیر وحید الدین مرحوم "روزگار فقیر" کا نقشِ ثانی ترتیب دے رہے تھے میں نے یہ واقعہ انہیں سنایا تو انہیں یہ معلوم کرنے کی جستجو ہوئی کہ اس کشفی ہدایت کی تعمیل میں علامہ نے کون سی کتاب لکھی۔ اپنی تحقیق سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ وہ کتاب مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ہے۔ چنانچہ "روزگار فقیر" کے حصۂ اول میں انہوں نے اس واقعہ اور اپنے اس نتیجہ کا ذکر کیا ہے[۱]۔ اس کے برعکس راولپنڈی کی ایک خاتون مضمون نگار (کہکشاں ملک) کی تحقیق کے مطابق "طلوعِ اسلام" وہ نظم ہے جو اس ہدایت کی تعمیل میں کہی گئی۔ اُن[۲] کا کہنا ہے کہ "یہ واقعہ خود اقبال نے اپنی طویل نظم طلوعِ اسلام کی تخلیق کے بارے میں بتلایا ہے" لیکن اس بیان کی تائید میں انہوں نے علامہ کی کسی تحریر کا حوالہ نہیں دیا۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق میاں جی کی ہدایت کی تعمیل میں لکھی جانے والی کتاب نہ تو مثنوی "پس چہ باید کرد" ہے نہ نظم "طلوعِ اسلام" بلکہ "مثنوی اسرارِ خودی" ہے۔ جس کشف کا ذکر کیا گیا ہے وہ ۱۹۱۰ء میں ہوا اور اس کے متعلق میاں جی سے اُن کی گفتگو بھی اُسی سال ہوئی۔ جولائی ۱۹۱۱ء میں انہوں نے اپنے ایک خط[۳] میں مس عطیہ فیضی کو لکھا: "قبلہ والد صاحب نے فرمائش کی ہے کہ حضرت بوعلی قلندر کی مثنوی کے طرز پر ایک فارسی مثنوی لکھوں۔ اس راہ کی مشکلات کے باوجود میں نے کام شروع کر دیا ہے۔ تمہید بند ملاحظہ فرمائیے۔

نالہ را اندازِ نو ایجاد کُن | بزم را از ہاؤ ہو آباد کُن
آتش استی بزم عالم برفروز | دیگراں راہم ازیں آتش بسوز
سینہ را سرمنزلِ صد نالہ ساز | اشک خونیں را جگر پرکالہ ساز
پشتِ پا بر شورش دنیا بزن | موجۂ بیرون ایں دریا بزن

بقیہ اشعار حافظ سے اُتر گئے ہیں۔ امید ہے عدالت سے واپسی پر یاد آجائیں گے"

اس اقتباس خط کے بعد مثنوی" اسرارِ خودی" کے تمہیدبند کو پڑھیں تو اس میں ایک رات مولانا روم کی طرف سے "خیز د جانِ نو بدہ سہر زندہ را۔ از قُمِ خود زندہ ترکن زندہ را" کی ہدایت کا ذکر ہے اور جو چار شعر عطیہ فیضی کے نام خط میں درج ہیں اُن میں سے پہلے دو شعر من وعن اور تیسرا قدرے تبدیلی کے ساتھ موجود ہے۔ اِس تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میاں جی کی ہدایت کی تعمیل میں لکھی جانے والی کتاب مثنوی" اسرارِ خودی" ہے جو ۱۱ء سے لکھ رہے تھے اور ۱۵ء میں شائع کی۔ نظم" طلوعِ اسلام" تو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ ۲۴ء میں پڑھی گئی تھی یعنی کشف متذکرہ بالا کے چودہ سال بعد اور مثنوی" پس چہ باید کرد" تو کہیں ۳۶ء میں شائع ہوئی۔

مثنوی" اسرارِ خودی" کا ذکر آ گیا ہے تو اُس کے متعلق بھی دو ایک باتیں بیان کر دی جائیں۔ اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے کچھ اشعار میں حافظ شیرازی پر کڑی تنقید کی گئی تھی۔ اس پر تصوف کے علم بردار بے حد چراغ پا ہوئے تھے۔ اُن کے حلقوں میں چچاجان کی مخالفت کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اُن کی طرف سے اخبارات میں مثنوی اور خود مصنف کے خلاف مضامین شائع ہوئے۔ خواجہ حسن نظامی اس مخالفت میں پیش پیش تھے۔ مولانا اکبر الہ آبادی بھی حافظ کے متعلق جو کچھ کہا گیا اس سے کبیدہ خاطر ہوئے۔ ایک صاحب (پیرزادہ مظفر احمد فضلی) نے" رازِ بے خودی" نام سے ایک جوابی مثنوی شائع کی جس میں "اسرارِ خودی" کے مصنف کو جی بھر کر بُرا بھلا کہا گیا۔ اس مثنوی کے لہجے کی تلخی۔ اندازِ بیان کی درشتی اور تنقید کی شدت کا اندازہ اس ایک شعر سے کیجئے جس میں اسرارِ خودی کے مصنف کو" بندۂ دنیا بہ دنیا دیں فروش۔ سربسر ملت فروش۔ آئیں فروش" تک کہا گیا۔

جن دنوں مخالفت کا یہ ہنگامہ گرم تھا، چچا جان سیالکوٹ آئے۔ باپ بیٹا جب یکجا بیٹھے تو قدرتاً مثنوی اسرارِ خودی پر صوفیاء کے حلقوں کی برہمی کا ذکر آیا۔ چچا جان نے فرمایا۔ انہوں نے حافظ کی ذات اور شخصیت پر اعتراض نہیں کیا صرف عجمی تصوّف کی مخالفت کی ہے جو طبائع کو پست کرنے والا ہے۔ افسوس ہے مسلمانوں پر عجمی اثرات اس قدر غالب آ چکے ہیں کہ وہ زہر کو آبِ حیات سمجھتے ہیں۔ میاں جی نے بڑی مرنجان مرنج طبیعت پائی تھی۔ انہوں نے فرمایا اگر حافظ کے عقیدت مندوں کے جذبات کو ٹھیس لگائے بغیر اصول کی تشریح کر دی جاتی تو اچھا تھا۔ اس کے جواب میں چچا جان نے کہا یہ "حافظ پرستی" بھی تو بت پرستی سے کم نہیں۔ میاں جی نے کہا اللہ اور اس کے رسولؐ نے بتوں کو بھی برا کہنے سے منع فرمایا ہے اس لئے مثنوی کے ان اشعار کو جن پر عقیدتمندانِ حافظ کو اعتراض ہے آئندہ ایڈیشن میں حذف کر دینا مناسب ہوگا۔ اس پر چچا جان نے جواباً کچھ نہ کہا۔ صرف مسکرا کر رہ گئے لیکن دوسری ایڈیشن میں وہ ۳۵ اشعار جو ذرا سخت تھے مثنوی سے حذف کر دیئے۔

کلامِ اقبال کے مداحوں کو یہ معلوم ہو کر تعجب ہوگا کہ جس مثنوی کا ترجمہ انگریزی میں ہونے کے بعد یورپ میں اس کی دھوم مچی اُس کا فارسی میں پہلا ایڈیشن یہاں صرف پانچ سو کی تعداد میں چھپا تھا۔

اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ ہوا تو یورپ اور امریکہ میں جو ریویو شائع ہوئے اُن کا ذکر چچا جان نے میاں جی اور ابا جان کے نام اپنے خطوط میں کیا ہے جو اِس کتاب میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ صوفیاء نے "اسرارِ خودی" پر اعتراض کیا تھا کہ مصنف مسلمانوں کو مغربی خیالات سکھاتا ہے اور ان کو فرنگیت کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس مغرب کے مترجم نے دیباچے میں لکھا کہ "یہ مثنوی ایک زبردست آواز ہے جو مسلمانوں کو محمدؐ اور قرآن کی طرف بلاتی ہے۔"

"زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا۔ اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں"

مثنوی کے شائع ہونے پر تو صوفیاء کے حلقوں نے مصنف پر خوب کس کر تنقید

کی تھی بلکہ دشنام طرازی پر اتر آئے تھے۔ اُن کو "فلسفی فطرت زدیں برگشتہ" تک کہہ دیا مگر ان کی وفات کے بعد ایک ۲۵ اپریل کو حسبِ ذیل خبر بھی اخبار میں نظر سے گزری:

"علامہ اقبال کو بزمِ جمالی کا خراجِ عقیدت"

"بزمِ جمالی کے زیرِ اہتمام حکیم الامت مفکرِ اعظم علامہ ڈاکٹر محمد اقبال علیہ الرحمۃ کا یوم منایا گیا جس میں صوفیائے کرام و مشائخ عظام نے حلقۂ ذکر و شغل فاتحہ خوانی و نعت خوانی کر کے اور قرآن خوانی کا ثواب پہنچا کر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر علامہ اقبال کا صوفیانہ و عارفانہ کلام پیش کیا گیا علامہ اقبال نے بہ حیثیت صوفی کے جو خدمت و اشاعت دینِ اسلام کی کی ہے اس کو سراہا گیا۔ آپ کا روحانی اور ابدی پیغام دنیا کے لئے راہِ رشد و ہدایت ہے اور زندۂ جاوید یادگار ہے"

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

۱۔ روزگارِ فقیر جلد اوّل صفحات ۱۱۵ تا ۱۱۹

۲۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۲ جولائی ۷۷ء "اقبال کی شخصیت اور شاعری (آخری قسط)"

۳۔ اقبال نامہ حصّہ دوم۔ صفحہ ۱۴۸ - ۱۴۹

باب ۱۴

من نہ کردم شما حذر بکنید

چچا جان کے سوانح نگاروں نے اُن کی حقّے سے دلچسپی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ "حقہ" پیئے بغیر رہ نہ سکتے تھے۔ انہیں اس کی لت اپنے بزرگوں کی "حقہ" نوشی سے پڑی ہوگی۔ کیونکہ میاں جی اور ابّا جان بھی حقّے کے بڑے رسیا تھے۔ میاں جی حقّے میں بازاری تمباکو استعمال نہیں کرتے تھے۔ چچا جان کے احباب اعلیٰ قسم کا خشک تمباکو تحفتاً بھیجتے۔ اُسے کئی دن تک دھوپ میں سکھایا جاتا۔ پھر اُسے اوکھلی میں کوٹ کر اس میں ایک اندازے سے راب ملا کر تمباکو تیار کیا جاتا۔ یہ سب اہتمام پہلے میاں جی اپنی نگرانی میں خود کیا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے تمباکو کی تیاری کے "رموز" بھابھی جی کو سمجھا دیئے اور وہ ملازمہ سے اپنی نگرانی میں تمباکو تیار کراتیں۔ "حقّے کے لئے چلم بھرنا" بھی میاں جی کے نزدیک ایک فن تھا۔ چونکہ چلمیں بھرنے کی ڈیوٹی زیادہ تر ہم لڑکوں کے سپرد تھی اس لئے میاں جی نے ہمیں باقاعدہ چلم بھرنے کی ٹریننگ دی تھی۔ برسوں ہم نے تینوں بزرگوں کے لئے چلمیں بھری ہیں اگرچہ میاں جی کو سوائے بھابھی جی کے اور کسی کی بھری ہوئی چلم پسند نہ آتی تھی۔ میاں جی اور ان کے بعد کی تین پشتوں میں خاندان کے قریباً سارے بالغ مرد تمباکو سے شوق رکھتے ہیں اگرچہ اب حقّہ کی جگہ سگریٹ نے لے لی ہے لیکن میں نے تمباکو نوشی سے آج تک اجتناب کیا ہے۔ یہ سبق

بھی مجھے چچا جان نے ہی سکھایا۔ اِس اجمال کی تفصیل بیان کر دیتا ہوں۔

۱۹۱۲ء کی بات ہے میرے آبا جان کیمبل پور میں تعینات تھے۔ عدالت عالیہ کی گرمیوں کی تعطیل میں چچا جان سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ کیمبلپور کے ایک صاحب انہیں کیمبلپور میں ایک مقدمہ کی پیروی کے لئے وکیل کرنے کے لئے سیالکوٹ آئے۔ عام حالات میں تو چچا جان انکار ہی کر دیتے کیونکہ سفر سے بہت جی چراتے تھے لیکن آبا جان کے کیمبل پور میں ہونے کی وجہ سے مقدمہ لے لیا کہ اس طرح "بھائی صاحب سے ملاقات ہو جائے گی۔" اکیلے سفر کرنا اُن کے لئے بہت دوبھر ہوتا تھا۔ اگرچہ میری عمر اس وقت صرف تیرہ سال تھی مجھے بھی ساتھ لے لیا کہ اپنے ابا سے مل سکو گے۔ ہم تین چار دن کیمبل پور ٹھہرے مجھے یاد ہے مولوی الف دین وکیل نے چچا جان کے اعزاز میں رات کے کھانے کی دعوت کی تھی جس میں بہت سے لوگ شامل تھے۔ واپسی کے سفر میں ہم جس گاڑی سے روانہ ہوئے وہ وزیر آباد جنکشن پر آدھی رات کے قریب پہنچی۔ وہاں سیالکوٹ کے لئے گاڑی بدلتی تھی۔ سیالکوٹ جانے والی گاڑی ایک دوسرے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی جسے صبح پانچ بجے روانہ ہونا تھا۔ ہم اُس گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ اُس وقت چچا جان کو حُقّے کی طلب ہوئی۔ قُلی سے جو سامان اٹھا کر لایا تھا کہا اگر اس وقت کہیں سے حُقّہ لے آؤ تو تمہیں ایک روپیہ انعام ملے گا۔ اُن دنوں کا ایک روپیہ آج کے دس روپوں کے برابر تھا۔ قُلی گیا اور کچھ عرصہ بعد ایک بوسیدہ سا حقّہ لے کر آگیا جس کا پیندا مٹی کا تھا اور چلم بھی شکستہ تھی۔ حُقّہ دیکھ کر چچا جان بہت خوش ہوئے۔ اپنا بستر جو ہولڈال میں بندھا رکھا تھا باہر پلیٹ فارم پر رکھوا لیا۔ خود اس پر بیٹھ گئے اور پاس ہی قُلی زمین پر بیٹھ گیا۔ دیر تک دونوں باری باری حُقّے کے کش لگاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ چونکہ میں گاڑی کے اندر ہی رہا اس لئے معلوم نہیں گفتگو کس موضوع پر تھی لیکن بالکل بے تکلفانہ تھی۔ اس واقعہ سے میرے ذہن پر پہلا اثر تو یہ ہوا کہ باوجود اپنے رتبہ اور علم کے چچا جان نے ایک غریب مزدور کے ساتھ بیٹھ کر بے تکلفانہ گفتگو کرنے اور حقہ نوشی میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔

دوسرا تاثر یہ تھا کہ تمباکو نوشی اچھی عادت نہیں کہ حُقّے کے صاف اور ناصاف ہونے

کا خیال بھی نہیں رہتا۔ چچا جان حقّہ نوشی کے شغل سے فارغ ہو کر گاڑی کے اندر آ گئے۔ میں نے سیٹ پر بستر لگا دیا۔ وہ لیٹ گئے تو میں نے کہا حقّہ تو بہت ہی گندہ تھا معلوم نہیں کس کا اُٹھا لایا تھا۔ انہوں نے فرمایا جس کو تمباکو نوشی کی عادت ہو جائے۔ اُسے طلب کے وقت ان نفاستوں کا خیال ہی نہیں آتا۔ تھوڑے توقف کے بعد فرمایا تم اس کی عادت نہ ڈالنا۔ شاید اسی وجہ سے مجھے کبھی تمباکو نوشی کی خواہش تک نہیں ہوئی۔ الحمد للہ

یہ واقعہ آج سے قریباً بہتر سال پرانا ہے لیکن "ترجمانِ حقیقت" اور وزیر آباد کے قلّی کی باہمی حقّہ کشی کی تصویر آج بھی ذہن میں اس طرح موجود ہے جیسے کل کی بات ہو۔

لہ دو ایک سال ہوئے میرے چھوٹے بیٹے نعیم نے سگریٹ نوشی ترک کر دی ہے اور پچھلے دنوں یہ معلوم ہو کر بڑی خوشی ہوئی کہ جاوید نے بھی سگریٹ نوشی ترک کر دی ہے۔ الحمد اللہ

باب ۱۵

مولانا میر حسن ہال

علامہ اقبال کو کبھی یہ خواہش نہ ہوتی تھی کہ انہیں کسی انجمن میں کوئی عہدہ دیا جائے یا کسی جلسہ کی صدارت کے لئے کہا جائے ۔ یا کسی اور طریق پر ان کی قیادت کا اعتراف کیا جائے ۔ وہ ان باتوں سے بالکل بے نیاز تھے ۔ ایک مرتبہ اُن کے نام سے ایک فوجی سکول قائم کرنے کی تجویز ہوئی تو مجوّز کو جو ایک فوجی افسر تھے جواب دیا کہ میرے نام سے فوجی سکول کو موسوم کرنا موزوں نہیں اور خود تجویز کی کہ سکول کا نام ٹیپو فوجی سکول رکھا جائے ۔ اس طبیعت کے باوجود ایک مرتبہ انہیں اپنا نظر انداز کیا جانا بہت ناگوار رہا ۔ ہمارے وطن شہر سیالکوٹ میں ایک انجمن اسلامیہ قائم ہے جو علاوہ اور قومی کاموں کے ایک اسلامیہ ہائی اسکول بھی چلاتی تھی ۔ جب اس سکول کی نئی عمارت تعمیر ہوئی تو انجمن کی مجلسِ انتظامیہ نے سکول کے ہال کا نام مولانا میر حسن کے نام پر "میر حسن ہال" رکھا ۔ اُس ہال کی رسمِ افتتاح کے لئے انجمن والوں نے حکومتِ پنجاب کے وزیرِ تعلیم کو دعوت دی اور انہوں نے رسم افتتاح ادا کی ۔ انجمن والوں کی یہ حکام پرستی علامہ کو ناپسند ہوئی ۔ کچھ عرصہ بعد وہ سیالکوٹ آئے ہوئے تھے ۔ سیالکوٹ کے دو ایک ملنے والوں نے شکایت کی کہ آپ اپنے وطن بہت کم آتے ہیں ۔ جواب میں فرمایا میرے یہاں کم آنے سے وطن والوں کا کیا نقصان ہوتا ہے ۔

انہوں نے میرے استاد کے نام سے ایک ہال منسوب کیا۔ مناسب یہ تھا کہ اُس ہال کی رسمِ افتتاح اُن کے شاگرد سے کرائی جاتی مگر حکام پرستی کے شوق میں انجمن والوں نے اُس کو نظر انداز کر کے ایک وزیر سے رسمِ افتتاح کرائی۔ اس لئے میرا تو سیالکوٹ آنے کو دل نہیں چاہتا لیکن بھائی صاحب اور عزیزوں کی وجہ سے آنا ہی پڑتا ہے۔

باب ۱۶

اوّلیں پرسشِ نماز بود

۱۹۲۲ء کی گرمیوں کا ذکر ہے عدالت عالیہ کی تعطیل میں چچا جان سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ اُس سال کے شروع میں انہیں نقرس کی وجہ سے بہت تکلیف رہی تھی۔ تعطیل کی ابتدا میں پہلے شملہ چلے گئے۔ غالباً وہاں کی مرطوب آب و ہوا اور بارشوں کے اثر کی وجہ سے یہ تکلیف ہوئی۔ سیالکوٹ آنے کے دو تین دن بعد اِس عارضے کا پھر حملہ ہوا۔ یہ تکلیف ان کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے کے جوڑ میں تھی اور اتنی سخت تھی کہ چلنا پھرنا تو درکنار اُن کے لئے زمین پر پاؤں رکھنا بھی دشوار تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ رات کو سونے کا انتظام تیسری منزل کی چھت پر ہوتا تھا۔ شام ہوئی تو انہیں چھت پر لے جانے کا مرحلہ پیش آیا۔ وہ ماشاء اللہ بھرے جسم کے تھے۔ گھر کے مردوں میں دو ضعیف العمر بزرگ اور راقم الحروف ایک نحیف الجثہ ۲۳ سالہ نوجوان تینوں انہیں پیٹھ پر اٹھا کر سیڑھیاں چڑھنے سے معذور تھے۔ بڑے پھوپھا کرم الٰہی کے چھوٹے بیٹے بھائی فضل حق مرحوم سرو قد کسرتی جوان تھے۔ سینڈو کی ورزشیں کرنا ان کا روز کا معمول تھا۔ چچا جان کو اپنی پیٹھ پر لاد کر چھت پر لے جانے کی سعادت ان کے حصّہ میں آئی۔ سیالکوٹ میں اُن دنوں چوٹی کے ڈاکٹر کشن چند تھے۔ وہ مقامی کانگریس کمیٹی کے سربراہ تھے۔ چونکہ میں بھی خلافت کمیٹی کی سرگرمیوں میں حصّہ لیتا تھا

اس لئے مجھے جانتے تھے۔ میں انہیں لانے کے لئے اُن کے مطب گیا۔ اس شام کو رام نلائی میں کانگریس کا ایک پبلک جلسہ تھا اور وہ اس میں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ چچا جان کی علالت کا سُنا تو میرے ساتھ آ گئے۔ معائنہ کے بعد دوائی تجویز کی پینے کے لئے ایک مکسچر اور ٹکور کے لئے ایک لوشن۔ ہدایت کی کہ لنٹ (Lint) کی گدّی بنا کر لوشن میں تر کر کے مقام ماؤف پر رکھی جائے اور اُسے کسی وقت خشک نہ ہونے دیا جائے۔ میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جا کر دونوں دوائیاں لے آیا۔ چچی مختار اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ چچی سردار اور میں لنٹ کی گدّی لوشن میں تر کر کے انگوٹھے پر ٹکور کرتے رہے۔ رات کے پہلے پہر میں تو درد کی زیادتی کی وجہ سے انہیں نیند کہاں آتی۔ معلوم ہوتا ہے نصف شب کے بعد درد میں کچھ تخفیف ہوئی تو ان کی آنکھ ذرا جھپک گئی۔ ٹکور کا عمل تو جاری رکھنا تھا۔ اس لئے ہم دونوں رات بھر اُن کی پٹی سے لگے بیٹھے رہے۔ چچا جان گہری نیند میں ہوتے تو اُن کے خراٹوں کی آواز گھر بھر میں سنائی دیتی۔ پچھلے پہر خراٹے بھی لینے لگے۔ بھابھی جی اپنی چارپائی کے ساتھ والے تخت پوش پر تہجد میں مشغول تھیں۔ فارغ ہوئیں تو اشارے سے چچی سردار کو بُلا کر کہا اس وقت تو ٹِک گئے معلوم ہوتے ہیں تم ذرا کمر سیدھی کر لو۔ وہ انہیں کی چارپائی پر لیٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد گھر کے سامنے والی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو وہ اُٹھ کر غسل خانے میں وضو کرنے چلی گئیں۔ سحر خیزی کے آداب تو چچا جان سے لندن میں بھی نہ چھوٹے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی بیدار ہو گئے۔ مجھے اپنے انگوٹھے پر لنٹ کی گدّی رکھے بیٹھے دیکھا تو اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ پر رکھا اور دباتے ہوئے فرمایا "ہر کہ خدمت کرد اُو مخدوم شد۔" پھر پوچھا تمھاری چچی کہاں ہے۔ میں نے کہا وضو کے لئے غسل خانے گئی ہیں۔ پوچھا اذان ہو گئی۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو کہا تم نماز کے لئے نہیں گئے مجھے ندامت سے اعتراف ہے کہ باوجود اُن کے اس ارشاد کے کہ "جہاں تک ممکن ہو نماز میں بھی باقاعدہ ہو جاؤ" ان دنوں میری نمازیں گنڈے دار تھیں۔ کبھی پڑھ لی۔ کبھی نہ پڑھی۔ اس غفلت کا اعتراف اُن سے کرنے میں تامل ہوا۔ بات ٹالنے کے لئے کہا جو کچھ کر رہا ہوں۔ یہ بھی تو عبادت ہی ہے۔ انہوں نے فرمایا "نہیں نماز کو اولیت حاصل ہے۔

درد میں اب تخفیف ہے تم اُٹھ کر نماز ادا کرو۔" میں نے ارشاد کی تعمیل کی۔ میری اُس نماز کا ثواب تو یقیناً انہیں ہی ملا ہو گا کیونکہ میرا ارادہ تو اُس دن نماز گول کر دینے کا تھا۔

دو ایک دن یہ کیفیت رہی کہ صبح ان کی چارپائی کو اُٹھا کر کمرے میں لے جاتے اور شام کو باہر چھت پر لے آتے۔ اگرچہ اُن کا بستر دانستہ ایک ہلکی چارپائی پر کیا تھا پھر بھی میرے اور چچی سردار کے لئے صبح شام کا یہ عمل خاصا دشوار ہوتا۔ ایک دن ابّا جان نے ہاتھ بٹانا چاہا تو کمر کا درد لے کر بیٹھ گئے۔ دو ایک دن بعد درد میں بڑی حد تک تخفیف ہو گئی تو صبح خود اٹھ کر سہارے سے اندر چلے جاتے اور شام کو باہر آ جاتے۔ نقرس کے درد کا یہ دورہ کوئی ہفتہ بھر رہا اور پھر صحت بحال ہو گئی۔

لے "نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی"

لے میرے نام خط محررہ ۸ رجون ۱۹۲۲ء

باب ۱۷

شعرش زلبش شنیدہ ام من

میں نے چچا جان سے اُن کا کلام پبلک جلسوں میں تین چار مرتبہ سنا ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۱۱ء میں جب میری عمر ۱۲ سال سے کچھ اوپر تھی اور میں سکاچ مشن سکول سیالکوٹ میں پڑھتا تھا۔ لاہور میں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا۔ چچا جان کے لکھنے پر میاں جی جلسہ میں شمولیت کے لئے سیالکوٹ سے لاہور گئے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ اُس سال انجمن کا جلسہ اسلامیہ کالج کے ریواز ہوسٹل کے صحن میں منعقد ہوا تھا۔ جس اجلاس میں چچا جان نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" سنائی اس میں میاں جی اور میں موجود تھے۔ پنڈال میں تِل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ہم سٹیج پر بیٹھے تھے۔ یہ نظم تحت اللفظ پڑھی گئی تھی۔ نظم ختم ہوئی تو سٹیج پر بیٹھے ہوئے سامعین میں سے ایک بزرگ اٹھ کر والہانہ چچا جان سے بغل گیر ہو گئے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ انہوں نے چچا جان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ایک کشمیری دُھسہ اُن کے کندھوں پر ڈال دیا۔ چچا جان نے وہ دُھسہ انجمن کو پیش کر دیا جسے اُسی اجلاس میں نیلام کیا گیا۔ حاضرین جلسہ بڑھ چڑھ کر بولیاں دے رہے تھے۔ آخر کار ایک خطیر رقم پر بولی ختم ہوئی اور وہ رقم انجمن کو مل گئی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ چچا جان سے اس طرح اظہار عقیدت کرنے والے بزرگ بارہ مولا

کشمیر کے ایک بڑے تاجر خواجہ صمد جو ککڑو تھے جو اُن کے دیرینہ دوست اور مداح تھے۔
وہ خود بھی فارسی میں شعر کہتے تھے اور "مقبل" اُن کا تخلص تھا۔
۱۹۱۸ء میں یورپ کی پہلی جنگ عظیم زوروں پر تھی۔ اوڈوائر جیسا جابر حاکم پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر تھا۔ جنگ میں حکومتِ برطانیہ کی امداد کے لئے ہر قسم کی تدابیر اختیار کی جا رہی تھیں۔ اسی سلسلہ میں یونیورسٹی ہال لاہور میں ایک دربار منعقد کیا گیا۔ اوڈوائر نے نواب ذوالفقار علی خاں کے ذریعے چچا جان سے دربار میں شامل ہونے اور جنگ کے متعلق ایک نظم پڑھنے کی فرمائش کی جب ٹالنا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے بادل ناخواستہ شرکت کی اور "پنجاب کا جواب" کے عنوان سے ایک مسدس پڑھ کر سنائی جس کا پہلا بند تھا۔

اے تاجدارِ خطۂ جنت نشانِ ہند　　روشن تجلّیوں سے تری خاورانِ ہند
محکم ترے قلم سے نظامِ جہانِ ہند　　تیغِ جگر شگاف تری پاسبانِ ہند
ہنگامۂ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہلِ وفا کی نذرِ محقر قبول ہو

میں اُن دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتا تھا اور ریواز ہوسٹل میں رہتا تھا۔ کالج کے کچھ طلبا کے ساتھ میں بھی یہ درباری مشاعرہ سننے گیا تھا۔ چودھری محمد حسین بھی ان دنوں ریواز ہوسٹل میں رہتے تھے۔ وہ یا تو ایم اے کے آخری سال میں تھے یا امتحان دے چکے تھے لیکن ابھی ریواز ہوسٹل میں ہی مقیم تھے۔ اُن کے کمرے میں چچا جان کے کچھ عقیدت مند سینیئر طلبا کی بیٹھک رہتی تھی۔ چودھری رحمت علی بھی جو غالباً ریواز ہوسٹل میں مقیم نہ تھے۔ لیکن اکثر وہاں آتے رہتے تھے اس بیٹھک میں شامل ہوتے تھے۔ یہ لوگ گاہے گاہے چچا جان سے ملنے جایا کرتا تھے۔ وہاں سے جو کچھ سن کر آتے اس پر اُن کی مجلس میں گفتگو رہتی۔ میں اگرچہ اُن حضرات سے بہت جونیئر تھا لیکن چچا جان کی قرابت کی وجہ سے چودھری محمد حسین کی مجھ پر نظرِ عنایت تھی اور مجھے بھی کبھی کبھی اُن کی مجلس میں ایک سامع کی حیثیت میں بیٹھنے کا موقعہ ملتا رہتا تھا۔ چودھری صاحب کے کمرے میں جو گفتگو ہوتی اُس سے مجھے اندازا ہوا کہ چچا جان جو ایک زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کا "اک نیا شوالہ اس دیس

میں بنا دیں " اور " آوازۂ اذاں کو ناقوس میں ملادیں " کے پرجوش اور سرگرم داعی تھے اب برادرانِ وطن کے طرزِ عمل سے بددل ہو کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندوں اور مسلمانوں کا ایک مشترک قومیت کے طور پر سیاسی تحریک چلانا مسلمانوں کے مفاد میں نہیں اور ان کے لئے اپنی قومی شخصیت کو محفوظ رکھنا اور عالمِ اسلامی کے اتحاد کو اپنا نصب العین بنانا ضروری ہے ۔ مجھے یاد ہے یونیورسٹی ہال والے مشاعرے کے بعد ایک دن چودھری محمد حسین کے کمرے میں چچا جان کی نظم متذکرہ بالا پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک شریکِ مجلس طالب علم جن کا نام یاد نہیں آ رہا جو صوبۂ سرحد کے رہنے والے تھے اور بڑے انگریز دشمن تھے۔ چچا جان کی اس نظم کے پڑھے جانے پر بڑے پُرجوش انداز میں اعتراض کر رہے تھے اور بیچارے چودھری صاحب کے لئے نظم کا جواز پیش کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق اپنی داڑھی کھجا رہے تھے جیسے وہاں سے نظم کا جواز تلاش کر رہے ہوں اور نظم کے بعض اشعار کے بین السطور مطالب بیان کر رہے تھے۔ مثلاً نظم کا ایک بند ہے :-

آزادیٔ زبان و قلم ہے اگر یہاں — سامانِ صلح دیر و حرم ہے اگر یہاں
تہذیبِ کاروبارِ اُمم ہے اگر یہاں — خنجر میں تاب تیغ میں دم ہے اگر یہاں
جو کچھ بھی ہے عطائے شہِ محترم سے ہے
آبادیٔ دیار ترے دم قدم سے ہے

چودھری صاحب کا کہنا تھا کہ مشاعر نے استفہامیہ فقرہ " ہے اگر یہاں " استعمال کر کے اصل میں " آزادیٔ زبان و قلم " اور " سامانِ صلحِ دیر و حرم " وغیرہ کے ملک میں فقدان کی طرف اشارہ کیا ہے اور " جو کچھ بھی ہے عطائے شہِ محترم سے ہے " کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ ان کا فقدان حکومت کی سخت گیر اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں برسرِ پیکار رکھنے کی پالیسی کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح ایک اور بند ہے :-

جب تک چمن کی جلوۂ گل پر اساس ہے — جب تک فروغِ لالۂ احمر لباس ہے
جب تک نسیمِ صبح عنادل کو راس ہے — جب تک کلی کو قطرۂ شبنم کی پیاس ہے

قائم رہے حکومت آئیں اسی طرح
دبتا رہے چکور سے شاہیں اسی طرح

چودھری صاحب کا کہنا تھا کہ چمن میں جلوۂ گل مختصر وقت کے لئے ہوتا ہے پھر خزاں آجاتی ہے۔ اسی طرح لالۂ احمر لباس کا فروغ بھی وقتی ہوتا ہے اور گلِ لالہ جلد مر جھا جاتا ہے۔ تبسم صبح بھی مختصر عرصہ کے لئے چلتی ہے اور قطرۂ شبنم بھی پرتو خورشید سے جلد فنا ہو جاتا ہے۔ شاعر نے "قائم رہے حکومتِ آئیں اسی طرح" کہہ کر دراصل اشارہ کیا ہے کہ انگریز کی حکومت کی میعاد اب تھوڑی رہ گئی ہے۔ یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ ان اشعار کی اس شرح کو چودھری صاحب نے شاعر کی طرف منسوب نہیں کیا تھا بلکہ یہ دُور کی کوڑی اُن کی اپنی لائی ہوئی تھی جس سے معترض کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ یہ مسدس اُن دنوں اخبارات میں شائع ہوا ہوگا۔ میری بیاض میں درج ہے۔ "بانگِ درا" میں شامل نہیں لیکن مولانا غلام رسول مہر کے "سرودِ رفتہ" میں شائع ہو گیا ہے۔

۱۹۱۸ء کے آخر میں برطانیہ کو اس جنگ میں فتح حاصل ہو گئی۔ اوڈوائر نے فتح کی خوشی میں اور تقریبات کے علاوہ دسمبر ۱۹۱۸ء میں سرکاری پبلسٹی کمیٹی کی طرف سے ایک مشاعرہ بریڈلا ہال لاہور میں منعقد کرایا جس میں پنجاب کے اردو اور پنجابی کے مشہور شعرا اور دہلی سے علاوہ اور شعرا کے سائل اور بیخود بھی شریک ہوئے۔ اوڈوائر کی فرمائش پر چچا جان نے بھی شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت نواب ذوالفقار علی خاں نے کی۔ اپنے کالج کے چند طلبا کے ساتھ میں بھی مشاعرہ سننے گیا تھا۔ بریڈلا ہال میں سامعین کا ایک ہجوم تھا۔ سائل نے اپنے مخصوص ترنم میں ایک نظم پڑھی جس کا مقطع اب تک یاد ہے جو یہ تھا۔

ہوگئیں سائل دعائیں تیری راتوں کی قبول
نائب السلطان کے در تک رسائی ہوگئی

چودھری شہاب دین نے ایک پنجابی نظم پڑھی۔ جنگ میں پہلے کچھ معرکوں میں

جرمنی کو فتح ہوتی رہی تھی۔ اس کی رعایت سے چودھری صاحب نے پنجابی محاورے "سو سنیار دی نے اک لوہار دی" (سو سنار کی ایک لوہار کی) کو اس نظم میں استعمال کیا تھا۔ ہجوم کی کثرت کی وجہ سے ہال میں بہت شور تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ چچا جان کے مشاعرے میں موجود ہونے کی وجہ سے لوگ اُن کو سُننے کے مشتاق تھے اور ہر طرف سے اقبال اقبال کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں جس کی وجہ سے دیگر شعراء کا کلام اچھی طرح سے نہ سُنا جاتا تھا۔ لوگوں کے پیہم اصرار پر نواب ذوالفقار خاں صدر مشاعرہ نے اُن سے اپنا کلام سنانے کی استدعا کی۔ وہ کھڑے ہوئے تو ہال میں سکوت طاری ہو گیا۔ انہوں نے پہلے فارسی کی وہ نظم سنائی جس کا پہلا شعر ہے۔

ہیچ می دانی کہ صورت بند ہستی با فرانس
فکر رنگین و دلِ گرم و شرابِ ناب داد

اور پھر سامعین کی طرف سے اردو اردو کے اصرار پر وہ نظم سنائی جو "شعاعِ آفتاب" کے عنوان سے "بانگِ درا" میں شائع ہوئی ہے۔ دونوں نظمیں ترنم میں پڑھی گئیں۔ اردو نظم کا ترنم تو ایسا دلآویز تھا کہ آج اتنے سالوں کے بعد بھی اُس کا انداز نہیں بھولا۔ ان دونوں نظموں کا جنگِ عظیم میں فتح برطانیہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ شاید ان کی نظم "پنجاب کا جواب"، پر جو اعتراض بعض حلقوں میں کیا گیا۔ وہ ان تک پہنچ چکا تھا۔

انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے ۱۹۲۰ء کے سالانہ اجلاس میں چچا جان نے اپنی وہ نظم سنائی تھی جس کا پہلا شعر یہ ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

میں اُن دنوں لا کالج لاہور میں پڑھتا تھا اور اُس اجلاس میں موجود تھا جس میں یہ نظم پڑھی گئی تھی۔ یہ نظم "بانگِ درا" میں "ارتقا" کے عنوان کے تحت شامل ہے
ایک مرتبہ مسلمانوں کے ایک پبلک جلسہ میں اُن کا فی البدیہہ کہا ہوا ایک شعر بھی سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں اسلامیہ کالج میں پڑھتا

تھا۔ ریواز ہوسٹل کے قریب برکت علی محمڈن ہال میں یہ جلسہ ہوا تھا۔ جس میں شمولیت کے لئے آنے والوں کے لئے ہال میں جگہ ناکافی تھی۔ اس لئے شور اتنا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ منتظمین بہت کوشش کر رہے تھے کہ سامعین خاموش ہوں تو جلسہ کی کارروائی شروع کی جائے۔ لیکن ان کی کوشش ناکام ہو رہی تھی۔ آخر چچا جان سے کہا گیا کہ وہ سامعین کو خاموش ہو جانے کے لئے کہیں۔ وہ کھڑے ہوئے تو شور کچھ کم ہوا۔ انہوں نے یہ شعر پڑھا تو سامعین بالکل خاموش ہو گئے۔

شور اتنا ہے کہ قصّابوں کی ہو جیسے برات
آیئے لاہور کے لوگوں کا جلسہ دیکھئے

باب ۱۸

کیا علامّہ اقبال مالی لحاظ سے "خوشحال" تھے ؟

مجلس ترقیٔ ادب لاہور کے علمی مجلّہ "صحیفہ" کے اقبال نمبر حصّہ اوّل (دسمبر ۱۹۷۳ء) کے ایک مضمون میں چچا جان کے انکم ٹیکس ریکارڈ کی روشنی میں اُن کی زندگی کے آخری ۲۲ سالوں (مالی سال ۱۷-۱۹۱۶ء تا ۳۸-۱۹۳۷ء) کی آمدنی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزے سے صاحبِ مضمون اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "علامّہ اقبال خوش حال تھے" اور اگرچہ "وہ کوئی رئیس الشان نہیں تھے لیکن بہرحال مالی طور پر پریشان بھی نہیں تھے۔" میرا ذاتی علم اور مشاہدہ اور آمدنی کے وہ اعداد و شمار بھی جن پر صاحبِ مضمون نے انحصار کیا ہے اس نتیجے کی تائید نہیں کرتے۔

چچا جان نے اکتوبر ۱۹۰۸ء میں بطورِ ایڈووکیٹ کا کام شروع کیا۔ پہلے دس سالوں میں یعنی ۱۹۱۸ء تک ان کی کل آمدنی کتنی ہوئی اور اُن کی مالی حالت کیسی تھی۔ اس کا حال ان کی اپنی زبانی سُنیے۔ ۱۹۱۸ء میں آفتاب بھائی سینٹ سٹیفنز کالج دہلی میں پڑھتے تھے۔ چچا جان علاوہ اُس ماہانہ رقم کے جو وہ بڑی چچی جان محترمہ کو بھیجتے تھے۔ آفتاب بھائی کو ۳۵/- روپے دیتے تھے۔ ان کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ ۳۵/- روپیہ ماہوار کی بجائے ۵۰/- روپے ماہوار کے حساب سے دو سال کا ۱۲۰۰/- انہیں یکمشت دیا جائے چچا جان

کے پاس یکمشت ادائیگی کے لئے اتنی رقم کہاں تھی۔ سردار چچی کو اس مطالبے کا علم ہوا تو انہوں نے چچا جان کو بتائے بغیر میاں جی کو لکھا کہ ان کا زیور فروخت کر کے یہ مطالبہ پورا کر دیا جائے۔ اس کے جواب میں میاں جی کا جو خط سردار چچی کے نام آیا وہ چچا جان نے پڑھا جس سے انہیں سردار چچی کی پیش کش کا علم ہوا۔ اس پر انہوں نے میاں جی کے نام اپنے ۹ر جون ۱۸ء کے خط میں گزشتہ دس سال کی اپنی آمدنی اور اپنی مالی حالت کا ذکر ان الفاظ میں کیا :-

"آپ کو معلوم ہے کہ گزشتہ دس سال کے عرصہ میں بیس پچیس ہزار میرے ہاتھوں میں آیا مگر یہ سب اپنے اپنے موقع پر مناسب طور پر خرچ ہوا جس کے لئے اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ تاہم اس وقت تک میں ایک عمدہ مکان کرایہ پر نہیں لے سکا۔ نہ مکان کے لئے فرنیچر اور سازوسامان خرید سکا ہوں نہ عمدہ گھوڑا گاڑی خرید سکا ہوں۔ یہ سب لوازمات اس پیشہ کے ہیں۔ اب میں نے تہیّہ کیا ہے کہ جس طرح ہو سکے یہ لوازمات بہم پہنچائے جائیں۔ اب حالات اس قسم کے پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کا بہم پہنچانا لازم اور ضروری ہے میں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر فضل کرے تو اپنی نظم و نثر سے کوئی مالی فائدہ نہ اٹھاؤں گا کہ یہ ایک خداداد قوت ہے۔ جس میں میری محنت کو دخل نہیں۔ خلق اللہ کی خدمت میں اسے صرف ہونا چاہیئے۔ مگر ضروریات سے مجبور ہو کر مجھے اس عہد کے خلاف کرنا پڑا .... اگر کچھ عرصہ بعد میرے ہاتھ میں روپیہ آ گیا تو میں اُسے یکمشت بارہ سو روپیہ دے دونگا۔"

اس اقتباس سے اُن کی پریکٹس کے پہلے دس سالوں کی "خوشحالی" کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ چونکہ ۱۹۱۷ء میں مجھے بھی اسلامیہ کالج لاہور میں ایف اے کے دوسرے سال کی تعلیم کے دوران وہ ۲۵/- ماہوار دیتے تھے۔ اس لئے میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ اُس زمانے میں اُن کا حال "نئی میں آیا گلی میں کھایا" والا تھا۔ ضروریات سے مجبور ہو کر اپنے

اس عہد کے خلاف کرنا کہ اپنی نظم و نثر سے کوئی مالی فائدہ نہ اٹھاؤں گا۔ ان کے "مالی طور پر پریشان نہ ہونے" کی تردید کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اگرچہ طبعاً وہ ملازمت کے حق میں نہ تھے اور انگلستان سے واپس آنے کے بعد محکمۂ تعلیم کی ملازمت سے انکار کر چکے تھے اور وکالت کی پریکٹس ہی کرنا چاہتے تھے[29] لیکن چونکہ اُن دنوں وکالت کے پیشہ سے ضروریات کے لئے کافی رقم کی بانت نہ ہوتی تھی اس لئے ضروریات سے مجبور ہو کر پہلے کچھ عرصہ کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں جز وقتی ملازمت قبول کر لی اور پھر ۱۹۱۰ء میں ریاست حیدر آباد میں حصولِ ملازمت کی کوشش بھی کی جو غالباً مُلکی غیر مُلکی جھگڑے کی وجہ سے (یا انگریزی حکومت کو ناپسند ہونے کی وجہ سے) کامیاب نہ ہوئی[30]

معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۱-۱۲ء میں وہ ضروریات سے اس قدر مجبور تھے کہ سر علی امام کے کہنے پر مہاراجہ الور کے پرائیویٹ سیکریٹری کی آسامی لینے پر بھی آمادہ ہو گئے چنانچہ مہاراجہ سے ملنے الور تشریف لے گئے۔ شاہی مہمان خانہ میں قیام ہوا۔ دوسرے دن صبح ایک حجام کو حجامت بنوانے کے لئے بلوایا۔ وہ اتفاق سے مسلمان تھا اور اُن کے نام سے واقف تھا۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ وہ الور میں ملازمت کے لئے آئے ہیں تو اس نے حجامت بناتے بناتے وہاں کے ناگفتہ بہ حالات سُنا کر مشورہ دیا کہ وہ اس ریاست میں نوکری نہ کریں۔ مہاراجہ سے ملاقات پر معلوم ہوا کہ پرائیویٹ سیکریٹری کی تنخواہ صرف چھ سو روپیہ ہے۔ اُن کا دل تو حجام سے وہاں کے حالات سُن کر الور میں ملازمت کرنے سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ تنخواہ کا سن کر مہاراجہ سے کہا کہ وہ سوچ کر جواب دیں گے اور واپس چلے آئے الور سے متعلق جو یہ اشعار انہوں نے کہے وہ حجام کے بیان کردہ حالات سے متاثر ہو کر کہے گئے معلوم ہوتے ہیں :-

گر فلک در الور انداز د ترا — اے کہ می داری تمیز خوب و زشت

گوئمت در مصرعۂ برجستہ — آنکہ بر قرطاس دل باید نوشت

آدمیت در زمینِ اُو مجو — آسماں ایں دانہ در الور نکشت

کِشت اگر ز آب و ہوا خرسند است — زانکہ خاکش را خرے آمد سرشت

یہ اشعار نہ بانگِ درا میں شائع ہوئے ہیں نہ کسی اور مجموعہ میں لیکن میری بیاض میں موجود ہیں اور اُس کے حوالے سے "روزگارِ فقیر" جلد دوم (۱۹۶۴) میں شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۱۶ء میں بھی اُن کی "خوشحالی" کا یہ حال تھا کہ لاہور کی سخت گرمیوں میں دونوں بیگمات کو ساتھ لے کر پہاڑ پر جانے کی مقدرت نہ تھی اس لئے عدالت کی تعطیلوں میں آرام کے لئے ایک گاؤں میں چلے گئے جہاں بقول اُن کے "ویسی ہی گرمی تھی جیسی لاہور میں مگر آدمیوں کی آمد و رفت نہ تھی" (۵) ۱۹۱۷ء میں بھی ریاست حیدرآباد میں کسی منصب پر تقرر کی توقع تھی جو پوری نہ ہوئی (۶) بقول اُن کے ۱۸ء تک ان کی کل آمدنی بیس پچیس ہزار ہوئی۔ اگر پچیس ہزار بھی ہوئی تو دس سال کی سالانہ اوسط ۲۵۰۰/- اور ماہوار اوسط ۲۰۰/- بنتی ہے وہ زمانہ آج کل کے زمانے سے ہزار سستا سہی، لیکن ایک بیرسٹر کے لئے جس کی اُن دنوں تین بیویاں اور دو جوان بچے تھے۔ جسے رہن سہن کا ایک مناسب معیار بھی قائم رکھنا تھا اور والدین اور دوسرے عزیزوں کے حقوق بھی ادا کرنے تھے یہ ماہوار آمدنی کی اوسط اتنی نہ تھی کہ انہیں "خوشحال" کہا جا سکے۔

۱۹۱۶ء میں چچا جان کو وکالت کرتے آٹھ سال ہو چکے تھے۔ مشہور تو ہو ہی چکے تھے۔ کام بھی کچھ آنے لگا تھا۔ مالی سال ۱۷-۱۹۱۶ء میں پہلی مرتبہ اتنی آمدنی ہوئی جس پر ٹیکس واجب ہوا۔ پھر بتدریج وکالت کی آمدنی میں ترقی ہوتی رہی۔ کتابوں سے بھی آمد ہونے لگی اور یونیورسٹیوں سے بھی۔ مضمون متذکرہ بالا میں اُن کی انکم ٹیکس فائل کے حوالے سے جو آمدنی کے اعداد و شمار دیئے گئے ہیں ان کے مطابق مالی سال ۱۷-۱۹۱۶ء سے وفات تک ۲۲ سالوں میں ان کی کل آمدنی ۱۹۸۸۴۶/- ہوئی (جس میں آخری دو تین سالوں میں بھوپال کا وظیفہ بھی شامل ہے)۔ اس پر انہیں ۹۸۶۱/- انکم ٹیکس ادا کرنا پڑا۔ دوسری شادی سے ۲۴ء میں جاوید اور اُس کے چھ سال بعد ۳۰ء میں منیرہ بانو پیدا ہوئی۔ اُس وقت چچا جان کی عمر ۵۳ سال تھی اور اُن کی ادرچی سردار کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ ایسی حالت میں ایک دانش مند باپ کے لئے ضروری تھا کہ وہ نابالغ بچوں کے لئے کچھ اثاثے کا اور اُن کی رہائش کے لئے ایک مکان کا

انتظام کرے چنانچہ ۳۱ء میں انہوں نے اپنی جمع شدہ آمد میں سے قریباً چالیس ہزار روپیہ بچوں کے لئے ان کے نام بنک میں جمع کرا دیا۔ پھر شروع ۳۴ء میں میو روڈ پر (جو اب علامہ اقبال روڈ کہلاتی ہے) سات کنال کا ایک قطعہ اراضی حکومت کے نزول اراضی کے محکمہ سے ۲۵۰۰۰/- میں نیلام عام میں خرید کر اُس پر ایک مکان (جاوید منزل) تعمیر کرایا جو ۳۵ء کے آخر میں مکمل ہوا۔ مکان کی تعمیر پر ۴۲۰۰۰/- خرچ ہوا۔ اس طرح ایک لاکھ سے زاید روپیہ نابالغ بچوں کے مفاد میں صرف ہو گیا۔ اور ۲۲ سال کی آمدنی میں سے انکم ٹیکس کی ادائیگی اور مکان کی تعمیر اور بچوں کے لئے بنک میں کچھ اثاثہ جمع کرنے کے بعد ان کے ہاتھوں میں سارے اخراجات کے لئے صرف قریباً اسّی ہزار رہا جس کی سالانہ اوسط قریباً ۳۶۰۰/- اور ماہوار اوسط قریباً ۳۰۰/- ہوئی۔ اس محدود رقم میں انہوں نے اپنی محتاط میانہ روی کی بدولت سب اخراجات پورے کئے۔ اس زمانے میں اتنی ماہوار آمد والے کو متوسط حال تو کہہ سکتے ہیں لیکن "خوش حال" نہیں

اُن کی "خوشحالی" کا ایک ثبوت حال ہی میں ماہنامہ "افکار" کراچی نے اپنی نومبر ۸۱ء کی اشاعت میں شائع کیا ہے۔ یہ ایک خط ہے جو انہوں نے ۷؍ اکتوبر ۲۵ء کو حکومت ہند کے پولیٹیکل منسٹر سر جے۔ بی۔ ٹامسن کو لکھا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ انہیں ریاست کشمیر کی سٹیٹ کونسل میں کوئی جگہ دلوانے کی سعی فرمائیں۔ اُن دنوں لاہور ہائی کورٹ میں ایک مسلمان جج کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ چیف جسٹس شادی لعل نے پنجاب کے سر برآوردہ مسلمان وکلا بشمول علامہ اقبال کو نظر انداز کر کے یو۔ پی کے ایک مسلمان بیرسٹر کو مقرر کرا دیا۔ اس پر پنجاب کے مسلم پریس نے شادی لعل کے خلاف زبردست احتجاجی مہم چلائی۔ اگرچہ اس مہم سے چچا جان کا کوئی تعلق نہ تھا نہ وہ کبھی ایسی سازشوں میں ملوث ہوتے تھے لیکن شادی لعل نے انہیں بھی اس احتجاجی مہم کی پشت پناہی کرنے والوں میں شامل سمجھ لیا۔ ان حالات میں اُن کے لئے ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ یہ تو اُن سے "بیگانوں کی ناخوشی" (۷) کا حال تھا۔ اُدھر "اپنوں" میں سے جو بزرگ اُن دنوں پنجاب کی سیاست پر چھائے ہوئے تھے اور اقتدار اعلیٰ تک رسائی رکھتے تھے وہ بھی اُن سے "خفا" ہی تھے ورنہ ان کے لئے ان کو معاش کے فکر سے آزاد

کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ واقف کار حلقے ان بزرگ کی اقبال سے خفگی کی اصل وجہ اُس قطعہ کو سمجھتے تھے جو انہوں نے اپنی پبلک زندگی کے ابتدائی سالوں میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۱۱ء میں "شکوہ" سے پہلے پڑھ کر سنایا۔ سمجھا جاتا تھا کہ قطعہ میں دراصل ان بزرگ کے اوصاف بیان کئے گئے تھے اور انہوں نے اس ہجو کے لئے باوجود اقبال کی تلافی کی کوشش کے انہیں کبھی دل سے معاف نہ کیا۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے یہ قطعہ اس باب کے آخر میں نقل کر دیا گیا ہے۔ اس بااختیار بزرگ کے گروپ کی" اقبال دشمنی" نہ سہی لیکن انہیں نظر انداز کرنے کی پالیسی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ بیگم جہاں آرا شاہنواز مرحومہ نے اپنی انگریزی تصنیف "فادر اینڈ ڈاٹر" (باپ اور بیٹی) میں اس کا ذکر واشگاف الفاظ میں کیا ہے۔ یہ حالات تھے جن میں وہ مذکرہ بالا خط لکھنے پر مجبور ہوئے۔ سیاست میں جو" زہر ہلاہل کو کبھی قند نہ کہہ سکے" اُس سے اپنوں اور بیگانوں کا ناخوش رہنا اور خود اُس کا "تہی کیسہ" رہنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہاں "تہی کیسہ اور خورسند" رہنا ضرور تعجب کی بات ہے (۷)

اس سلسلہ میں ان کی وصیّت محررہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء پر نظر ڈالنا بھی ضروری ہے اُس میں جو چیزیں اُس وقت اُن کی ذاتی ملکیت بیان کی گئیں وہ تھیں کچھ کتابیں جو اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری کو دیئے جانے کا ارشاد فرمایا پہننے کے کپڑے جو غربا میں تقسیم کئے جانے کی ہدایت فرمائی۔ ان کے علاوہ دو قالین، دری، صوفہ اور کرسیاں۔ علاوہ اس رقم کے جو نابالغ بچوں کے نام ان کے لئے جمع تھی۔ زرنقد کے نام سے کچھ بھی نہ تھا۔ کیا ایک خوشحال شخص کے گھر سے بعد مرنے کے یہی سامان نکلتا ہے۔

صاحب مضمون تسلیم کرتے ہیں کہ علامہ اقبال کو آخری برسوں میں بیماری کے اخراجات کے سبب کچھ دقت کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ اُن کی "کچھ دقت" کا اندازہ ان خطوط سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے ۳۵ء میں سر راس مسعود کو لکھے اور جو اقبال نامہ حصّہ اول میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں" اگر مجھے حیاتِ مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیشکش مسلمانان عالم کو

نہیں کر سکتا۔" (۸)

حقیقت یہی ہے کہ "اسپ تازی" ہونے کے باوجود وہ عمر بھر "مجروح بزیر پالاں رہے۔" انہوں نے اپنی حالت اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے اس شعر میں بیان کی ہے

تیری بندہ پروری سے میرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں سے نہ شکایت زمانہ

اگر شعر کے پہلے مصرع کی گہرائی میں جائیں اور "میرے دن گزر رہے ہیں" پر غور کریں تو کہنے والے کی خوشحالی سامنے آجاتی ہے۔ دوسرا مصرع بھی ایک داستان لئے ہوئے ہے لیکن اس کی تفصیل بیان کرنا اب بیکار ہے۔

قطعہ

(انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۱۱ء میں "شکوہ" سے پہلے سنایا گیا)

کل ملا مجھ سے جو اقبال تو پوچھا میں نے
عامل روزہ ہے تو اور نہ پابند نماز

تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکرِ حجاز

جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے
تیرا اندازِ تملّق بھی سراپا اعجاز

کبھی ایراں کے لئے ہو جو دعا کا جلسہ
عذر تیرا ہے کہ ہے مری طبیعت ناساز

ختم تقریر تری مدحتِ سرکار پہ ہے
فکر روشن ہے ترا موجدِ آئینِ نیاز

درِ حکام بھی ہے تجھ کو مقامِ محمود
پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلفِ ایاز

اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز

نظر آجاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن
اثر وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز

دست پرورد ترے ملک کے اخبار بھی ہیں
چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز

اس پہ طرّہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے
تیرے مینائے سخن میں ہے شرابِ شیراز

جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی
تجھ کو لازم ہے کہ ہو اُٹھ کے شریکِ تگ و تاز

غمِ صیّاد نہیں اور پر و بال بھی ہیں
پھر سبب کیا ہے نہیں تجھ کو دماغِ پرواز

عاقبت منزل ما وادیٔ خاموشان است
حالیا غُلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

سن کے کہنے لگا اقبال بجا فرمایا ‫ تنگ مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز
مجھ میں اوصافِ ضروری تو ہیں موجود مگر ‫ ہے کمی ایک کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

نوٹ :- یہ قطعہ " بانگ درا " میں " نصیحت " کے زیر عنوان شائع ہوا ہے اس میں قطعہ کے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ کو بدل دیا گیا اور آخری تین شعر حذف کر دیئے گئے چوتھا شعر بھی حذف کر دیا گیا۔ اس میں ایک جلسہ کا ذکر تھا جس میں شامل نہ ہو سکنے کے لئے واقعی یہ عذر کیا گیا تھا۔ حذف شدہ اشعار " سرود رفتہ " میں شائع ہو گئے ہیں ۔ پورا قطعہ میری بیاض میں ہے ۔

---

۵ یہ خط اُن خطوط میں شامل ہے جو اس کتاب میں شائع کیے جا رہے ہیں۔

۶ " بلاشبہ چند روز قبل میں نے علی گڑھ کے شعبۂ فلسفہ کی پروفیسری اور گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ تاریخ کی پروفیسری قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے ۔ میں قیدِ ملازمت سے آزاد رہنا چاہتا ہوں (خط ۹ اپریل ۱۹۰۹ء بنام مس عطیہ فیضی ۔ اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۱۱۶)

" لفٹننٹ گورنر لاہور گورنمنٹ کالج کی پروفیسری کے لئے سیکریٹری آف سٹیٹ سے میری سفارش کرنے پر آمادہ تھے لیکن میں نے اپنے میلانِ طبع کے خلاف اس اسامی کی امیدواری سے دست برداری کا فیصلہ کر لیا ہے ۔ حالات مقتضی ہیں کہ میں ہر مسئلہ میں مالی نقطۂ نگاہ کو ملحوظ رکھوں اگرچہ اسی نقطۂ نگاہ کے خلاف میں نے چند سال قبل بغاوت برپا کر رکھی تھی ۔ اللہ کے بھروسہ پر میں نے وکالت ہی کو اپنا پیشہ اختیار کئے رکھنے کا فیصلہ کیا ہے ۔"

(خط مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۹ء بنام مس عطیہ فیضی ۔ اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۱۲۷-۱۲۶)

۳ے "میرا سفر حیدرآباد بلا مقصد نہ تھا۔ عند الملاقات عرض کروں گا۔ خاندانِ حیدری سے ملاقات ہی مقصودِ سفر نہ تھا۔"

(خط مورخہ ۳۰ مارچ ۱۹۱۰ء بنام مس عطیہ فیضی۔ اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۱۳۵)

"میری سیاحتِ حیدرآباد سے متعلق کوئی نتائج اخذ نہ کیجئے۔ مثلاً یہ کہ اعلیٰحضرت حضور نظام میری قدر افزائی فرما رہے ہیں۔ اس معاملہ میں خود میری تحریر کا انتظار فرمایئے۔ میں نے اتنا سفر اس زمانے میں جب کہ میرے پاس قطعاً گنجائش نہ تھی۔ صرف ملاقاتوں کے لئے ہی اختیار نہیں کیا تھا۔" (خط مورخہ ۷ اپریل ۱۹۱۰ء بنام مس عطیہ فیضی۔ اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۱۴۰)

۴ے "ذکر اقبال"۔ سالک (۱۹۵۵) صفحات ۸۴-۸۳

۵ے "پہاڑ جانے کے لئے سامان موجود تھا۔ مگر صرف اسی قدر کہ تنہا جا سکوں۔ تنہا جا کر ایک پرفضا مقام میں آرام کرنا اور اہل و عیال کو گرمی میں چھوڑ جانا بعید از مروّت معلوم ہوا۔"

(خط مورخہ یکم نومبر ۱۶ء بنام سرکشن پرشاد اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۱۷۲)

۶ے "یہاں پنجاب اور یو۔ پی کے اخباروں میں چرچا ہوا تو دور دور سے مبارکباد کے تار بھی آگئے اور اضلاع پنجاب کے اہل مقدمات جن کے مقدمات میرے سپرد ہیں ان کو گونہ پریشانی ہوئی۔ بہر حال مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ۔" (خط مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۷ء بنام سرکشن پرشاد اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۱۸۴)

۷ے
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پُرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند (بالِ جبریل)

۸ے اقبال نامہ حصہ اول صفحات ۳۵۸-۳۵۷

باب ۱۹

کیا علامہ اقبال سرد مہر اور "طُوریخِ پیرہن" تھے ؟

چچا جان کے متعلق بعض عزیزوں کا یہ تاثر تھا کہ ملنے پر ان کی طرف سے گرم جوشی کی بجائے سرد مہری کا احساس ہوتا ہے۔ ممکن ہے بعض اور ملنے والوں کو بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہو۔ خود جاوید نے اُن کے متعلق اپنے لڑکپن کا تاثر اس طرح بیان کیا ہے :۔

"اپنی زندگی میں ابا جان نے مجھے شاذ ہی کوئی ایسا موقعہ دیا ہو گا جس سے میں اُن کی شفقت یا اس اُلفت کا اندازہ لگا سکتا جو انہیں میری ذات سے تھی۔ والدین اکثر بچوں کو پیار سے بھینچا کرتے ہیں۔ انہیں گلے سے لگاتے ہیں۔ انہیں چومتے ہیں۔ مگر مجھے آپ کے خدوخال سے کبھی اس قسم کی شفقتِ پدری کا احساس نہ ہوا۔ بظاہر وہ کم گو اور سرد مہر دکھائی دیتے تھے۔"

اس میں شک نہیں کہ بظاہر وہ ایسے ہی دکھائی دیتے تھے لیکن اُن کے متعلق اپنے بچوں سے شفقت کے فقدان کا تاثر درست نہ تھا۔ وہ اپنے عزیزوں کے لئے دل میں بے پایاں محبت اور شفقت کا جذبہ رکھتے تھے۔ اگرچہ اُس جذبہ کا برملا اظہار اُس صورت میں نہ ہوتا تھا جس کا ذکر جاوید نے کیا ہے۔ بچوں اور عزیزوں کے ساتھ کم گوئی اور لیئے دیئے رہنا کچھ اُن ہی پر موقوف نہ تھا۔ گھر کے دوسرے بزرگوں یعنی میاں جی اور ابا جان کا

بھی یہی طرزِ عمل تھا اور ان کے بعد کی نسل میں سے بھی میں نے تو خاندان کے کسی مرد بشمول جاوید کو اپنے بچوں کو "پیار سے بھینچتے۔ گلے لگاتے اور چومتے" نہیں دیکھا۔ اپنے بچوں اور عزیزوں سے محبت اور دوستوں سے تعلق خاطر کے جذبات کو دل ہی دل میں رکھنا اور ان جذبات کے برملا اظہار میں حجاب محسوس کرنا ہمارے خاندانی کردار کا خاصہ معلوم ہوتا ہے جسے خامی بھی کہا جا سکتا ہے۔ شاید ہمارے اجداد میں سے کسی ایک کے جین (GENE) سے یہ حجاب پشت در پشت منتقل ہوتا آ رہا ہے۔ واللہ اعلم۔ لیکن یہ حجاب صرف "پیار سے بھینچنے، گلے لگانے اور چومنے" یا اظہارِ محبت کے اور اسی قبیل کے مظاہر تک محدود تھا۔ عملاً ان کی محبت اور شفقت کا اظہار کئی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتا رہتا تھا۔ مشتے نمونہ از خروارے دو چار باتیں جو اب تک یاد ہیں بیان کر دیتا ہوں۔

۱۔ چچا جان کے تعلیم کے لئے انگلستان جانے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ میری عمر اس وقت قریباً پانچ سال ہو گی۔ ابا جان جہاں تعینات تھے چچا جان اُن سے ملنے وہاں آئے ہوئے تھے۔ ایک دن وہ ابا جان کے کمرے میں فرش پر بیٹھے کچھ لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف تھے۔ میرا چھوٹا بھائی امتیاز مرحوم جو ان دنوں کوئی ڈیڑھ سال کا ہو گا ان کے پاس پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ بھابھی جی دوڑی گئیں تو دیکھا کہ سیاہی کی دوات فرش پر الٹی پڑی ہے۔ چچا جان کے کچھ کاغذات اور امتیاز کے ہاتھ سیاہی سے لت پت ہیں۔ امتیاز صاحب دھاڑ رہے ہیں اور چچا جان اُسے گود میں اٹھائے چپ کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بھابھی جی نے اُسے اپنی گود میں لے کر تادیباً مارنا چاہا تو انہیں روک دیا "بانگ درا" کی نظم "طفل شیر خوار" اسی واقعہ کی یادگار ہے۔ یہ نظم فروری ۱۹۰۴ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ "بانگ درا" میں اس کے صرف ۱۲ اشعار دیئے گئے ہیں۔ مکمل نظم میری بیاض میں درج ہے جسے اس باب کے آخر میں نقل کیا جا رہا ہے۔

۲۔ جن دنوں میں آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتا تھا چچا جان تعطیلات میں سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی۔ وہ چھت پر اپنے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ پاس ہی میرا چھوٹا بھائی امتیاز مرحوم کھیل رہا تھا۔ اتنے میں ایک کٹی ہوئی

پتنگ آئی جس کی ڈور چھت پر گھسٹ رہی تھی ۔ امتیاز ڈور پکڑنے کے لئے لپکا لیکن وہ اس کے ہاتھ نہ آئی ۔ اس کی مایوسی کو دیکھ کر چچا جان کڑی کمان کے تیر کی طرح ننگے پاؤں برساتی کی سیڑھیاں چڑھ گئے اور اس کی چھت پر ڈور کو جا لیا ۔ پھر اُسے نیچے لاکر ڈور امتیاز کے ہاتھ میں دے دی ۔ اس کی باچھیں کھل گئیں ۔ لیکن اس وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ پتنگ لے کر امتیاز کو زیادہ خوشی ہوئی یا اس کی خواہش پوری کر کے چچا جان کو ۔

۳ ۔ جن دنوں آفتاب بھائی انگلستان میں تعلیم پا رہے تھے ۔ کسی ذریعہ سے اُن کی علالت کی خبر ملی ۔ اُن کی ناک کے اندر پھنسی نکل آئی تھی ۔ اگرچہ اُن سے کبیدہ خاطر تھے لیکن سردار چچی کا بیان ہے کہ اس خبر سے رات بھر بیکل رہے ۔ دوسرے دن اپنے کسی جاننے والے سے بذریعہ تار دریافت حال کیا اور جب تک اطمینان بخش جواب نہ آگیا بڑے بے چین رہے ۔

۴ ۔ ۱۹۱۷ء یا ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے میں اسلامیہ کالج میں پڑھتا تھا اور ریواز ہوسٹل میں رہتا تھا ۔ چچا جان ہفتے عشرے میں ایک دفعہ علی بخش کو میری خیریت دریافت کرنے کے لئے ہوسٹل بھیجا کرتے تھے ۔ ایک دفعہ میری انگشت شہادت پر بڑی تکلیف دہ پھنسی دو ٹلو نکل آئی ۔ علی بخش حسب معمول خیریت معلوم کرنے آیا تو مجھے اس تکلیف سے صاحب فراش پایا ۔ اُس نے جا کر رپورٹ کی تو اُسے اُلٹے پاؤں واپس بھیجا کہ مجھے ہوسٹل سے گھر لے آئے ۔ اُن دنوں چچی سردار اور چچی مختار دونوں سیالکوٹ گئی ہوئی تھیں اور چچا جان گھر میں اکیلے تھے ۔ رات کو اوپر والی منزل میں انہی کے کمرے میں میرا بستر لگایا گیا ۔ درد کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آ رہی تھی ۔ انہوں نے کسی لحاف یا تو شک سے پرانی روئی نکالی ۔ علی بخش جا چکا تھا ۔ آگ کون جلاتا ۔ لالٹین پر روئی گرم کر کے میری انگلی پر ٹکور شروع کی ۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رکھا جب تک سینک سے درد میں کچھ کمی ہوئی اور میں سو گیا ۔ صبح ہی صبح اُٹھ کر منشی طاہر دین کو جو اسی احاطہ میں رہتے تھے بلوایا اور ان سے میری تکلیف کا ذکر کیا ۔ انہوں نے انگلی کو دیکھ کر کہا کہ پھنسی بالکل پک گئی ہے ۔ بس صرف سوئی چبھونے کی دیر ہے

سب مواد نکل کر آرام آجائے گا۔ مجھے اُن کے ساتھ ڈاکٹر محمد حسین کے پاس بھیجا۔ وہ معائنہ کر کے مجھے اپنے آپریشن کے کمرے میں لے گئے چونکہ منشی جی نے صرف سوئی چبھونے کا ذکر کیا تھا۔ میں نے آپریشن ٹیبل پر بیٹھ کر اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور کہا "چھوٹے شیخ جی۔ ذرا لیٹ جاؤ۔ میں اُنگلی نے چیرا دینا ایں "(میں نے انگلی پر چیرا دینا ہے) یہ سن کر خوف سے میرا بُرا حال ہوگیا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ آپریشن کی میز پر لیٹ گیا۔ ان دنوں شاید لوکل اینستھیزیا ایجاد نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے نشتر سنبھال ایک گہرا چیرا دیا جس سے سخت تکلیف ہوئی لیکن سارا مواد نکل گیا۔ روزانہ پٹی ہوتی رہی۔ چار پانچ دن اُن کے ہاں قیام کے بعد" جس میں اُٹھے بار ہا ان کی عیادت کے مزے" میں ہوسٹل واپس آگیا۔ آج تک انگشت شہادت پر اس آپریشن کا اور دل پر ان کی شفقت کا نشان ثبت ہے۔

۵۔ باوجود اس کے کہ بقول جاوید اس کو چچا جان کے" خدوخال سے کبھی شفقت پدری کا احساس نہ ہوا" اس سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ لڑکپن میں ایک دن کھیلتے میں ٹھوکر لگنے سے وہ صحن کے اینٹوں کے فرش پر منہ کے بل گر گیا۔ جس سے اُس کا ہونٹ کٹ گیا اور اس سے خون بہنے لگا۔ چچا جان شور سن کر اندر آئے اور اس کا خون بہتا دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔ سردار چچی جان مذاق میں کہا کرتی تھیں کہ ان کا دل 'چڑی (چڑیا) کا دل ہے۔ خون دیکھ کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

۶۔ بچوں میں لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں اُن کی شفقت کا مورد ہوتی تھیں۔ بڑی چچی جان سے اُن کی پہلی اولاد آپا معراج مرحومہ سے ان کی محبت کا اعتراف تو بڑی چچی جان کے بہنوئی خواجہ فیروزالدین بیرسٹر کو بھی تھا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ گرمیوں کی تعطیلات میں سیالکوٹ آتے تو میری منجھلی بہن عنایت بیگم کے ساتھ جو ان دنوں دو تین سال کی ہوگی گھنٹوں کھیلتے۔ لیٹ کر اس کو اپنے پیٹ پر بٹھا لیتے اور پوچھتے تمہارا نام کیا ہے۔ وہ توتلی زبان میں کہتی "لیت" تو خوب ہنستے۔ بار بار یہی سوال اور جواب دہرایا جاتا۔

۷۔ منیرہ بانو سے تو اتنی محبت تھی کہ اس کے رونے کی آواز سن کر بے چین ہو جاتے

تھے۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کا واقعہ ہے میں ایک دن چچی سردار کے پاس بیٹھا ہوا تھا اتنے
میں منیرہ جو اُن دنوں چار پانچ سال کی ہو گی کھیلتے کھیلتے ٹھُمکتی بنی ہوئی سے اندر آ گئی۔
منیرہ کو بالوں میں کنگھی کرانے سے بڑی چڑ تھی۔ سردار چچی نے بالوں میں کنگھی کرنے کے
لئے اُسے بلایا۔ وہ اُن سے بچنے کیلئے باہر بھاگنے لگی تو چچی جان نے پکڑ کر بٹھا لیا اور اس کے
بالوں کو کنگھی کرنے لگیں۔ اس پر منیرہ نے اونچی آواز سے رونا شروع کر دیا۔ چچا جان اس
کے رونے کی آواز سن کر گھبرائے ہوئے اندر آ گئے اور اس کے رونے کا سبب پوچھا۔ چچی جان
نے کہا بالوں میں کنگھی کرانا نہیں چاہتی۔ چچا جان نے کہا وہ کنگھی کرانا نہیں چاہتی تو تم زبردستی
کنگھی کر کے اُسے مت رلاؤ۔ میں اس کے رونے کی آواز نہیں سن سکتا۔ دل کو تکلیف ہوتی ہے۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا دل "دلِ آگاہ" ہونے کے باوجود "الماس کا ٹکڑا" نہ تھا۔ اور "بظاہر کم گو اور سرد مہر" ہونے کے باوجود اپنی اولاد اور دوسرے عزیزوں کے لئے اُن کا دل شفقت سے معمور تھا۔

اپنے بچوں اور عزیزوں سے شفقت اور محبت اپنی جگہ لیکن ان کی بیجا ضد اور ہٹ دھرمی کے آگے ہتھیار ڈال دینا ان کا طریق نہ تھا۔ اس سلسلہ میں اپنا ایک واقعہ یاد آتا ہے جو بیان کر دیتا ہوں کیونکہ اس سے ان کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ ۱۹۱۹ء میں میں نے بی اے کا امتحان پاس کیا تو چچا جان کی رائے تھی کہ مجھے مزید تعلیم کے لئے لا کالج میں داخلہ لینا چاہیئے۔ میری طبیعت قانون کی طرف راغب نہ تھی اور میں ایم اے میں داخل ہونا چاہتا تھا لیکن ان کی رائے کے پیشِ نظر اپنے کو لا کالج میں داخلہ لینے پر مجبور پا رہا تھا۔ ستمبر ۱۹۱۹ء کے شروع میں وہ کچھ دنوں کے لئے سیالکوٹ تشریف لائے۔ اُن کے قیام کے دوران میں نے "بھوک ہڑتال" سے ان کی رائے تبدیل کرانے کی ایک طفلانہ کوشش کی۔ اُن کے سامنے تو "بھوک ہڑتال" کے اعلان کی جرأت نہ تھی۔ مستورات پر ہڑتال کا رعب ڈال کر میں اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ چچا جان کو خبر ہوئی تو ارشاد ہوا کہ اس کی بھوک ہڑتال کو بالکل نظر انداز کیا جائے اور کوئی اُس کے کمرے کی طرف رخ بھی نہ کرے۔" گرمیوں کا پہاڑ سا دن مشکل سے کٹا۔ دن بھر کسی نے ہمیں گھاس نہ ڈالی۔ عشق کی طرح بھوک ہڑتال کا معاملہ بھی

"آساں نمود اوّل دلے انتہا دشُوار تھا" معلوم ہوا۔ رات ہوئی۔ گھر کے سب لوگ کھانے سے فارغ ہو کر چھت پر سونے چلے گئے۔ ماں کا دل کب تک صبر کرتا۔ چھت پر جانے سے پہلے "بھابھی جی" ایک خوان میں میرے لئے کھانا اور پانی لے کر آئیں۔ دروازہ کھٹکھٹا کر کہا "تمھارا کھانا رکھ چلی ہوں بھوک لگے تو کھا لینا" بھوک سے تو نڈھال ہو رہا تھا وہ چلی گئیں، تو دروازہ کھول خوان کمرے میں لے آیا اور خوب سیر ہو کر کھایا۔ خالی برتن پھر باہر رکھ دیئے۔ گرمیوں کی رات کھلی چھت کی بجائے بند کمرے میں "کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی"۔ صبح ناشتے کے بعد چچا جان میرے کمرے میں تشریف لائے۔ یہ کمرہ اپر فلور میں ہے۔ اس میں جانے کے لئے ایک لکڑی کا زینہ طے کرنا ہوتا ہے وہ اپنی عادت کے مطابق ایسے دبے پاؤں زینہ چڑھے کہ آہٹ تک نہ ہوئی۔ ان کا چہرہ دروازے کے شیشوں میں نظر آیا تو میں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ انہوں نے آتے ہی اپنے مخصوص تبسّم کے ساتھ فرمایا۔ "یہ تم گاندھی کے چیلے کب سے بنے ہو" پھر دیر تک قانون کی تعلیم کے فوائد بیان کرتے رہے۔ اتنے میں بھابھی جی، دونوں چچیاں اور پھوپھی کریم بی بی بھی آ گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ بھابھی جی نے کل رات میرے لئے کھانا میرے کمرے کے دروازے پر رکھ دینے کی خبر چچا جان کو ضرور دی ہوگی اور دروازے پر رکھے ہوئے خالی برتنوں نے میری بھوک ہڑتال کا بھانڈا پھوڑ دیا ہوگا، اس لئے میں بہت خفّت محسوس کر رہا تھا۔ اتنے میں چچا جان جانے کے لئے اُٹھے۔ جاتے جاتے فرمایا "بھابھی جی۔ آج ناشتہ میں پوریاں بڑی مزے دار تھیں۔ اعجاز کو بھی کھلائیں۔ اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔" کل سے میرے کچھ نہ کھانے کی بات انہوں نے صرف میری خفّت مٹانے اور مجھے یہ باور کرانے کے لئے کہی کہ انہیں کل رات میرے کھانا کھا لینے کا کوئی علم نہیں۔ بات تو ذرا سی تھی لیکن اس کی تہہ میں وہ "سلیقہ دلنوازی کا" کارفرما تھا جو ہر "مسلمان کے لہو" میں ہو نہ ہو خود اُن کے لہو میں ضرور تھا۔

یہاں مجھے اُن کی اصابت رائے کا بھی اعتراف کرنا چاہیئے۔ قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے جو فوائد انہوں نے بیان فرمائے۔ وہ سب صحیح ثابت ہوئے۔ میرے کیریئر کے

ہر مرحلہ پر قانون کی ڈگری جو میں نے لاء کالج میں داخل ہو کر حاصل کر لی بڑے کام آئی جس کی تفصیل یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

۱؎ "مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا" (اقبال)

طفلِ شیر خوار

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو
مہرباں ہوں میں مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو

ایسی چیزوں کو جو تو سمجھا ہے سامانِ خوشی
کیا کسی دُکھ درد کے مکتب کی ابجد ہے یہی

درد سے اے تو اسیرِ حلقۂ گردابِ درد
ہوتی جائے گی تجھے آگاہی اسبابِ درد

پھر پڑا روئے گا اے نو واردِ اقلیمِ غم
چُبھ نہ جائے دیکھنا باریک ہے نوکِ قلم

آہ کیوں دُکھ دینے والی شے سے تجھکو پیار ہے
کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے

اس چمکتی چیز کی خاطر یہ بیتابی ہے کیا
اب سیاہی کے گرانے کی تجھے سوجھی ہے کیا

گیند ہے تیری کہاں چینی کی بلی ہے کدھر
وہ ذرا سا جانور ٹوٹا ہوا ہے جس کا سر

ہے تجھے کچھ فرش پر اس کو گراتے میں مزا
ٹوٹ جائے آئینہ میرا تجھے پروا ہے کیا

تالیوں کا ہو کوئی گچھا کہ سونے کی گھڑی
مل گئی جو شے تجھے تیرا کھلونا بن گئی

جو تری آنکھوں کے آگے ہو ہوس انگیز ہے
یعنی ہر شے توسنِ ادراک کو مہمیز ہے

پھوٹتی ہے فصلِ گل کی جس طرح پہلے کلی
مُنہ پہ ڈالے سبز پتی کی نقابِ عارضی

یوں ترے ہنسنے سے ہے دل میں تمنا کی نمود
اے گُل نشگفتۂ صحنِ چمن زارِ وجود

ہاتھ کی جنبش میں طرزِ دید میں پوشیدہ ہے
تیری صورت آرزو بھی تیری نوزائیدہ ہے

تیرا آئینہ تھا آزادِ غبارِ آرزو
وصلِ ہستی سے چمک اٹھا شرارِ آرزو

زندگانی ہے تیری آزادِ قیدِ امتیاز
تیری آنکھوں پر ہویدا ہے مگر قدرت کا راز

جب کسی شے پر بگڑ کر مجھ سے چلاتا ہے تو
کیا تماشا ہے ردی کاغذ سے من جاتا ہے تو

آہ اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی تیرا
تو تلوّن آشنا میں بھی تلوّن آشنا

عارضی لذت کا شیدائی ہوں چلّاتا ہوں میں　　　جلد آجاتا ہے غصہ جلد من جاتا ہوں میں
میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حُسن ظاہری　　　کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی میری
تیری صورت گاہ گریاں گاہ خنداں میں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجوان ہوں طفلِ ناداں میں بھی ہوں

باب ۲۰

کیا علامہ اقبال تفضیلی عقیدہ رکھتے تھے؟

میری سکول کی طالب علمی کے زمانے میں ایک صاحب کبھی کبھی میاں جی سے ملنے آیا کرتے تھے۔ وجیہہ صورت خشخشی داڑھی گھنی مونچھیں، صاف ستھرا لباس۔ گفتگو لچھے دار شاید کسی خالہ کے ناطے میاں جی کی اُن سے قرابت داری تھی۔ سیلانی طبع، کبھی کبھی مہینوں کے لئے شہر سے غائب ہو جاتے۔ مشہور تھا کہ ریاستوں میں جواہرات کی تجارت کے لئے جاتے ہیں۔ لیکن اس تجارت کے منفعت بخش ہونے کے آثار کسی کو کبھی نظر نہیں آئے کیونکہ اُن کی مالی حالت ایسی ویسی ہی تھی۔ میاں جی حسبِ توفیق سلوک کرتے رہتے تھے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے ان کا نام حیدر تھا۔ بے جی نے مذاق میں انہیں "لال سوداگر" کا نام دیا ہوا تھا اور ہمارے ہاں ان کا ذکر اسی نام سے ہوتا تھا۔ وہ شیعہ عقائد رکھتے تھے۔ محرم کے دنوں میں تعزیہ اور ذوالجناح کے جلوس کے ساتھ انہیں ماتم کرتے میں نے دیکھا ہے۔ بڑے پُر وقار طریقے سے آہستہ آہستہ سینہ کوبی کرتے تھے۔

ایک سال عدالتوں کی تعطیلوں میں چچا جان حسبِ معمول سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ رات کے وقت جب چھت پر تینوں بزرگ اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے اور ہم لڑکوں نے اُنھیں مٹھیاں بھرنے کی ڈیوٹی سنبھال لی تو ابا جان نے چچا جان سے کہا آج ڈاکٹر میر حیدر کی

دوکان پر" لال سوداگر" بھی آیا ہوا تھا۔ تمہارا ذکر آیا تو کہنے لگا اقبال تفضیلی ہے اور تائید میں تمہارا یہ شعر پڑھا۔

ہے اُس کی طبیعت میں تشیُّع بھی ذرا سا
تفضیلِ علیؓ ہم نے سُنی اس کی زبانی

چچا جان نے کہا" لال سوداگر" کو ممکن ہے جواہرات کی پرکھ ہو لیکن معلوم ہوتا ہے شعر کی سمجھ بالکل نہیں۔ اگر ہوتی تو سمجھ جاتے کہ اس شعر میں بلکہ نظم کے اس حصہ میں جس میں یہ شعر ہے میں نے اپنے متعلق دوسروں کے خیالات بیان کئے ہیں نہ کہ اپنے۔ مزید کہا کہ رسولِ مقبولؐ کے اہل بیت کے ساتھ محبت تو ہر مسلمان کا جزوِ ایمان ہونا چاہیئے اور مجھے اُن سے محبت میں شدت کا بھی اعتراف ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ خلفائے راشدین میں ایک کو دوسرے پر فضیلت کا عقیدہ رکھوں۔

چچا جان نے جو وضاحت فرمائی وہ اپنی جگہ درست ہے لیکن جو لوگ یہ سمجھے کہ "ہے اُس کی طبیعت میں تشیُّع بھی ذرا سا" وہ بھی ایسا سمجھنے میں موردِ الزام نہیں ہو سکتے کیونکہ اُن کے ابتدائی کلام کے بعض اشعار سے ایسی غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہو سکتا تھا۔ مثلاً جنوری ۱۹۰۵ء میں مخزن میں شائع ہونے والی فارسی نظم" سپاس جناب امیرؑ"۔ اس کے علاوہ ایک ابتدائی غزل کا مقطع ہے :۔

پوچھتے کیا ہو مذہب اقبالؔ　　یہ گنہ گار بُوترابی ہے

ایک اور نامکمل غزل کا شعر ہے :۔

سُنا ہے صورتِ سینا نجف میں بھی اے دل
کوئی مقام ہے غش کھا کے گرنے والوں کا

ایک اور نامکمل غزل کا مقطع ہے :۔

ہمیشہ وردِ زباں ہے علیؓ کا نام اقبالؔ
کہ پیاس روح کی بجھتی ہے اِس نگینے سے

۱۹۰۲ء کی ایک نظم کا آخری شعر ہے :۔

فیض اقبال ہے اُسی در کا
بندۂ شاہِ لافتیٰ ہوں میں

۱۹۰۳ء کی نظم "برگِ گل" میں جو مخزن میں شائع ہوئی ایک شعر ہے:
ہوں مُرید خاندانِ خفتۂ خاکِ نجف
موجِ دریا آپ لے جائیگی ساحل پر مجھے

ایک اور غزل کا مقطع ہے
بعض اصحابِ ثلاثہ سے نہیں اقبال کو
دق مگر اک خارجی سے آکے مولائی ہوا

یہ چھ اشعار "بانگِ درا" میں تو شامل نہیں لیکن میری بیاض میں درج ہیں اور اُس کے حوالے سے پہلے پانچ اشعار "روزگارِ فقیر" حصہ دوم (۱۹۶۴ء) میں شائع ہو چکے ہیں۔ موخرالذکر چھٹا شعر "رختِ سفر" اور مولانا مہر کے "سرودِ رفتہ" میں شائع ہو چکا ہے۔

حضرت علیؓ سے اس محبت و عقیدت کی بنیاد تو ان کا عشقِ رسولؐ ہی تھا جس کے متعلق کہا ہے۔ "تا مرا افتاد بر رویت نظر۔ از اب و امّ گشتۂ محبوب تر" اس پر حضرت علیؓ کی ذاتی خوبیوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اس کے علاوہ اثر قبول کرنے والی ابتدائی عمر میں مولانا میر حسن کے خاندان سے گہرے تعلقات اور دن رات اُن کے ہاں اٹھنے بیٹھنے نے بھی حضرت علیؓ کے ساتھ محبت کے تعلق کو اور زیادہ استوار کیا ہوگا۔ مولانا خود تو سُنّی تھے بلکہ نیچری اور سرسیّد کے معتقدین میں سے تھے لیکن اُن کے خاندان میں شیعیت کا اثر بھی تھا۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے سیّد محمد ذکی کی اہلیہ تو غالی شیعہ تھیں۔ محرم میں اُن کے ہاں مجلسیں ہوتیں۔ ذوالجناح کا جلوس نکلتا تو گھوڑا اُن کے ہاں لایا جاتا۔ مکان کی ڈیوڑھی میں وہ خود دودھ میں بھگویا ہوا دانہ گھوڑے کو کھلاتیں۔ گلاب کے عرق سے اس کے سُم دھوئے جاتے اور زور شور سے ماتم کیا جاتا۔ ایک حساس نوجوان کے تحت الشعور میں ظلم کی داستانیں سنتے سنتے مظلوم خاندان سے گہری عقیدت ہو جانا تعجب انگیز نہیں۔ لیکن اس محبت اور عقیدت کے باوجود جس کا اظہار جگہ جگہ اُن کے کلام میں کیا گیا ہے وہ جیسا کہ انھوں نے اپنی

وصیت محررہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں تحریر فرمایا ہے عقائد دینی میں سلف کے پیرو تھے۔ نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد تھے۔ عملی اعتبار سے حضرت ابوحنیفہ کے مقلد تھے۔

کچھ سال ہوئے ایک صاحب سید احسن عمرانی کی ایک کتاب[3] جو لاہور سے شائع ہوئی دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ چچا جان دراصل شیعہ تھے اور اپنے آپ کو سنی کہنے میں تقیہ کئے ہوئے تھے۔ بہر حال تفضیلی ضرور تھے۔ مصنف نے اپنے اس نظریہ کی بنیاد اُن کے بعض اشعار پر رکھی ہے۔ ایسا کرنے میں مصنف یہ بھول گئے کہ حُبِّ آلِ محمدؐ و مدح آلِ محمدؐ میں سُنّی حضرات بالخصوص شعراشیعہ حضرات سے کسی طرح کم نہیں بلکہ شاید دو قدم آگے ہی ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ نے تو اپنے ایک شعر میں یہاں تک کہا ہے۔ کہ "اگر حُبِّ علیؓ رفض ہے تو دونوں عالم گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں" اور "سر داد نداد دست در دست یزید" والا مشہور شعر کیا کسی شیعہ شاعر کا ہے۔ اگر چچا جان کے کلام میں حضرت علیؓ اور آلِ رسولؐ کی تعریف و توصیف کے اشعار پائے جاتے ہیں تو پہلے تین خلفائے راشدینؓ کی تعریف و توصیف کے اشعار بھی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تو اپنی مشہور نظم صدیقؓ[4] میں "رفیقِ نبوت" اور "مردِ وفا سرشت" کہا ہے اور اُن کا یہ شعر بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق ہی ہے۔

ہمّتِ اوکشتِ ملّت را چو ابر
ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر

کیا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق ایسی رائے کسی شیعہ کی ہو سکتی ہے۔ اپنی خوش فہمی میں ان پر تقیہ کا اتہام لگانا بہت بڑا ظلم ہے۔

---

[1] یہ نظم "باقیاتِ اقبال" (۱۹۵۲ء) اور "سرود رفتہ" (۱۹۵۹ء) میں شائع ہوگئی ہے

[2] لافتیٰ الا علیؓ لاسیف الا ذوالفقار

[3] "اقبال در مدح محمدؐ و آلِ محمدؐ" (حق برادرز۔ نئی انارکلی لاہور)

[4] اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار

لے آیا اپنے ساتھ وہ مرد وفا سرشت

ہر چیز جس سے چشم جہاں میں ہو اعتبار

یہاں یہ بیان کر دینا شاید دلچسپی کا باعث ہو کہ جب یہ نظم پہلی بار شائع ہوئی تو مندرجہ بالا پہلے شعر کا مصرع ثانی یہ تھا۔

"شاہد ہے جس کی مہر و وفا پر حرا کی غار"

چنانچہ میری بیاض میں یہ مصرع اسی طرح لکھا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مہر و وفا پر تو "غار ثور" شاہد تھی۔ معلوم ہوتا ہے بے دھیانی میں شعر کی روانی میں "حرا کی غار" لکھا گیا۔ بعد میں جب اس غلطی کا احساس ہوا تو مصرع بدل دیا گیا۔

باب ۲۱

جاٹ اور علامہ اقبال کی شاعری

غالباً ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے۔ چچا جان کے فارسی کلام کا تیسرا مجموعہ "پیام مشرق" جو جرمن شاعر گوئٹے کے جواب میں لکھا گیا۔ اشاعت کے لئے زیرِ ترتیب تھا۔ ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں انہیں لائل پور (حال فیصل آباد) یا شاید جھنگ جانے کا اتفاق ہوا۔ ریل کے سفر میں شیخ عبد القادر اور چودھری ظفر اللہ ان کے ہم سفر تھے۔ وہ بھی اُسی مقدمہ میں دوسرے فریق کی طرف سے پیروی کے لئے جا رہے تھے۔ چودھری ظفر اللہ خان نے مجھے بتایا کہ دورانِ سفر علامہ نے "پیام مشرق" کی "پیش کش" کے وہ اشعار سنائے جن میں علامہ نے اپنا اور گوئٹے کا مقابلہ "او کہ بود و من کیم" کہہ کر کیا ہے۔ وہ اشعار جو "پیامِ مشرق" میں شامل ہیں یہ تھے:

اُو چمن زادے چمن پروردۂ — من دمیدم از زمین مُردۂ

اُو چو بلبل در چمن "فردوسِ گوش" — من بہ صحرا چوں جرس گرمِ خروش

ہر دو دانائے ضمیرِ کائنات — ہر دو پیغامِ حیات اندر ممات

ہر دو خنجر صبح خند۔ آئینہ فام — اُو برہنہ من ہنوز اندر نیام

ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار — زادۂ دریائے ناپیدا کنار

اُوز شوخی در تہہ قلزم تپید　　تا گریبانِ صدف را بر درید
من بہ آغوشِ صدف تابم ہنوز　　در ضمیرِ بحر نایابم ہنوز
از ہنر سرمایہ دارم کردہ اند　　در دیارِ ہند خوارم کردہ اند

ان اشعار کے علاوہ ایک شعر اور بھی تھا جو "پیامِ مشرق" میں شائع نہیں ہوا۔ وہ شعر یہ تھا:-

اُوز محبوبی عزیزِ کشورے　　من چو یوسف بندۂ سوداگرے

دو ایک اشعار غلامی کی مذمت میں بھی تھے جن میں سے چودھری صاحب کو صرف یہ شعر یاد رہ گیا۔

از غلامی ضعفِ پیری در بدن　　از غلامی روح گردد بارِ تن

چودھری صاحب نے فرمایا کہ ان اشعار سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے علامہؒ کی خدمت میں ان کا شاگرد ہونے کے ناطے استدعا کی کہ "پیامِ مشرق" کی اشاعت اول کے لئے کاغذ پیش کرنے کی سعادت انہیں عطا کی جائے۔ علامہؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا تم جاٹوں کو میری شاعری سے کچھ مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ "اسرارِ خودی" کے پہلے ایڈیشن کے لئے کاغذ شہاب دین[۲] نے پیش کیا تھا۔ اب "پیامِ مشرق" کے پہلے ایڈیشن کے لئے کاغذ تم پیش کر رہے ہو۔

---

[۱] گوئٹے جرمنی کی ایک ریاست کا وزیر تھا۔

[۲] چودھری سر شہاب دین وکیل ہائیکورٹ جو ایک عرصہ تک پنجاب اسمبلی کے سپیکر رہے۔ وہ خود بھی پنجابی میں شعر کہتے تھے۔

باب ۲۲

برکاتِ لامحدود

میرے ہاں پہلی لڑکی پیدا ہوئی تو میں نے حاضر ہو کر چچا جان سے اس کا نام تجویز کرنے کی استدعا کی۔ انہوں نے گیارہ نام لکھ کر دیئے کہ ان میں سے جو نام "بھائی صاحب" کو پسند ہو وہ رکھ لیا جائے۔ جو نام تجویز کئے وہ یہ ہیں: منیرہ بیگم، منیرہ شرقیہ، قرۃ العین ارجمند بیگم، عاصمہ، فروغ فاطمہ، کوثری بیگم، انوری بیگم، اسماء، سلیمیٰ، خجستہ بیگم۔ ابا جان کو یہ نام بتلائے تو انہیں "عاصمہ" پسند آیا اس لئے عاصمہ نام رکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے چچا جان کو ان ناموں میں سے اوّل الذکر نام زیادہ پسند تھا۔ کیونکہ جب جاوید کے بعد ان کے اپنے ہاں لڑکی کی ولادت ہوئی تو اس کا نام منیرہ رکھا گیا۔ اُن کی تحریر کردہ ناموں کی فہرست میرے پاس محفوظ ہے

متذکرہ بالا ناموں کے علاوہ "نادرہ" بھی اُن کا پسندیدہ نام تھا۔ اُن کے دوست سر راس مسعود کے ہاں لڑکی کی ولادت ہوئی تو اس کا نام "نادرہ" تجویز کیا اور اس کی پیدائش کا حسب ذیل تاریخی قطعہ بھی کہا:

راس مسعودِ جلیل القدر کو ۔۔۔ جو کہ اصل و نسل میں مجدود ہے
یادگارِ سیدِ والا گہر ۔۔۔ نورِ چشمِ سیدِ محمود ہے

راحتِ جان و جگر دُختر ملی — شُکر خالق منّت معبود ہے
خانداں میں ایک لڑکی کا وجود — باعثِ برکاتِ لا محدود ہے

کس قدر برجستہ ہے تاریخ بھی
باسعادت دُخترِ مسعُود ہے

اُسی سال چند ماہ بعد میرے ہاں چوتھی لڑکی پیدا ہوئی تو لڑکی کی ولادت "باعثِ برکاتِ لا محدود" ہونے کی نویداِن الفاظ میں دی ۔

"آج بھائی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ تمھارے ہاں ایک اور لڑکی ہوئی ہے۔ لڑکیوں کی افزائش رزق کی افزائش ہے۔ کیا عجب خدا تعالیٰ تمھارے رزق میں بھی توسیع کر دے ۔"

اور اللہ تعالےٰ نے اپنے کمال فضل سے رزق میں توسیع کے اسباب پیدا کر دیئے الحمدللہ

لہ میری ایک لڑکی کا نام بھی انہوں نے نادرہ رکھا تھا۔

باب ۲۳

پیراں نمی پرند مُریداں می پرانند

چچا جان کی وفات کے بعد اُن کے متعلق کئی روایات اخبارات اور مختلف تصانیف میں چھپتی رہتی ہیں۔ اُن میں سے بعض روایات درست بھی ہوں گی لیکن وضعی روایات کی بھی کمی نہیں۔ نا صورتحال سے ایک مشہور پیر طریقت کے ایک مرید باصفا نے بھی اپنے مرشد کی بزرگی ثابت کرنے کے لئے چچا جان کا نام استعمال کیا ہے حالانکہ ان بزرگ کی بزرگی ایسے سارٹیفیکیٹ کی محتاج بھی نہ تھی۔ چند سال ہوئے اس مرید کی یہ روایت لاہور کے ایک روزنامہ کے "اقبال نمبر" میں شائع ہوئی کہ ایک دن پیر صاحب موصوف کی مجلس میں علامہ بھی حاضر تھے۔ پیر صاحب نے کسی سلسلہ میں علامہ کا ایک شعر پڑھا۔ اس پر علامہ نے فرمایا میری نجات کیلئے یہی کافی ہے کہ حضور کو میرا ایک شعر یاد ہے ان مرید صاحب کو پیر صاحب موصوف کے متعلق علامہ کی رائے کا یقیناً علم نہ تھا۔ ورنہ وہ یہ روایت بیان کرنے کی غلطی نہ کرتے۔ چچا جان کی وفات سے کئی سال پہلے کی بات ہے ان کے ایک معتقد دوست نے پیر صاحب کے متعلق اُن کی رائے دریافت کی۔ وہ صاحب پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور پیر صاحب کی طرف سے انہیں ایک گونہ بے اعتنائی کا احساس ہوا تھا۔ چچا جان نے جواب دیا "وہ بڑے ہوشیار آدمی ہیں اور پیری مریدی کے فن سے خوب واقف ہیں بے اعتنائی ان لوگوں کی بالعموم مصنوعی ہوتی ہے اور اس میں سینکڑوں اغراض پوشیدہ ہوتی ہیں جس طرح وہ آپ سے پیش آئے اُس طرزِ عمل کا مفہوم میں بخوبی سمجھتا ہوں۔"

باب ۲۴

ایک تمنا جو پوری نہ ہوئی

چچا جان "میرم در حجاز" کی آرزو بھی رکھتے تھے اور رحمۃ اللعلمینؐ کے حضورؐ "مرقدے درسایۂ دیوار بخش"، کی التجا بھی کی تھی لیکن زندگی میں بھی زیارت روضۂ رسولؐ کی شدید خواہش تھی۔ ۱۹۱۱ء کے ایک خط میں لسان العصر اکبر الہ آبادی کو لکھتے ہیں۔ "خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارت روضۂ رسولؐ نصیب کرے۔ مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھئے کب جوان ہوتی ہے (رلہ)" زیارت کی آرزو تو عمر گزرنے کے ساتھ جواں تر ہوتی رہی لیکن شروع سے ہی ان کا یہ احساس عناں گیر رہا کہ "زندگی را از عمل ساماں نبود۔ پس مرا ایں آرزو شایاں نبود۔" ۱۹۰۳ء میں بھی جب خاندان پر ایک ابتلا کے سلسلہ میں ایک منظوم التجا خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر پڑھے جانے کے لئے خواجہ حسن نظامی کو بھیجی اُس میں بھی حضرتؒ کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کیا۔

اُس بڑی سرکارؐ کے قابل میری فریاد ہے

چل حضوری میں شہ یثربؐ کی تو لے کر مجھے

میرا کیا مُنہ ہے کہ اُس سرکارؐ میں جاؤں مگر

تیرے جیسا مل گیا تقدیر سے رہبر مجھے

۱۹۳۱ء کے آخر میں دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں انگلستان سے واپس آتے ہوئے وہ موتمر عالم اسلامی کے جلسے میں شمولیت کے لئے فلسطین گئے۔ واپس آئے تو ایک دن آبا جان نے ان سے کہا " اقبال فلسطین گئے تھے لگے ہاتھوں روضہ نبویؐ پر بھی حاضری دے آتے۔" اس کے جواب میں پہلے تو آبا جان کو اورنگ آباد شہنشاہ عالمگیرؒ کے مزار پر دونوں بھائیوں کے جانے کا واقعہ یاد دلایا (۲ے) ان دنوں مزار کے گرد ایک قنات لگی ہوئی تھی۔ آبا جان نے اپنی داڑھی غیر مشرع ہونے کی وجہ سے احتراماً قنات کے اندر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ واقعہ یاد دلا کر فرمایا :۔

" بھائی صاحب میں کس منہ سے روضۂ اقدس پر حاضری دیتا۔" پھر فرمایا کہ انگلستان کا سفر حکومت ہند کے خرچہ پر کیا گیا تھا۔ انگلستان سے واپسی میں موتمر اسلامی کے جلسہ میں شمولیت کے لئے فلسطین جانا ہوا۔ وہاں خیال تو آیا کہ دیار حبیبؐ قریب ہے زیارت کرتا چلوں لیکن یہ احساس سدراہ ہوا کہ حضورؐ کے در پہ حاضری کے لئے گھر سے صرف اسی نیّت سے اور اپنے خرچ پر سفر کرنا چاہیئے۔ دنیوی مقصد کے سفر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لگے ہاتھوں حضورؐ کے روضہ پر حاضری کے لئے جانا مجھے آداب محبت کے خلاف محسوس ہوا اللہ تعالیٰ توفیق دے تو حج کی نیت بھی ہے اور زیارت روضۂ رسولؐ کی بھی۔

سیاسی لحاظ سے وہ زمانہ مسلم اُمّت کے لئے بڑا ہی پُر آشوب زمانہ تھا۔ مسلمانوں کا آپس کا انتشار، غیر مسلموں کی ریشہ دوانیاں انگریز کی کانگریس سے ساز باز۔ سب طرف "تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں" کا سماں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ " بیڑا ہے تباہی کے قریب آن لگا ہے۔" اور راہنماؤں کا یہ حال کہ جناح صاحب بددل ہو کر انگلستان میں مقیم ہو گئے تھے۔ مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی، عملاً بے کار ہو گئی تھیں۔ مولانا ابوالکلام مولانا حسین احمد مدنی اور کئی اور اُن جیسے جیّد علماء کانگریس کیمپ میں تھے۔ فعّال سیاسی جماعتوں میں سے احرارِ اسلام، خاکسار، سرخ پوش اُن کے ہم نوا تھے۔ اسلام اور عالم اسلام کی سربلندی کی فکر میں "عطا ہوئی تھی جسے روز و شب کی بے تابی" وہ ان حالات میں کیسے خاموش رہتا۔ بقول مولانا سالک اُن دنوں " اقبال آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت

سے مسلمانوں کی پوری سیاست کے جہاز کا ناخدا بنا ہوا تھا (۳)

" ہوا تھی گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے تھے اندازِ خسروانہ "

لیکن یہ چراغ وہ اپنے خونِ دل سے جلا رہے تھے۔ اُدھر احیائے ملّتِ اسلامیہ کے لئے بھی اُن کے دل میں ایک تڑپ تھی۔ وہ اسلام کی دینی و دنیوی شوکت و عظمت کے آرزو مند تھے۔ وہ اُس شبیر کے پھر ہوشیار ہونے کی تمنّا رکھتے تھے ایک زمانے میں "نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا۔" (۸) اُنکی صحت تو عرصہ سے خراب چلی آ رہی تھی۔ کوئی نہ کوئی عارضہ لاحق رہتا تھا ہنگامۂ سیاست کی کوفت بھی صحت پر اثر انداز ہوئی۔ اپریل ۳۷ء میں دہلی جا کر حکیم نابینا صاحب کو نبض دکھائی اور ان کا علاج شروع ہوا۔ انہوں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ داہنی آنکھ کی بینائی تو بچپن سے ہی کمزور تھی۔ اب دوسری آنکھ میں بھی موتیا اُترنا شروع ہو گیا۔ ۳۷ء کے شروع میں موتیا کی شدت کی وجہ سے معالجوں نے لکھنے پڑھنے کی بھی ممانعت کر دی۔ صحت کا تو یہ عالم تھا لیکن حج کعبہ اور زیارت مدینہ کی خواہش شدّت اختیار کر رہی تھی۔ پروگرام یہ بنا رہے تھے کہ عراق کے راستے جائیں تاکہ اور مقدس مقامات کی زیارت بھی ہو جائے۔ آج کل کی طرح اُن دنوں ہوائی سفر کی سہولت تو میّسر نہ تھی۔ ایک صحت مند انسان کے لئے بھی سفر خاصا دشوار ہوتا تھا اور عراق کا راستہ تو اور بھی دشوار گزار تھا۔ وہ اپنے احباب کے ذریعے عراق کے راستے سفر کے متعلق تحقیق کرا رہے تھے۔ مخدوم الملک سیّد غلام میراں شاہ کو اُن سے عقیدت تھی۔ وہ اس سال حج کا عزم کئے ہوئے تھے۔ اور چچا جان کو ساتھ چلنے پر آمادہ کر رہے تھے۔ لیکن معالجوں نے صحت کی اس حالت میں سفر سے بالکل منع کر دیا۔

دسمبر ۳۷ء کے آخری دنوں میں چچا جان کے ارشاد (۴) کی تعمیل میں دہلی سے سیالکوٹ جاتے ہوئے میں لاہور ٹھہر گیا تا کہ جاوید اور منیرہ کو اپنے ساتھ سیالکوٹ لے جاسکوں۔ وزیر آباد سے پھوپھی زینب اور پھوپھا غلام رسول بھی آئے ہوئے تھے۔ چچا جان حج پر نہ جاسکنے کی وجہ سے بڑے دل گرفتہ تھے۔ پھوپھی جی نے کہا " عام صحت کی خرابی کے علاوہ آپ کی آنکھ

میں بھی تو موتیا اتر رہا ہے۔ ایسی حالت میں آپ حج کا سفر کیسے کر سکتے ہیں۔ آپریشن کے بعد اگلے سال چلے جائیگا۔" اس پر بڑے دردانگیز لہجے میں فرمایا " آنکھوں کا کیا ہے۔ آخر اندھے بھی تو حج کرہی آتے ہیں۔" اتنا کہا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہ تیسرا موقعہ تھا کہ میں نے انہیں آنسو بہاتے دیکھا ورنہ عام طور پر بڑے سے بڑے صدمہ پر بھی ان کی آنکھیں بار بار اشک عنابی نہ ہوتی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں انہیں یہ پختہ احساس ہو گیا تھا کہ اب یہ سعادت ان کے حصے میں نہیں آئے گی۔ یہاں یہ ذکر کردوں کہ ان کی وفات کے ۲۴ سال بعد اُن کی بیٹی عزیزہ منیرہ بانو نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے میری بیٹی عاصمہ کی معیت میں حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ رسولؐ کی سعادت حاصل کرلی۔ الحمد للہ

گول میز کانفرنس میں چچا جان کی شرکت کا ذکر آیا ہے تو " ذکر اقبال " کی ایک اتفاقی غلطی کی بھی تصحیح کر دی جائے اس میں لکھا ہے " جب میاں سر فضل حسین نے جو وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے تیسری گول میز کانفرنس کے ممبروں میں علامہ کا نام بھی تجویز کیا تو حکومت بادلِ ناخواستہ ہی سہی لیکن علامہ کو دعوت دینے پر آمادہ ہو گئی چنانچہ آپ ۱۷ اکتوبر ۳۲ء کو لاہور سے بہ عزم یورپ روانہ ہو گئے (۵)" امر واقعہ یہ ہے کہ تیسری گول میز کانفرنس کے مندوبین کے انتخاب کے وقت سر فضل حسین چار مہینے کی رخصت پر تھے اور ان کی جگہ چودھری محمد ظفر اللہ خاں قائم مقام ممبر تھے اور انہوں نے ہی چچا جان کا نام تجویز کیا تھا۔ اور وزیر ہند کے اختلاف کرنے پر بہ اصرار منظور کرایا تھا۔ وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری " تحدیث نعمت " میں لکھتے ہیں " تیسری گول میز کانفرنس کے مندوبین کا انتخاب اُن دنوں ہوا جب میں میاں سر فضل حسین صاحب کی رخصت کے سلسلہ میں قائم مقام ممبر وائسرائے کونسل تھا۔ وائسرائے کی کونسل کے اجلاس میں میں نے جو نام مسلم وفد کی رکنیت کے لئے پیش کئے ان میں سے ایک تو وائسرائے نے فوراً بلا تامل رد کر دیا (۶) باقی ناموں پر میرے رفقا نے اتفاق کیا اور اُن کے نام غیر مسلم نمائندگان کے ناموں کے ساتھ وزیر ہند کی خدمت میں بھیج دیئے گئے۔ وزیر ہند نے میرے تجویز کردہ ناموں میں سے دو کے متعلق اختلاف کیا۔ (قائد اعظم) مسٹر جناح کے متعلق تو لکھا " وہ ہر بات پر تنقید تو بہت

کڑی کرتے ہیں لیکن کوئی اثباتی حل پیش نہیں کرتے۔ اب انہوں نے مستقل طور پر لندن میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ ہندوستان کے معاملات کے ساتھ ان کا براہِ راست تعلق نہیں رہا۔" علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کے متعلق لکھا" وہ دوسری گول میز کانفرنس میں تشریف لائے تھے لیکن انہوں نے کانفرنس کے دوران میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔" میں نے دونوں اصحاب کی شمولیت پر پر زور اصرار کیا اور وائسرائے نے میری معروضات وزیر ہند کی خدمت میں بھیج دیں۔ بالآخر وہ ڈاکٹر صاحب کو شامل کرنے پر تو رضامند ہو گئے لیکن (قائدِ اعظم) مسٹر جناح صاحب کے متعلق میری سعی ناکام رہی (۷)"

اس واقعہ کا مجھے ذاتی علم ہے اور سرکاری ریکارڈ سے بھی اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

۱؎ اقبال نامہ حصہ دوم۔ صفحہ ۳۶

۲؎ یہ واقعہ مارچ ۱۹۱۰ء کا ہے۔ ان دنوں میرے ابا جان چھاؤنی دیولالی میں جو بمبئی سے چند میل کے فاصلہ پر ہے تعینات تھے۔ چچا جان کسی سلسلہ میں حیدرآباد (دکن گئے تھے۔ واپسی پر شہنشاہ عالمگیرؒ کے مزار پہ حاضری دی۔ ابا جان بھی دیولالی سے آ کر اُن کے ساتھ تھے۔

۳؎ "ذکر اقبال" صفحہ ۱۷۵

۴؎ میرے نام چچا جان کا خط محرّرہ یکم دسمبر ۱۹۳۷ء

۵؎ "ذکر اقبال"، صفحہ ۱۷۸

۶؎ یہ بھی ایک دلچسپ قصّہ ہے لیکن یہاں اس کی تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں۔

۷؎ "تحدیث نعمت" (۱۹۷۱) صفحہ ۳۱۴

۸؎ "نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا۔ سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا" مارچ ۱۹۰۷ء (بانگ درا طبع ۲۱ صفحہ ۱۵۰) علامہ کی وفات کے بعد ایک نہیں کئی صحرائی شیر "ہوشیار" ہوئے ہیں لیکن اس زمانے کی سلطنت روما (امریکہ) کو الٹنے کی بجائے فی الحال تو ایک دوسرے کی سلطنت کو الٹنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ احیائے اسلام کا کام اُس "خیر الماکرین" نے شاید شیروں کی بجائے ایک "مورِ ناتواں" سے لینے کا منصوبہ بنایا ہو جسے آجکل ہر طرف سے کچلنے کی کوششیں ہو رہی ہیں لیکن خود علامہ نے فرمایا ہے "سفینۂ برگِ گل بنا لیگا قافلہ مورِ ناتواں کا ؛ ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا۔" انشاءاللہ (بانگ درا طبع ۲۱ صفحہ ۱۵۱)

باب ۲۵

علامہ اقبال کی وُسعتِ مطالعہ

تعلیم کے لئے انگلستان جانے سے پہلے بھی چچا جان کا انگریزی زبان بالخصوص اس زبان کے شعرا کی کتابوں کا مطالعہ کافی وسیع معلوم ہوتا ہے ۔ یہ بات ان کتابوں سے ظاہر ہوتی ہے جو ۱۹۰۵ء میں انگلستان جاتے ہوئے وہ سیالکوٹ اپنے آبائی گھر میں چھوڑ گئے ۔ واپس آنے کے بعد انہوں نے لاہور میں مستقل سکونت اختیار کر لی لیکن یہ کتابیں سیالکوٹ میں ہی رہیں ۔ مکان کی تو تعمیر ہونے لگی تو ابا جان نے کہا کہ اپنی کتابیں لاہور لے جائیں ۔ فرمایا مجھے اب ان کی ضرورت نہیں ۔ یہیں رہنے دیں ۔ مجھے بھی کتابیں پڑھنے کا نہ سہی جمع کرنے کا شوق ضرور ہے ۔ کالج کی تعلیم کے زمانہ میں اِن کتابوں کا کوئی دعویدار نہ پایا تو میں نے انہیں اپنی تحویل میں لے لیا ۔ تب سے یہ میرے پاس ہیں ۔ ان کی تعداد تئیس (۲۳) ہے ۔ دو ایک کے علاوہ سب شاعری کے موضوع پر ہیں ۔ ۱۹۶۶ء میں "اقبال ڈے" کے موقعہ پر نیشنل میوزیم آف پاکستان کراچی نے ایک اقبال نمائش کا انتظام کیا تھا ۔ اِن کتابوں میں سے اُنیس (۱۹) کتابیں اس نمائش میں شامل تھیں ۔ نیشنل میوزیم کی شائع کردہ فہرست نوادرات میں ان کا اندراج ہے ۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے اِن تئیس کتابوں کی فہرست اس کتاب میں شامل ہے ۔ اب یہ سب کتابیں میوزیم مذکور کی تحویل میں ہیں ۔

یہ سب کتابیں اُنیسویں صدی عیسوی کے آخری نصف کی شائع شدہ ہیں۔ جس جس کتاب کا سنِ اشاعت کتاب میں دیا ہوا ہے وہ فہرست میں درج کر دیا گیا ہے۔ کچھ کتابوں کا سنِ اشاعت ان میں درج نہیں اگرچہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی ۱۹۰۰ء سے پہلے کی شائع شدہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان دنوں انگلستان کے پبلشروں سے بھی ایسی فروگزاشت ہو جاتی تھی کہ کتاب میں اس کا سنِ اشاعت مفقود ہو۔

ان کتابوں میں سے فہرست کی آخری ۵ کتابیں (۱۷ تا ۲۱) چچا جان کے استاد مسٹر ٹامس آرنلڈ کی تھیں جو انہوں نے ان کو دے دی ہوں گی۔ فہرست میں کتاب نمبر ۱۷ کے فلائی لیف پر خوش خط زنانہ تحریر میں یہ عبارت لکھی ہے :۔

"FOR TOM FROM SOFHIE & EDITH - APRIL 19TH 1884"

ٹام (TOM) سے مراد چچا جان کے "کلیم زرد ڈیناے علم" یعنی ان کے استاد مسٹر ٹامس آرنلڈ ہیں۔ صوفی اور ایڈتھ ان کی کوئی قرابت دار ہوں گی جنہوں نے یہ کتاب ۱۹ اپریل ۱۸۸۴ء کو انہیں تحفتاً دی ہوگی۔ اسی طرح فہرست کی کتاب نمبر ۱۹ پر حسبِ ذیل تحریر درج ہے :۔

"T.W. ARNOLD 1883 FROM (پڑھا نہیں جاتا) ARNOLD & F.S ARNOLD" یہ کتاب بھی ۱۸۸۳ء میں مسٹر ٹامس آرنلڈ کے ان دو عزیزوں نے انہیں تحفتاً دی۔ فہرست کی کتاب نمبر ۱۸ کے فلائی لیف پر مسٹر ٹامس آرنلڈ کے عزیز غالباً بھائی کا نام "F. S. ARNOLD - BEDFORD 1898" لکھا ہوا ہے۔ فہرست کی کتاب نمبر ۲۰ پر مسٹر ٹامس آرنلڈ کے اپنے دستخط ثبت ہیں اور فہرست کی کتاب نمبر ۲۱ کے خود مسٹر آرنلڈ مترجم ہیں۔

ان کتابوں میں سے دو کتابیں (فہرست میں نمبر ۲۲، ۲۳) بُدھ مت کے بانی حضرت گوتم بُدھ کی زندگی اور تعلیم کے متعلق ہیں۔ اوّل الذکر کے مصنف یا مترجم سر ایڈون آرنلڈ ہیں جو مسٹر ٹامس آرنلڈ کے کوئی عزیز ہوں گے۔ یہ دونوں کتابیں بھی چچا جان کو ان کے استاد مسٹر آرنلڈ نے ہی دی ہوں گی۔ سر ایڈون آرنلڈ مہاتما گوتم بدھ کی تعلیم سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں اور خود مسٹر ٹامس آرنلڈ بھی متاثر ہوں گے۔ شاید یہ اپنے استاد کا ہی

اثر ہو کر چچا جان نے مہاتما گوتم بدھ کو اپنے حسب ذیل اشعار میں "گوہر یک دانہ" کہا ہے :-

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پرواہ نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی
آہ بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمع گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

LIST OF BOOKS

1. The Poets, of the Nineteenth Century (R.A. Wilmot) - 1857.
2. Ode on Immor tality (Wordsworth) 1885.
3. The Poetical Works of Longfellow 1882.
4. The Extent Odes of Pindar (Translated into English by E. Myers) 2nd Edition 1884
5. English Pastorals (E. K. Chambers).
6. English Satires (O. Smeaton).
7. The Complete Poetical Works (Robert Burns) 1887.
8. The New England Poets (W.C. Lawton) 1898.
9. A. Handbook to the Works of Robert Browning Seventh Edition (Mrs. S. Orr) 1896
10. The Tragedies of Sophocles (E.H. Plamptre) 1878.
11. The Tragedies of Aeschylos (E. H. Plamptre) 1881.

12-13. The Peotical Works of Lord Houghton (Two Volumes) 1876.

14. The Light of Asia or the Great Renunciation being the Life and teachings of Gautama as told in Verse by an Indian Buddhist. (Sir Edwin Arnold) 1897.
15. The Poetical Works of James Beattie and the Poems and Plays of Oliver Goldsmith.
16. Selections from Walter Savage Landor (S. Colvin) 1883.
17. The Eve of ST. Agnes (John Keats).
18. Sonnets from the Portugese (Elizabeth B. Browning).
19. The Wisdom and religion of A. German Philospher being selections from the Writings of G.W.F. Hegal (E.S. Haldane) 1897.
20. Buddhism being a sketch of the Life and Teachings of Gautama, the Buddha (T.W. Rhys David) 1886.
21. The sacred Poetry of Early Religions (Dean Church) Two Lectures on (1) the Vedas and (2) the Psalms 1874.
22. A Selection from Pascals Thoughts (Translated by H.L. Sidney Lear).
23. The Little Flowers of Saint Francis (Translated out of the Italian by T.W. Arnold)

باب ۲۶

انیسویں صدی کے آخر کا سستا زمانہ

اِن دنوں اگر کہا جائے کہ ایک زمانہ میں لاہور کے ایک کالج کے مُعلّم اور اُس کے ایک نفر ملازم کی گذر بسر اوسطاً چار آنے یومیہ میں ہو جاتی تھی تو سُننے والوں کو مشکل سے یقین آئے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جون ۱۸۹۹ئ میں جب چچا جان ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج میں پڑھانے تھے اور بھاٹی دروازہ کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ ان کے باورچی خانے کا خرچ اوسطاً چار پانچ آنے یومیہ سے تجاوز نہ کرتا تھا۔ اس "خطیر" رقم میں قریباً روزانہ سبزی گوشت بھی پکتا۔ دودھ دہی بھی آتا اور گاہے گاہے چچا جان کا من بھاتا کھاجا آم بھی۔ اس بیان کی تائید چچا جان کی ایک تحریر سے ہوتی ہے جو اتفاقاً میرے ہاتھ لگی پچھلے باب میں جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن میں ایک ذرا بڑی تقطیع کی منقش جلد والی کتاب "THE POETS OF THE NINETEENTH CENTURY" ہے۔ ایک دن ورق گردانی کے لئے اُسے کھولا تو اس میں کچھ اوراق رکھے ہوئے ملے جن کے انیس ۱۹ صفحات پر چچا جان کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے کچھ نوٹ اِن موضوعات پر ہیں (۱) علم النفس والقویٰ (۲) انگلستان کی حالت اٹھارویں صدی میں (۱۸۱۵ تا ۱۸۸۸) (۳) سلطنت نو آبادی ہائے انگلستان (۴) بستیاں آباد کرنے کا پرانا اور نیا طریقہ (۵)

تجارت اور جنگ ۔ظاہر ہے یہ نوٹ ان لیکچروں کے ہیں جو اورینٹل کالج کے طالب علموں کو دیئے گئے۔ آخری ورق پر "DAILY KITCHEN ACCOUNT" کے عنوان کے تحت ۷ جون تا ۱۲ جون ۹۹ء کا باورچی خانے کا حساب اُن کا قلمی لکھا ہوا ہے جس سے بیان مندکرہ بالا کی تائید ہوتی ہے ۔اس کی نقل ذیل میں دی جارہی ہے ۔

باورچی خانے کے حساب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جون ۹۹ء تک علی بخش اُن کے پاس ملازم نہ ہوئے تھے کیونکہ باورچی کا نام محمد حسین لکھا ہے ۔

حساب نقل کرنے سے پہلے قارئین پر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اُن دنوں ایک روپیہ کے سولہ آنے اور ایک آنے کے چار پیسے ہوتے تھے ۔حساب میں درج ـــ ر سے مراد ایک پیسہ، ۰ر سے مراد دو پیسے ـ ۔ر سے مراد تین پیسے اور ار سے مراد ایک آنہ ہے۔ اسی طرح ۱ـ ر سے مراد ایک آنہ ایک پیسہ ۱۰ر سے مراد ایک آنہ دو پیسے ۱ـ۔ر سے مراد ایک آنہ تین پیسے اور ۲ر سے مراد دو آنے ہے۔ عصہ سے مراد ایک روپیہ اور للعہ سے مراد چار روپے ہے۔

حساب کی نقل اصل کے مطابق کی گئی ہے ۔بعض تاریخوں کے ہندسے انگریزی کے ہندسے ہیں مثلاً ۱۵ تا ۱۲ جون۔ عام طور پر وہ اپنے اردو زبان کے خطوط میں انگریزی ہندسے کبھی استعمال نہ کرتے تھے ۔انگریزی زبان میں خط لکھتے تو تاریخ انگریزی ہندسوں میں لکھتے ۔

چچا جان کے قلمی لیکچروں کے یہ نوٹ اب پاکستان نیشنل میوزیم کراچی کی تحویل میں دے دیئے گئے ہیں۔

DAILY KITCHEN ACCOUNT

۷ جون ۹۹ء

۷ جون ۹۹ء (In hand Md HUSSAIN) دال ۰ر ـ ر املی ۰ر گوشت ار ار دال دہی ۰ر لہسن ۰ر دھنیا اور سولف ـ ر (پڑھا نہیں جاتا) ۰ر

کل میزان ؁ ۰ر

۹ جون ۱ ، گوشت ۔ دال چنا ۔ ر دہی ،ر سبزی ۔ ر گھڑا د کونڈا (رقم درج نہیں لیکن ۲ ر چاہیئے میزان ۴ ، ر

IN HAND WITH MOHD HUSSAIN -/8/-

۱۰ جون ۱۱، ۱۲، ۱۳) ا دودھ چنے ۔ سبزی ۔ ر ، گوشت ۱ ، ر چمچہ ۲ ، ر لمپ ، ر مصالحہ ۔ ر دہی ، ر دودھ ا ، مصری ا ر گوشت ا ، آلو ، ر ، ا ، ر گوشت میزان ۱۲ ، ر

IN HAND ARE 3/6 (MOHD HUSSAIN)

۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷ جون ۹۹ ۱ ، ر گوشت وسبزی آم ، ر ، ا ، ر گوشت سبزی (جگہ پھٹی ہوئی ہے چیز ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱ کا نام اور قیمت پڑھی نہیں جا سکتی ۔ غالباً دال ۔ رہے) ۔ ا ، ر گوشت سبزی ا ، دال ا ، مصالحہ ۔ ر بڑی ، ر پیاز قیمہ ۲ ، ر ، ا ، ر گوشت سبزی ا ، ر گوشت سبزی ۔ گھی عصہ ر میزان عصہ ر ۱۴ ، ر

DUE TO MOHD HUSSAIN - 3/6

۲۲ جون ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶) پیاز ، ر ۲ ر گوشت ۔ ر دال آم ۔ ر ا ، ر گوشت وسبزی ۔ ر گوشت وسبزی چاول لے ر ا ، ر گوشت وسبزی ، ر دال ا ، ر گوشت وسبزی ۔ ر گھیا میزان للعہ ر

۲۷ جون ۹۹ آٹا عصہ ر روغن زرد عصہ دال ۷ ر چاول ۸ ر (دو چیزیں لکھ کر کاٹ دی گئی ہیں) مصالحہ ومزدور ۸ ر لکڑی عصہ ر میزان للعہ ۶ ر

ADVANCE -/7/-

باب ۲۷

آخری ملاقات

۱۹۳۸ء میں میں دہلی میں بطور سب جج تعینات تھا۔ اپریل کے شروع میں لاہور سے ابا جان کا خط ملا جس میں چچا جان کی طبیعت زیادہ خراب ہونے کی اطلاع تھی۔ لکھا تھا کہ معالجوں کے بقول سارے اعضائے رئیسہ ماؤف ہو چکے ہیں۔ دیوانی عدالتیں ستمبر کا پورا مہینہ بند رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک سال میں ۲۰ دن کی رخصت بھی ملتی تھی۔ قواعد کے بموجب ایسی رخصت ایک وقت میں دس دن سے زیادہ نہ مل سکتی تھی۔ میں نے دس دن کی رخصت کی درخواست کی تو ۱۱؍اپریل سے ۲۰؍اپریل کی رخصت منظور ہو گئی چنانچہ میں اہل و عیال سمیت لاہور آگیا۔ سیالکوٹ سے بھی سب لوگ آگئے ہوئے تھے۔ مردانے میں چچا جان کے دوست احباب میں سے چودھری محمد حسین۔ راجہ حسن اختر۔ سید نذیر نیازی، سید سلامت اللہ شاہ دن، کا اکثر حصہ موجود رہتے۔ میاں محمد شفیع (م۔ش) تو اُن دنوں رات بھی جاوید منزل میں ہی کاٹتے۔ اگرچہ چچا جان کی طبیعت دن بدن گر رہی تھی لیکن احباب اور آنے جانے والوں کے ساتھ مختلف مسائل اور موضوعات پر بدستور گفتگو فرماتے رہتے۔ حکیم محمد حسن قرشی بڑی محنت اور اخلاص سے علاج کر رہے تھے۔ ایلوپیتھک ڈاکٹروں میں سے ڈاکٹر الٰہی بخش، ڈاکٹر محمد یوسف ڈاکٹر امیر چند۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ سے بھی مشورہ کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم جو ہمارے قرابت دار

تھے قریباً دن رات موجود رہتے ۔ ۲۰ اپریل کو پشت کی درد کی وجہ سے طبیعت بہت خراب تھی ۔ اس دن ایک جرمن دوست جو ہائیڈل برگ میں ان کے ہم سبق رہ چکے تھے۔ ملاقات کے لئے آ گئے۔ ان کے ساتھ عرصہ تک بے تکلفانہ گفتگو رہی ۔ ان کا پلنگ نشست کے کمرے میں بچھا ہوا تھا۔ وہ گاؤ تکیہ سامنے رکھے اس پر سر ٹیکے بیٹھے تھے۔ پلنگ کے پاس ایک کرسی پر چودہری محمد حسین بیٹھے تھے۔ دوسری پر میں تھا۔ دریافت فرمایا جاوید کہاں ہے اُسے بلاؤ۔ وہ کہیں کھیل رہا تھا۔ اس کو بلایا گیا اور وہ آ کر پاس بیٹھ گیا۔ چودہری صاحب کو کہا اس کو سمجھائیں کہ زیادہ وقت میرے پاس بیٹھا کرے۔ میری رخصت اس دن ختم ہو رہی تھی۔ قواعد کے بموجب مجھے دوسرے دن صبح ملازمت پر حاضر ہونا تھا۔ گھر والوں سے یہ طے ہوا تھا کہ میں دو چار دن ملازمت پر حاضر رہ کر مزید دس دن کی رخصت لے کر آ جاؤں گا۔ میں نے عرض کیا میری رخصت آج ختم ہو رہی ہے لہٰذا میں رات کی گاڑی سے دہلی جا رہا ہوں۔ دو چار دن بعد مزید رخصت حاصل کر کے آ جاؤں گا۔ انہوں نے گاؤ تکیہ سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے مصافحہ کیا تو نحیف آواز میں "خدا حافظ" کے الفاظ سنائی دیئے۔ یہ سب باتیں اُن کے معمول کے بالکل خلاف تھیں۔ اُن کے ہاں قیام کے بعد جب کبھی رخصت ہونے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو پنجابی میں صرف اتنا فرماتے "اچھا چلیاں ایں۔" (اچھا جا رہے ہو) وہ نہ تو کبھی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے نہ ہی خدا حافظ کہتے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ سرد مہر تھے۔ ان کے دل میں اپنے عزیزوں کے لئے گہری محبت تھی لیکن اس کا برملا اظہار نہ ہوتا تھا اور یہ حجاب صرف انہیں کا خاصہ نہ تھا بلکہ خاندانی روایات ہی کچھ ایسی چلی آ رہی تھیں۔ رخصت کا یہ خلاف معمول انداز مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ تذبذب میں تھا کہ دہلی جاؤں یا نہ جاؤں۔ اتنے میں برآمدے میں ڈاکٹر جمعیت سنگھ نظر آئے۔ میں نے اُن سے مشورہ کیا۔ انہوں نے فرمایا عوارض اتنے ہیں کہ بیماری قابو میں نہیں آ رہی لیکن ایک دو دن والی بات نہیں۔ دہلی جا کر دو ایک دن حاضری دے کر مزید رخصت لے کر آ جانا۔ اس سے کچھ اطمینان ہوا اور میں اہل و عیال کے بغیر رات کی میل سے دہلی کے لئے روانہ ہو گیا۔ میل صبح کے وقت دہلی پہنچی تھی۔ میں نے مکان

پر جا کر لباس تبدیل کیا اور اپنی عدالت میں جانے سے پہلے ڈسٹرکٹ جج کے دفتر جا کر ان سے یہ کیفیت بیان کی اور دس روز کی مزید رخصت طلب کی جو ۲۴ اپریل سے منظور کر لی گئی۔ اتنے میں دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ میں اپنی عدالت کے کمرے میں داخل ہوا تو میز پر ایک تار کا لفافہ رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرا دل بیٹھ گیا۔ ڈرتے ڈرتے لفافہ چاک کیا تو پہلے منشی طاہر دین کے نام پر نظر پڑی۔ باقی مضمون پڑھنا غیر ضروری تھا۔ ایک لحظ کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زمین میرے پاؤں تلے سے نکل گئی ہے اور میں گہرے کنویں میں گرتا جا رہا ہوں لیکن مجھے اپنے جذبات پر قابو پانا ضروری تھا۔ کیونکہ اُس رات کی میل سے واپس لاہور جانے کے لئے کئی انتظام کرنے تھے۔ میں نے ڈسٹرکٹ جج کے دفتر میں ٹیلی فون کر کے ان کے کلرک آف کورٹ سے رخصت ۲۴ کی بجائے ۲۲ سے منظور کرائی اور ۲۱ اپریل کی رات کو میل سے روانہ ہو کر ۲۲ کی صبح کو لاہور پہنچ گیا۔

باب ۲۸

صدق و اخلاص و صفا باقی نماند

۱۳۵۷ ہجری

علامہ اقبال کی وفات پر اُن کے ہم عصر شعراء نے سینکڑوں وفات کی "تاریخیں" کہیں لیکن جو لاجواب تاریخ وفات اُن کے اپنے کلام سے نکلی اس کی دریافت کا سہرا میرے دوست حفیظ ہوشیارپوری کے سر ہے۔ حفیظ ایک بلند پایہ شاعر تھے اور تاریخ گوئی میں تو انہیں کمال حاصل تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ایک دن وہ اور ان کے مرحوم بھائی عبدالرشید راحل علامہ کی مثنوی "مسافر" پڑھ رہے تھے۔ جب انہوں نے "مناجاتِ مردِ شوریدہ در ویرانۂ غزنی" کا یہ شعر پڑھا

صدق و اخلاص و صفا باقی نماند   "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"

تو انہیں خیال آیا کہ مصرعہ اول کے اعداد ۱۳۰۰ سے زاید معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھیں اس مصرع سے کون سا سن ہجری نکلتا ہے۔ مصرع کے حروف کی اعداد شماری کی تو میزان ۱۳۵۷ نکلا حفیظ نے اپنے بھائی راحل سے کہا دیکھیں ۱۳۵۷ھ میں یہ مصرع کس کی تاریخ وفات کا مصرع بنتا ہے حفیظ کہتے تھے وہ یہ بات بھول چکے تھے کہ ۱۳۵۷ھ میں علامہ کی وفات ہوئی۔ ان کے بھائی راحل نے انہیں یہ واقعہ یاد دلایا اور کہا لو "صدق و اخلاص و صفا باقی نماند" خود کہنے والے کی اپنی تاریخِ وفات کا مصرع بن گیا۔

باب ۲۹

جاوید اور منیرہ کی ولایت کے متعلق وصیّت

میں ۲۲ اپریل کی صبح دہلی سے لاہور پہنچا۔ تھوڑی دیر بعد منشی طاہر دین تشریف لائے ان سے معلوم ہوا کہ اکتوبر ۳۵ء میں چچا جان نے جاوید اور منیرہ بانو کی ولایت کے متعلق ایک وصیت نامہ تحریر کیا تھا جو میاں امیر دین کی تحویل میں ہے جو اُن دنوں لاہور کے سب رجسٹرار تھے۔ منشی صاحب نے فرمایا چودھری محمد حسین تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں۔ آپ بھی تیار ہو جائیں تاکہ ہم میاں صاحب سے وصیّت نامہ لے آئیں۔ میں نے کہا آپ کے اور چودھری صاحب کے ہوتے میرے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے فرمایا وصیّت نامہ میں بچوں کی ولایت کے لئے چار اشخاص مقرر کئے گئے تھے۔ اُن میں سے خواجہ عبدالغنی بچوں کے ماموں فوت ہو چکے ہیں۔ باقی تین آپ، میں اور چودھری صاحب ہیں۔ وصیت نامہ میاں صاحب تینوں کے حوالے کریں گے۔ اس وقت تک مجھے اپنے تقرر کا علم نہ تھا۔ اپریل ۳۷ء میں چچا جان دہلی آئے تو میرے ہاں بھی تشریف لائے تھے۔ اور دسمبر ۳۷ء میں تو میں اُن کے ارشاد کی تعمیل میں کرسمس کی تعطیلوں میں دہلی سے سیالکوٹ جاتے ہوئے لاہور اُن کے ہاں ٹھہرا بھی تھا تاکہ جاوید اور منیرہ کو اپنے ساتھ سیالکوٹ لے جاؤں۔ اُن سے خط و کتابت بھی تھی۔ لیکن انہوں نے نہ زبانی نہ خط میں کبھی اس تقرری کا مجھ سے

ذکر فرمایا۔ منشی صاحب سے یہ معلوم ہو کر بدرجہ مجھے خوشی ہوئی کہ بچوں کا ولی مقرر کر کے انہوں نے مجھ پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔ چودھری محمد حسین تشریف لائے تو ہم تینوں میاں صاحب کے دفتر حاضر ہوئے اور انہوں نے وصیت نامہ ہمارے حوالے کر دیا جسے لا کر ابا جان اور دوسرے عزیزوں کو جو اُس وقت موجود تھے پڑھ کر سنا دیا گیا۔ یہ وصیت نامہ اقبالیات کے سلسلہ کی ایک اہم دستاویز ہے۔ اس سے اُن کی شخصیت۔ اُن کی مالی حالت اور اُن کے مذہبی عقائد پر روشنی پڑتی ہے۔ اسلئے اُسکی نقل اس کتاب میں شائع کی جارہی ہے تا کہ ریکارڈ میں محفوظ ہو جائے۔

وصیت نامہ میں لکھا ہے کہ "اگر ان اولیاء مقرر کردہ میں سے کوئی دستبردار ہو جائے یا نوت ہو جائے یا کسی دیگر وجہ سے کام کرنے کے نا قابل ہو جائے تو اس صورت میں باقی اولیاء کو اختیار ہو گا کہ کثرت رائے سے اس کا جانشین مقرر کر لیں۔ خواجہ عبدالغنی نوت ہو چکے تھے اس لئے میں نے میاں امیر الدین کو ان کا جانشین مقرر کرنے کی تجویز کی کیونکہ میاں صاحب اور ان کے خاندان کے ساتھ چچا جان کے دیرینہ تعلقات تھے۔ چودھری صاحب نے اس تجویز پر "اطمینان سے بعد میں غور" کرنے کا کہہ کر بات ٹال دی۔ بات ٹالنے کے فن میں وہ بڑے ماہر تھے۔ بعد میں جب دو ایک مرتبہ میں نے دہلی سے یاد دہانی کرائی تو انہوں نے یہ قانونی نکتہ نکالا کہ وصیت نامہ میں کسی ایک ولی مقرر کردہ کے کسی وجہ سے کام کرنے کے نا قابل ہو جانے کی صورت میں باقی اولیاء کو "اختیار" دیا گیا ہے کہ کثرت رائے سے اس کا جانشین مقرر کر لیں لیکن جانشین مقرر کرنا لازمی نہیں رکھا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ کسی وجہ سے وہ خواجہ مرحوم کا جانشین مقرر کرنے کے حق میں نہیں۔ چنانچہ ہم تینوں ہی اس فرض کو ادا کرتے رہے اور جب بعد میں منشی طاہر دین بھی نوت ہو گئے تو ولایت کا فرض میں اور چودھری صاحب ہی ادا کرتے رہے۔

ملازمت کے سلسلہ میں میرا قیام تو لاہور سے باہر رہتا تھا۔ اس لئے ولایت کے فرائض کی ادائیگی کا بار زیادہ تر لاہور میں رہنے والے اولیاء یعنی چودھری صاحب اور منشی صاحب اور منشی صاحب کی وفات کے بعد تنہا چودھری صاحب کے کندھوں پر رہا بڑا کام تو چچا جان کی تصانیف کی طباعت کا انتظام تھا کیونکہ نابالغان کی آمدنی زیادہ

تو اسی ذریعہ سے تھی اور یہ کام چودھری صاحب نے بڑی محنت سے سرانجام دیا۔

وصیت نامہ میں یہ بھی لکھا تھا کہ "جب میرا پسر جاوید اقبال بالغ ہو جائے تو وہ اپنی ہمشیرہ منیرہ کی ذات اور جائیداد کا ولی ہوگا اور اس کی جائیداد اور ذات کے متعلق انتظام خود بطور ولی کرے گا۔" جاوید ۵ اکتوبر ۴۲ء کو بالغ ہوگیا۔ گھر کے اخراجات کا انتظام تو اس نے سنبھال لیا جس کے لئے بینک سے روپیہ نکلوا کر اسے دے دیا جاتا۔ لیکن جائیداد کی آمد وغیرہ کا انتظام اس کی تحریری خواہش کے مطابق بدستور ہم کرتے رہے۔ یہ سلسلہ جولائی ۴۷ء تک چلا جب یہ انتظام بھی اُس کے سپرد کر دیا گیا۔ وصیت نامہ کی تحریر کے وقت ہر دو نابالغان کے نام قریباً پانچ پانچ ہزار روپیہ بینکوں میں جمع تھا۔ جولائی ۴۷ء میں جب سب انتظام جاوید کے سپرد کیا گیا تو ۳۸ء سے ۴۷ء تک ۹ سال کے جملہ اخراجات خانہ داری و تعلیم و طباعت کتب وغیرہ صرف ہونے کے بعد جاوید کے ۴۴۸۷۴/- اور منیرہ بانو کے ۳۵۵۸۶/- کل ۸۰۴۶۰/- بینکوں میں جمع تھا۔ اس خوش انتظامی کا سہرہ چودھری صاحب کے سر ہے۔ چودھری محمد حسین اپنی حیات میں بھی ایک متنازعہ شخصیت تھے۔ چچا جان کے ساتھ ان کے تعلق کے متعلق بعض لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے تھے۔ چودھری صاحب ایک بشر تھے۔ فرشتہ نہ تھے۔ ہم سب کی طرح اُن میں بشری کمزوریاں تھیں۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری ان کا تعصب تھا۔ میں بھی ان کے تعصب کا نشانہ بنا تھا۔ اُن کی سب کمزوریوں کے باوجود انصاف کی بات یہ ہے کہ چچا جان کی وفات کے بعد ۹ سال تک اُن کی اولاد کے معاملات کی دیکھ بھال میں جان مار کر انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ چچا جان سے ان کو دلی عقیدت تھی اور اُن سے تعلق خاطر کسی غرض کی بنا پر یا "بکار سرکار" نہ تھا کیونکہ "سوختن بر شمع کشتہ کار ہر پروانہ نیست"

سردار چچی جان کی وفات کے بعد ایک پختہ عمر خاتون کی بڑی ضرورت تھی۔ جو خانہ داری کا انتظام اور بچوں بالخصوص منیرہ کی تربیت کر سکے۔ چچا جان فرمایا کرتے تھے۔ کہ انتظام خانہ داری کے لئے جرمن عورت بہترین ہوتی ہے۔ اُن کی اس رائے میں کچھ اثر اُس تعلق خاطر کا بھی معلوم ہوتا ہے جو جرمنی میں تعلیم کے زمانہ میں انہیں اپنی جرمن استانی

مس ایما وگناسٹ سے ہو گیا تھا جس کا اظہار اُن خطوط سے ہوتا ہے جو انہوں نے جرمنی سے واپسی پر مس وگناسٹ کو لکھے اور پچھلے دنوں اخبارات میں شائع ہوئے۔ منیرہ کے لیئے گورنس کی تلاش ہوئی تو حسنِ اتفاق سے ایک جرمن خاتون مل گئیں۔ وہ علی گڑھ کالج کے ایک پروفیسر کی جرمن بیوی کی بہن یا قریبی رشتہ دار تھیں۔ انہیں چچا جان کی زندگی میں ہی بطور گورنس رکھ لیا گیا تھا۔ اُن کی وفات کے بعد بھی خانہ داری کا انتظام اور منیرہ کی تربیت انہیں کے سپرد تھی اور یہ فرض انہوں نے احسن طریق پر انجام دیا۔ وہ ہمارے گھر کی سب مستورات سے گھُل مل گئی تھی اور سب کے لیئے آنٹی ڈورس تھی۔ اب عرصہ سے ریٹائر ہو کر اپنے وطن چلی گئی ہوئی ہیں لیکن خاندانِ اقبال سے تعلق بدستور قائم ہے۔ گاہ گاہ ملنے کے لیئے لاہور بھی آتی ہیں اور منیرہ کو یورپ جانے کا اتفاق ہو تو انہیں ملنے کے لیئے جرمنی بھی جاتی ہیں۔

مولانا سالک کے "ذکرِ اقبال" میں ۱۹۳۷ء میں ایک اور وصیت کیئے جانے کا ذکر کیا گیا ہے جو کسی غلط فہمی کی بنا پر ہے۔ کیونکہ ۱۹۳۵ء والی وصیت کے بعد اور کوئی وصیت نہیں کی گئی۔ ہاں ۱۹۳۷ء میں میری بجائے سر راس مسعود کو ولی مقرر کرنے کی تجویز سر راس مسعود کو بھیجی گئی تھی لیکن انہوں نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ اس لئے اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا۔ جس خط میں یہ تجویز کی گئی تھی وہ تین مختلف کتابوں میں شائع ہوا ہے اور ہر کتاب میں اس کے متن میں اختلاف ہے لیکن یہ ایک علیحدہ قصہ ہے جو اسی کتاب میں بیان کر دیا گیا ہے۔

جاوید اور منیرہ کی ولایت کے متعلق علامہ کا وصیت نامہ

منکہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بیرسٹرایٹ لاء لاہور کا ہوں۔ اس وقت بہ قائمی ہوش و حواس خمسہ خود اقرار کرتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں کہ قبل ازیں من مقر بر وئے دستاویزات رجسٹری شدہ اپنی کل جائیداد منقولہ وغیرہ (از قسم حق تصنیف کتب تصنیف کردہ خود و حقوق رائیلٹی وغیرہ) و جائیداد غیر منقولہ بحق پسر خود مسمی جاوید اقبال نابالغ ہبہ کرکے قبضہ دے چکا ہوں۔ اس جائیداد مذکورہ کے علاوہ گھر کا ساز و سامان از قسم ظروف سیمیں وغیرہ و قالین و دیگر سامان بھی فرزند مذکور کو دے چکا ہوں جو اس وقت سے اس کے تصرف و استعمال میں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس قریباً دو تین سال ہوئے اپنی حقیقی دختر مسمات منیرہ بیگم نابالغہ کو پانچ ہزار روپیہ ہبہ کرچکا ہوں جو اسی کے نام سے پنجاب نیشنل بنک لاہور میں جمع ہے۔ اس روپے کے علاوہ زیور وغیرہ بھی جو اس کی والدہ مرحومہ نے اپنی زندگی میں ہی اس کے نام ہبہ کر دیا تھا۔ بنک مذکور میں ایک آہنی بکس میں بند کرکے جمع کرا دیا گیا ہے۔ میرا اس جملہ جائیداد متذکرہ الصدر اور زر نقد وغیرہ سے اب کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ چونکہ ہر دو اولاد مذکورہ بالا نابالغان ہیں اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اور من مقر کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی اس لئے میں وصیت کرتا ہوں کہ میری وفات کے بعد اگر میری اولاد مذکورہ نابالغ رہیں تو ان کی جائیداد و ذات

کے ولی مندرجہ ذیل ہوں گے ۔

(۱) خواجہ عبدالغنی ماموں حقیقی نابالغان (۲) شیخ اعجاز احمد سب جج برادر زادہ من مقرر (۳) چودھری محمد حسین ایم ۔ اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ لاہور (۴) منشی طاہر الدین جو کئی سال سے میرے کلارک رہے ہیں اور اُن کی شرافت و دیانت پر مجھے پورا اعتماد ہے ۔ اس وصیّت کی رو سے میں ان جملہ حضرات کو نابالغان کی ذات وجائیداد کا ولی مقرر کرتا ہوں ۔ تمام امور متعلقہ ذات وجائیداد نابالغان کا انتظام اولیاء مذکور کثرت رائے سے کیا کریں گے لیکن جب میرا پسر جاوید اقبال بالغ ہو جائے تو وہ اپنی ہمشیرہ منیرہ کی ذات وجائیداد کا ولی ہو گا اور اس کی ذات وجائیداد کے متعلقہ انتظام خود بطور ولی کرے گا ۔ اگر ان اولیاء مقرر کردہ میں سے کوئی دست بردار ہو جائے یا فوت ہو جائے یا کسی دیگر وجہ سے کام کرنے کے ناقابل ہو جائے تو اس صورت میں باقی اولیاء کو اختیار ہو گا کہ کثرت رائے سے اس کا جانشین مقرر کر لیں ۔ اگر کسی معاملہ میں اولیاء مذکورہ کی رائے مساوی ہو تو صدر انجمن حمایت اسلام لاہور کی رائے جس فریق کے ساتھ ہو اس پر عمل کیا جائے گا اور اسی کے مطابق فیصلہ ہو گا ۔

(۲) اس وقت ملکیت کی جو چیزیں ہیں مندرجہ ذیل ہیں (۱) کُتب فلسفہ ولٹریچر وغیرہ اُن میں سے چند کتب یعنی اپنی تصنیف کردہ کتب کے مطبوعہ نسخے معہ مسودات ۔ مثنوی مولانا روم فارسی وانگریزی مرتبہ ڈاکٹر نکلسن ۔ دیوانِ مرزا عبدالقادر بیدل قلمی ۔ مثنوی مراۃ معنوی (مولانا روم مطبوعہ حیدرآباد) اپنے پڑھنے کا قرآن شریف ۔ باقی اور مسودات اور کاغذات میں نے جاوید کو بطور یادگار دے دیئے ہیں ۔ باقی کتب مطبوعہ انگریزی وغیرہ میری وفات کے بعد اسلامیہ کالج کی لائبریری میں رکھ دی جائیں (۱۱) میری آمدنی سے جو روپیہ بچے گا وہ وقتاً فوقتاً نابالغان مذکورہ کو ہبہ کرتا رہوں گا ۔ اور اُن کے نام سے بنک میں جمع ہوتا رہے گا ۔ وہ سب روپیہ جو اس طرح ان کے نام سے بنک میں جمع ہوتا رہے گا ۔ وہ سب روپیہ جو اس طرح ان کے نام بنک میں رکھا جائے گا اُنہی کی ملکیت ہو گا ۔ یہ روپیہ اُن کی تعلیم و تربیت وشادی وغیرہ کے لئے ہو گا ۔ اس وقت جو روپیہ منیرہ کا بنک پنجاب نیشنل لاہور میں جمع ہے اُس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں ۔ جاوید کا جو روپیہ ہے وہ کتابوں کی آمدنی

کا ہے جس کے حقوق تصنیف اس کے نام ہبہ کر دیئے گئے ہیں۔ یہ روپیہ بھی قریباً پانچ ہزار پنجاب نیشنل بنک لاہور میں جمع ہے اور اُس کی آمدنی کا حساب منشی طاہرالدین کے رجسٹر میں درج ہے اور آئندہ بھی درج ہوتا رہے گا (iii) باقی میرا اسباب دو قالین برنگ سرخ دوری وصوفہ و کرسیاں و بکس اور پہننے کے کپڑے ہیں۔ ان کی نسبت میری وصیّت یہ ہے کہ میری وفات کے بعد میرے پہننے کے تمام کپڑے غربا میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ جو کچھ میری ملکیت کی چیزیں ہیں وہ سب میرے روزمرہ کے استعمال کی ہیں اور اُن کمروں میں ہیں جو میرے استعمال میں ہیں (یعنی کوٹھی واقع میو روڈ کے تین سامنے کے کمرے) اور جن کا کرایہ مبلغ پچاس روپیہ ماہوار میں جاوید کو ماہ بماہ ادا کرتا ہوں۔ لہٰذا یہ وصیت لکھ دی ہے کہ سند رہے اور وقت حاجت کام آئے۔

محمّد اقبال بیرسٹرایٹ لا لاہور
بقلم خود ۱۳ اکتوبر ۳۵ء

مکرّر آنکہ اگر نابالغان کے فائدے کی خاطر یا جائیداد کے انتظام یا کسی اور جائیداد کی خرید وغیرہ کے لئے اولیاء کو روپے کی ضرورت ہو تو وہ کثرت رائے سے بنک سے روپیہ نکالنے کے متعلق فیصلہ کریں اور کسی دو اولیاء کے دستخط سے روپیہ بنک سے نکال لیں (بقدر ضرورت) علیٰ ہذا القیاس کتب کی چھپائی واشاعت وانتظام کے لئے بھی اگر روپے کی ضرورت ہو تو ایسا کیا جائے۔ دیگر میرے مذہبی اور دینی عقائد سب کو معلوم ہیں۔ میں عقائد دینی میں سلف کا پیرو ہوں۔ نظری اعتبار سے فقہیہ معاملات میں غیر مقلد ہوں۔ عملی اعتبار سے حضرت امام ابو حنیفہ کا مقلد ہوں۔ بچوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں میرے ورثا کا اور اولیاء مقرر کردہ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا پورا لحاظ کریں اور رشتہ ناطہ میں شرافت اور دینداری کو علم و دولت اور ظاہری وجاہت پر مقدم سمجھیں۔

محمّد اقبال بیرسٹر ۱۳ اکتوبر ۳۵ء

باب ۳۰

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

علامہ اقبال کے متعلق طرح طرح کے قصے اور کہانیاں بنتی رہتی ہیں۔ ایسی داستان سازیوں میں موافق مخالف دونوں اقسام کے لوگ طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اوّل الذکر کا مقصد بقول ڈاکٹر تاثیر مرحوم "اپنے لئے بقائے دوام حاصل کرنے کی کوشش" یا اپنی یا اپنے کسی بزرگ کی بڑائی کا اظہار اور موخر الذکر کا اس بہانے اُن کی عیب شماری۔ کوئی کہاں تک اُن کا شمار کرے اور تردید کرتا پھرے۔ یہاں ایک اتہام کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے کیونکہ اُس کی تردید راقم الحروف اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بنا پر کر سکتا ہے۔ یہ اُن پرمے نوشی کا بہتان ہے۔

انگلستان سے واپس آکر علامہ نے ۱۹۰۸ء کے آخر میں لاہور میں وکالت کا کام شروع کیا۔ میں پہلی مرتبہ ۱۹۱۱ء میں میاں جی کے ہمراہ لاہور گیا۔ اُن دنوں چچا جان کی سکونت انار کلی والے مکان میں تھی۔ اس کے بعد قریباً ہر سال درس گاہوں کی چھٹیوں میں کچھ دنوں کے لئے میں لاہور جاتا۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۱ء تک تعلیم کے سلسلہ میں پانچ سال میرا قیام لاہور میں رہا۔ میری رہائش تو متعلقہ درس گاہ کے ہاسٹل میں ہوتی تھی لیکن حسب الحکم ہفتہ میں دو ایک بار اُن کے ہاں ضرور جانا ہوتا تھا۔ اِن سالوں میں جب کبھی انہیں مقدمات یا

کسی اور سلسلہ میں لاہور سے باہر جانا ہوتا تو اُن کی عدم موجودگی میں مجھے اُن کے ہاں رہنا پڑتا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد سیالکوٹ میں وکالت کی۔ پریکٹس کے زمانے میں اور پھر مختلف مقامات پر ملازمت کے دوران ان کے ہاں جانے اور قیام کرنے کا اتفاق بھی ہوتا۔ ستائیس سالوں کے اس لمبے عرصے میں مَیں نے نہ تو کبھی انہیں شراب پیتے دیکھا نہ شراب پیئے ہوئے دیکھا۔ نہ ہی مجھے اُن کے گھر میں شراب نوشی کا کوئی سامان نظر آیا۔ میرے قیام سیالکوٹ کے دوران وہ تعطیلوں میں سیالکوٹ آتے تو ان کی خدمت کی سعادت مجھے حاصل ہوتی۔ اگر انہیں شراب نوشی کی عادت ہوتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ اس لمبے عرصے میں یہ بات مجھ سے چھپی رہتی۔ اس کے علاوہ ۱۹۱۲ء میں ایک مقدمہ کی پیروی کے لئے اُن کے کیمبل پور جانے کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس سفر میں راقم الحروف کہ اس وقت قریباً تیرا چودہ سال کا تھا اُن کے ساتھ تھا۔ ان کے اعزاز میں وہاں ایک دعوت ہوئی جس میں اور مہمانوں کے علاوہ چند انگریز افسر بھی تھے اور مے نوشی کا اہتمام بھی تھا۔ غالباً اس خیال سے کہ چچا جان ولایت پلٹ ہیں۔ اس لئے ضرور پیتے ہوں گے ان کو بھی شراب پیش کی گئی۔ انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ انہوں نے تو یورپ میں بھی شراب نہیں پی۔ میں اپنے علم اور مشاہدہ کی بنا پر وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اُن پر مے نوشی کا اتہام ایک بہتان ہے جو اُن کے بعض مخالفوں نے کسی غرض کے تحت مشہور کیا۔

ہم عصر شعراء میں آپس کی چشمک تو رہتی ہی ہے۔ "عادت یہ ہمارے شعراء کی ہے پرانی"۔ اور یہ کچھ ایسی قابلِ اعتراض بات بھی نہیں کیونکہ "بقدر پیمانۂ تخیّل سرور ہر دل میں ہے خودی کا"۔ ہر شاعر اپنے کلام کو اپنے ہم عصروں کے کلام پر فوقیت دیتا ہے۔ "نہ ہو اگر یہ فریب، پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا"۔ لیکن جب معاصرانہ چشمک یا علمی تحقیق میں حسد کی آمیزش ہو جائے تو بات دوسری ہو جاتی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں دو ایک دانش وروں نے ماہر نفسیات کا لبادہ اوڑھ کر علامہ کی تحریروں کی روشنی میں اُن کی نفسیات کا جائزہ لینے کے بہانے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ ایک کہتے ہیں " اقبال نہ زبان کے شاعر ہیں نہ رعایت لفظی کے۔ نہ صنائع بدائع کے اور نہ جذبات و محسوسات کے۔" اُن کے خیال میں وہ "تصورات اور

خیالات کے شاعر ہیں اور تصورات اور خیالات بھی روایتی نہیں اُن کے اپنے ہیں۔" پھر وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ "خیالات کی شاعری اچھے یا بُرے معنوں میں شاعری ہوتی بھی ہے یا نہیں؟" دوسرے لفظوں میں اُن کے نزدیک علامہ کی شاعری شاعری ہی نہیں۔
یہاں تک تو خیر علمی بات تھی۔ ہر کس بہ خیال خویش خبطے دارد۔ غالب کے متعلق اُن کی زندگی میں "مگر اُن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" کہا جاتا تھا۔ گر نہ بیند بہ روز شپرہ چشم۔ لیکن علامہ کی شاعری پر اعتراض سے ان کے حسد کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ فرماتے ہیں "کبھی کبھی میرے دل میں ایک خطرناک خیال آتا ہے لیکن میں کسی ذریعے سے اس کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ کیا علامہ کسی خطرناک جسمانی (جنسی) عارضے میں مبتلا تھے؟" ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے۔

دوسرے دانشور ماہر نفسیات کی رائے میں اقبال "کامل مرد نہیں تھے۔" لیکن وہ یہ نہیں فرماتے کہ یہ انکشاف اُن پر کیسے اور ان کی کس تحریر سے ہوا۔ رشید احمد صدیقی ایسی تحریروں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار اپنے ایک مضمون میں کر چکے ہیں جس کے بعد ان ہفوات کے متعلق مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

باب ۳۱

علامہ اقبال کی یادگار اشیاء

میرے پاس چچا جان کی حسب ذیل یادگار اشیاء محفوظ تھیں۔

(۱) تعلیمی اسناد و تمغے (۱) اینگلو ورنیکلر مڈل کے امتحان منعقدہ ۱۸۹۱ء میں کامیابی کی سند از پنجاب یونیورسٹی۔

(۲) انٹرنس کے امتحان منعقدہ ۱۸۹۳ء میں کامیابی کی سند از پنجاب یونیورسٹی۔

(۳) انٹرنس کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے پر تمغہ از سکاچ مشن سکول سیالکوٹ۔

(۴) انٹرمیڈیٹ (ایف اے) کے امتحان منعقدہ ۱۸۹۵ء میں کامیابی کی سند از پنجاب یونیورسٹی۔

(۵) بی۔ اے کے امتحان منعقدہ ۱۸۹۷ء میں کامیابی کی سند از پنجاب یونیورسٹی۔

(۶) تمغہ خان بہادر فقیر سید جمال الدین جو پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کے امتحان میں عربی کے مضمون میں امتیاز حاصل کرنے پر ملا۔

(۷) ایم۔ اے کے امتحان منعقدہ ۱۸۹۹ء میں کامیابی کی سند از پنجاب یونیورسٹی

(۸) تمغہ خان بہادر شیخ نانک بخش جو پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کے امتحان میں فلسفہ

کے مضمون میں امتیاز حاصل کرنے پر ملا۔

(۹) سارٹیفکیٹ آف ریسرچ مورخہ ۷ مئی ۱۹۰۷ء جو انگلستان کی کیمبرج یونیورسٹی نے "DEVELOPMENT of METAPHYSICS IN PERSIA" (ایران میں فلسفۂ الہیات کا ارتقا) کے مضمون پر ان کے مقالے پر دیا۔ (نومبر ۱۹۰۷ء میں اس مقالہ پر جرمنی کی میونخ یونیورسٹی نے بھی ڈاکٹریٹ دی تھی)

بے جی کی حیات میں یہ اسناد اور تمغے اُن کی تحویل میں ہوتے تھے۔ وہ انہیں سرخ رنگ کے حلوان کے کپڑے میں باندھ کر اپنی قیمتی اشیاء کے ساتھ اپنے چوبی صندوق میں رکھتی تھیں۔ وفات سے دو ایک دن پہلے جب گھر کا انتظام بھابھی جی (میری والدہ) کے سپرد کیا تو اس صندوق کی چابی بھی ان کے حوالے کی۔ پھر یہ اسناد اور تمغے بھابھی جی کی تحویل میں رہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے چچا جان سے کہا کہ وہ اپنی اسناد وغیرہ لاہور لے جائیں۔ انہوں نے فرمایا مجھے انکی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے پاس ہی رہنے دیں۔ چچا جان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد میری درخواست پر بھابھی جی نے یہ اسناد اور تمغے میری تحویل میں دے دیئے اور تب سے میرے پاس ہیں۔

II علامہ اقبال کی قلمی تحریریں (۱) ایک کاپی کے ۱۹ صفحات پر اردو میں ان کے قلمی نوٹ جو ان موضوعات پر ہیں (الف) علم النفس والقویٰ (ب) انگلستان کی حالت اٹھارویں صدی میں (۱۶۸۸ تا ۱۸۱۵) (ج) سلطنت نو آباد یہائے انگلستان (د) بستیاں آباد کرنے کا پرانا اور نیا طریق (ہ) تجارت اور جنگ۔ اس کاپی کے آخری ورق پر "DAILY KITCHEN ACCOUNTS" کے تحت ۷ جون سے ۲۷ جون ۱۸۹۹ء کا باورچی خانہ کا حساب لکھا ہے جس کا ذکر پہلے ایک باب میں کیا جا چکا ہے۔

۲۔ نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" جو ۱۹۱۵ء کے شروع میں خوشنویس سے لکھوا کر اپنے والد کے لئے بھیجی۔ اس کے آخری دو صفحات پر نظم کے ہر بند کی مختصر تشریح اُن کے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔

۳۔ دستاویز "دست برداری از حقوق ملکیت" محررہ ۲۷ ستمبر ۱۹۳۰ء جس کا ذکر ایک پہلے باب "اقبال منزل" کے تحت کیا جا چکا ہے۔

(۴) علامہ کے ۳۰۱ خطوط جن میں ۲۶ انکے والد یا انکے اپنے بڑے بھائی کے نام اور ۳۸ میرے نام ہیں ایک اپنی ہمشیرہ کے نام اور ایک میرے چھوٹے بھائی شیخ مختار احمد کے نام ہیں۔ یہ ۳۰۱ خطوط سب اُن کے قلمی ہیں۔

(۵) علامہ کے میرے نام آٹھ خطوط جو سوائے ایک کے اُن کے قلمی نہیں۔ یہ ۳۷ء کے ہیں۔ اُن دنوں ان کی آنکھوں میں موتیا اُتر رہا تھا۔ معالجوں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہوا تھا۔ خط کسی سے لکھوائے گئے ہیں لیکن مضمون انہیں کا لکھوایا ہوا ہے۔ جن لفافوں میں یہ خطوط بذریعہ ڈاک موصول ہوئے وہ بھی محفوظ ہیں۔

3۔ علامہ اقبال کی کتابیں (انگریزی)

اِن کا ذکر پہلے ایک باب میں کیا جا چکا ہے۔

4 دیگر مصنفین کی کتابیں ان انگریزی کتابوں کے علاوہ مندرجہ ذیل اردو کتابیں بھی میرے پاس تھیں جو مصنف یا کسی مدّاح نے انہیں پیش کیں اور پڑھنے کے بعد انہوں نے سیالکوٹ اپنے بھائی کو بھیج دیں۔

۱۔ سیرت عائشہ صدیقہؓ۔ مصنف سیّد سلیمان ندوی۔ پیش کردہ مصنف (اپنے خط محرّرہ ۲۳ دسمبر ۲۰ء بنام سید سلیمان ندوی میں جو اقبال نامہ جلد اول کے صفحہ ۱۱۳ پر شائع ہوا چچا جان نے اس کتاب کے بھیجنے کا شکریہ ادا کیا ہے)

(۲) مَا فِی الاسلام۔ جلد اول مؤلفہ مولانا اصغر علی روحی۔ پیش کردہ مؤلف ۱۰ جون ۳۱ء

(۳) جذباتِ بسمل۔ مجموعہ کلام منشی سُکھدیو پرشاد سنہا بسمل الٰہ آبادی۔ پیش کردہ مصنف ۳۲ء

(۴) طلسم زندگی۔ مجموعہ مضامین میاں بشیر احمد بیرسٹر۔ پیش کردہ مصنف ۳ اپریل ۳۳ء

(۵) ارمغانِ عزیز۔ جلد دوم۔ کلام نواب عزیز یار جنگ۔ پیش کردہ محمد عباس علی خاں لمعہ حیدر آباد دکن، ۷ اگست ۳۴ء (اپنے خط محرّرہ ۷ جولائی ۳۵ء میں جو اقبال نامہ جلد اول کے صفحہ ۲۸۹ پر شائع ہوا ہے اس کتاب کے بھیجنے کا شکریہ لمعہ صاحب کو لکھا ہے)

(۶) دیوانِ غالب مطبوعہ برلن (جرمنی) پیش کردہ محمد عباس علی خاں لمعہ، ۲۷ اگست ۳۷ء

(لمعہ صاحب نے دیوانِ غالب کا یہ خوبصورت نسخہ اس شعر کے ساتھ پیش کیا جو کتاب پر لکھا ہوا ہے :-

اقبال تو سراپا اسرارِ ایزدی ہے
افسوں ترا تکلّم تو شعر کا نبیؐ ہے

جس طرح کتاب پر یہ شعر لمعہ صاحب نے لکھا ہے میں نے ہو بہو نقل کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے لمعہ صاحب نے بے دھیانی میں "افسوں" کی بجائے "افسون" لکھ دیا ہے۔ دوسرے یہاں "نبی" کے اوپر ص نہیں لکھنا چاہیئے تھا) اس کتاب کی ترسیل کا شکریہ خط محررہ ۳۱ اگست ۳۷ء میں جو اُن کی طرف سے محمد شفیع (م۔ش) صاحب نے لمعہ صاحب کو لکھا گیا ہے۔ یہ خط اقبالنامہ حصّہ اول کے صفحہ ۲۹۸ پر شائع شدہ ہے۔

ماسوائے کتاب نمبر ایک باقی سب پر پیش کرنے والے کی تحریر رقم ہے کتاب نمبر ایک پر بھی ایسی تحریر ہوگی لیکن وہ ورق جس پر کتاب کا نام چھپا ہوا تھا پھٹ گیا ہے۔

دستاویزات مندرجہ آ (3) و ۵) کے علاوہ باقی سب نوادرات نیشنل میوزیم آف پاکستان کراچی کی تحویل میں دے دیئے گئے ہیں اور وہاں محفوظ ہیں۔

باب ۳۲

زندہ رُود۔ علامّہ اقبال کے سوانح حیات

علامّہ اقبال کے نامور فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے عظیم باپ کے سوانح حیات قلم بند کئے ہیں جو "زندہ رُود" کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ پہلی جلد جو ۱۹۰۸ء تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری جلد جو ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔ علامّہ کی حیات کے وسطی دور (۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۵ء) کے متعلق ہے۔ اب حال ہی میں تیسری جلد شائع ہوئی ہے جو حیاتِ اقبال کے اختتامی دور (۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۸ء) کا احاطہ کرتی ہے۔

چچا جان کی وفات کے وقت جاوید کی عمر تقریباً ۱۳ سال تھی۔ ۱۹۴۶ء کے اپنے ایک مضمون میں[1] انہوں نے علامّہ کی زندگی کی آخری رات کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ "آخری رات ان کی چارپائی گول کمرے میں بچھی تھی۔ عقیدت مندوں کا جھمگٹا تھا۔ میں کوئی نو بجے کے قریب اس کمرے میں داخل ہوا تو پہچان نہ سکے۔ پوچھا "کون ہے؟" میں نے جواب دیا" میں جاوید ہوں۔" ہنس پڑے اور بولے" جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں۔" یہ بسترِ مرگ پر باپ کی بیٹے سے اُس کے متعلق اپنی آخری تمنّا کا اظہار بھی تھا اور بیٹے کے لئے ایک چیلنج بھی۔ الحمدللہ جاوید نے جاوید بن کر دکھا دیا ہے۔ رہی سہی

کسر یہ کتاب لکھ کر نکال دی ہے۔" زندہ رُود" کی اشاعت سے پہلے علامہ اقبال کے سوانح حیات کی کوئی مستند کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ زندہ رُود نے اس کمی کو احسن طریق سے پورا کر دیا ہے۔ اس میں صرف ان کے نجی زندگی کے حالات ہی نہیں۔ ان کے افکار و نظریات کے تدریجی ارتقا کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ میں کوئی نقاد نہیں لیکن اقبالیات کے ایک قاری کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ علامہ کے سوانح حیات پر یہ کتاب حرف آخر سمجھی جائے گی۔

علامہ اقبال کے اختتامی دورِ حیات کے سوانح لکھے جائیں تو زندگی کے آخری تین چار سالوں میں انہوں نے احمدیت کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا اس کا ذکر آنا ضروری ہے۔ اُن ایام میں جاوید دس بارہ سال کے تھے۔ احمدیت کے خلاف محاذ آرائی کے اسباب کیا تھے۔ اُن کو اس کا ذاتی علم تو ہو نہیں سکتا۔ احمدیت کے خلاف جو کچھ ہوا وہ "احرار" کی ایک سیاسی چال تھی۔ جس کے لئے انہوں نے علامہ کو استعمال کیا۔ میں نے جاوید کے نام اپنے ایک خط میں احرار کی اس سازش کا مختصراً ذکر کرتے ہوئے لکھا "اندھے تعصب کی گھٹا جو ان دنوں چھائی ہوئی ہے چھٹ لے تو کوئی بے تعصب مورّخ کبھی نہ کبھی حضرت علامہ اور سلسلۂ احمدیہ کے متعلق ضرور خامہ فرسائی کرے گا۔" اس کے جواب میں جاوید نے لکھا کہ وہ یہ کتاب ایک بے تعصب مورّخ کی طرح لکھنا چاہتے ہیں تاکہ حقیقت پیش کی جا سکے۔ اس لئے اگر میں انہیں اپنے نقطۂ نظر سے "علامہ اقبال اور احمدیت" کے موضوع پر ایک مفصل نوٹ بھیج دوں تو خواہ انہیں میرے نقطۂ نظر سے اختلاف بھی ہوا وہ میرے نوٹ کو میرے ہی الفاظ میں کتاب میں شامل کر دیں گے۔ اُن کی اس خواہش کی تعمیل میں مَیں نے انہیں ایک مفصل نوٹ بھیج دیا جسے انہوں نے کم و بیش زندہ رُود کی جلد سوم کے بیسویں باب میں شامل کر دیا ہے۔ ان دنوں کہ کسی مسئلہ پر دوسرے کے نقطۂ نظر کو سننا بھی گوارا نہیں ہوتا اُسے من و عن اپنی کتاب میں پیش کر دینا تاکہ تصویر کے دونوں رُخ قاری کے سامنے آ جائیں بڑی قابل قدر بات ہے۔ ایسا کر کے جاوید نے اپنے اعلیٰ جوڈیشل منصب کی لاج بھی رکھ لی ہے۔ میرا نوٹ خفیف سے اضافے کے ساتھ اس کتاب کے اگلے باب میں شامل ہے۔ میرے موقف کے مطابق

۱۹۳۵ء سے قبل احمدیت کے دو ایک عقائد سے اتفاق اور دو ایک سے سخت اختلاف کے باوجود چچا جان احمدیوں کو قطع نظر اُن کے عقائد کے مسلمانوں کا ہی ایک فرقہ سمجھتے تھے اور جماعت احمدیہ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہ دیتے تھے۔ اس حقیقت کو زندہ رُود میں تسلیم کیا گیا ہے (صفحہ ۵۷۸)۔ سوال صرف یہ باقی رہ جاتا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں احمدیت کے متعلق علامہ کی رائے میں تبدیلی کیوں آئی اور احمدیت کے خلاف ان کے بیانات میں وہ شدت اور تلخی کیوں آئی جو عام طور پر ان کے شیوہ کے مطابق نہ تھی۔ میرے نوٹ کے مطابق اس کی وجہ ایک سازش کے تحت احرار کا دباؤ اور ان کی ریشہ دوانیاں تھیں جس میں ایک ذاتی معاملہ میں ان کا احساسِ محرومی بھی شامل ہوگیا۔ جاوید کو میرے اس نتیجے سے اتفاق نہیں۔ انہوں نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اُن کی رائے کی اس تبدیلی کی وجوہات بیان کی ہیں۔ اب تصویر کے دونوں رُخ پیش کر دیئے گئے ہیں۔ آئندہ کا مورّخ فیصلہ کرے گا کہ احمدیت کے متعلق ان کی رائے کی تبدیلی کے اصل محرکات کیا تھے۔

زندہ رُود میں ہمارے دادا، میرے ابّا جان اور چچا جان کی احمدیت سے وابستگی یا عدم وابستگی کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا اکثر حصّہ "سُنی سنائی" باتوں کی ذیل میں آتا ہے کیونکہ جس زمانے کا ذکر کیا گیا ہے اُس میں جاوید ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے یا انہوں نے ہوش نہیں سنبھالا تھا۔ جو کچھ انہیں بتایا گیا اُس میں کچھ باتیں تو نامکمل ہیں اور کچھ نادرست۔ ریکارڈ درست رکھنے کے لئے صحیح حالات کا جو میرے علم میں ہیں تفصیل سے بیان کر دینا ضروری ہے۔

میاں جی یعنی ہمارے داداجان ۔ میاں جی کے متعلق "زندہ رُود" میں لکھا ہے کہ "یہ کہنا درست نہیں کہ اُن (علامہ اقبال) کے والد احمدی تھے۔" میں نے خاندان کی بزرگ خواتین یعنی بے جی (ہماری دادی صاحبہ) بھابھی جی (میری والدہ صاحبہ) اور دونوں پھوپھیوں خصوصاً پھوپھی کریم بی سے سُنا ہوا ہے کہ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں سلسلۂ احمدیہ سے ہمارے خاندان کے گہرے تعلقات تھے۔ ابّا جان تو سلسلہ

میں شامل ہونے والے ابتدائی حضرات میں سے تھے اور میاں جی بھی جماعت میں شامل ہو گئے تھے۔ میاں جی کے حضرت مولانا حکیم نورالدین (اللہ تعالےٰ ان سے راضی ہو) کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب ان کی اہلیہ محترمہ بھی ان کے ساتھ سیالکوٹ تشریف لائیں تو وہ ہمارے گھر بے جی کے پاس ٹھہریں۔ حضرت مولانا حکیم نورالدین نے بے جی کے درد گردہ کا کامیاب علاج بھی کیا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں جب ہماری منجھلی پھوپھی طالع بی کا انتقال ہوا تو سیالکوٹ کے احمدی حضرات اُن کے جنازہ میں شامل نہ ہوئے۔ اس پر میاں جی نے حضرت میر حامد شاہ جو مولانا میر حسن کے رشتہ دار اور سیالکوٹ کے احمدیوں کے سرکردہ بزرگ تھے کی زبانی حضرت بانی سلسلۂ احمدیہ کو پیغام بھیجا کہ ”میں عمر رسیدہ ہوں، آپ کے ساتھ اس قدر تیز نہیں چل سکتا۔“ اصل میں میاں جی مرنجاں مرنج اور صلح کل طبیعت کے مالک تھے۔ برادری میں اُن کے وسیع تعلقات تھے۔ انہوں نے محسوس کیا ہو گا کہ وہ غیر احمدیوں کا جنازہ نہ پڑھنے والے قاعدہ کی پابندی نہ کر سکیں گے۔ ممکن ہے انہیں اس مسئلہ پہ شرح صدر بھی نہ ہو۔ اس لئے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اُن کے متعلق صرف یہ کہنا کہ وہ احمدی نہ تھے نامکمل بات ہو گی۔ ہاں یہ کہنا درست ہو گا کہ وہ ابتدا میں جماعت میں شامل ہو گئے تھے لیکن ۱۹۰۲ء میں جماعت سے الگ ہو گئے۔

۹۴-۱۸۹۳ء میں احمدیت کی سخت مخالفت ہو رہی تھی۔ لدھیانہ کے ایک نومسلم سعد اللہ سعدی نام اپنی ہجویات میں حضرت بانیٔ سلسلہ کو منظوم گالیاں دیا کرتے تھے۔ یہ ہمارے خاندان کی حضرت بانیٔ سلسلہ سے عقیدت ہی کا اثر ہو گا کہ خاندان کے ایک نوجوان نے جو اُن دنوں سکاچ مشن اسکول کی ایف اے کلاس میں پڑھتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے سعدی لدھیانوی کی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور اکیس اشعار کی ایک ہجو اُن کے متعلق کہی جس کا پہلا شعر ہے۔

واہ سعدی دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی

مہتروں میں خوب ہو گی قدردانی آپ کی

اختصار کی خاطر باقی اشعار نقل نہیں کرتا ۔ یہ ہجو اُن دنوں جماعت احمدیہ کے اخبارات میں شائع ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں شیخ یعقوب علی عرفانی نے اپنی تصنیف "آئینہ حق نما" میں اسے نقل کر کے سلسلۂ احمدیہ کے لٹریچر میں محفوظ کر دیا ہے۔ اُن کے بعد بھی دو ایک احمدیہ کتابوں میں وہ ہجو نقل شدہ ہے۔ ہجو کے نیچے الراقم کا جو نام دیا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کے یہ نوجوان "شیخ محمد اقبال متعلم ایف اے سکاچ مشن اسکول سیالکوٹ" یعنی ہمارے آئندہ ہونے والے شاعر مشرق علامہ اقبال تھے ۔ ہجو میں کہیں کہیں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات صاف نظر آتے ہیں۔

پھر یہ بھی ہمارے خاندان کے حضرت بانیٔ سلسلہ سے عقیدت کا ہی اثر تھا کہ بے جی جنہیں ابّا جان کے ہاں اولاد نرینہ کی بڑی خواہش تھی نے ابّا جان سے حضرت صاحب کو دعا کے لئے خط لکھوایا کہ اللہ تعالےٰ انہیں اولاد نرینہ عطا کرے اور جب ۱۸۹۹ء کے شروع میں راقم الحروف پیدا ہوا تو چچا جان نے نومولود کا نام "اعجاز احمد" رکھا ۔

میاں جی کے جماعت احمدیہ سے علیحدگی کے بعد ہوش سنبھالنے پر میں نے گھر میں احمدیت کا چرچا نہیں سُنا۔ ابّا جی اپنی جائے ملازمت پر ہوتے تھے۔ صرف دو ایک مرتبہ عیدین کے موقعہ پر جب وہ چھٹی پر آئے ہوئے ہوتے ان کے ساتھ عید کی نماز کے لئے بیت کبوتراں والی میں جہاں اُن دنوں احمدیہ جماعت نمازیں پڑھتی تھی جانا یاد ہے جو کچھ اوپر تحریر کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ۱۹۰۲ء تک ہمارے خاندان کا سلسلہ احمدیہ سے رابطہ قائم تھا۔ ۱۹۰۲ء میں میاں جی نے جنازے کے مسئلہ پر اختلاف کی وجہ سے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی ۔

ابّا جان : ابّا جان کے متعلق "زندہ رُود" میں لکھا ہے کہ انہوں نے " اپنی زندگی کے ایک حصّہ میں احمدی مسلک قبول کیا اور کچھ مدّت تک جماعتِ احمدیہ میں شامل رہے مگر بعد ازاں احمدیت کو ترک کر کے جماعت سے رشتہ توڑ دیا" اس روایت کے راوی کوئی بھی ہوں اور یہ روایت بیان کرنے کی وجہ ان کی واقعات سے لاعلمی یا ان کی معاشرتی

مجبوریاں اور مصلحتیں کچھ بھی ہو یہ روایت درست نہیں اور دستاویزی شہادت کے خلاف ہے۔ ابّاجان جماعت احمدیہ میں ابتدائی شامل ہونے والوں میں سے تھے۔ وہ ان ۳۱۳ دوستوں میں سے ہیں جن کے نام بانیٔ سلسلہ نے اپنی کتاب ضمیمہ انجام آتھم میں درج کئے ہیں۔ اس فہرست میں ان کا نام نمبر ۲۲۴ پر ہے۔ معلوم ہوتا ہے بانیٔ سلسلہ سے ان کا ذاتی تعلق بھی تھا اور خط وکتابت بھی تھی۔ وفات کے بعد ان کی کتابوں کی الماری سے بانیٔ سلسلہ کی تصنیف کردہ کئی کتابیں ملیں۔ جن میں سے تین کتابیں تو حضور کے دستخطوں سے بھی مزیّن ہیں۔ اُن کے کیش بکس سے حضور کا دستخطی ۱۲ر دسمبر ۱۹۰۷ء کا ایک مکتوب بھی حفاظت سے رکھا ہوا ملا اور حضور کی شبیہہ مبارک تو وفات تک اُن کے کمرے کی زینت رہی۔

۱۹۱۴ء میں حضرت حکیم نورالدین بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے پہلے جانشین (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) کے وصال کے بعد جماعت میں خلافت کے مسئلہ پر اختلاف ہوگیا۔ کچھ زعماء نے قادیان چھوڑ کر لاہور میں علیحدہ انجمن قائم کر لی۔ جماعت میں اس اختلاف سے کچھ احمدی بڑے دل گرفتہ ہوئے۔ ابّاجان بھی ان میں سے ایک تھے۔ وہ دونوں میں سے کسی فریق کے ساتھ شامل نہ ہوئے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ "انہوں نے احمدیت کو ترک کرکے جماعت سے رشتہ توڑ لیا" درست نہ ہوگا۔ وہ بدستور احمدیت پر قائم رہے اس کا ثبوت ان کے ایک خط سے ملتا ہے جو جماعت میں اختلاف کے پندرہ سال بعد کا لکھا ہوا ہے۔ ہوا یہ کہ ۱۹۲۹ء میں میری ایک چھوٹی ہمشیرہ کے لئے ہماری برادری کے ایک معزز احمدی خاندان کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان کا رشتہ آیا۔ اس خاندان کی مستورات سے ہماری مستورات کا ملنا جلنا تھا اور شاید میاں جی کے ننھیال کے ناطے سے کچھ دور کا رشتہ بھی تھا۔ رشتہ آنے کی خبر نکلی تو ہماری برادری اور محلے کے ایک نوجوان احراری خدائی فوجدار نے چچا جان کو خط لکھا کہ لڑکی کا رشتہ یہاں نہ کیا جائے کیونکہ لڑکا کٹر مرزائی ہے۔ چچا جان نے وہ خط ابّاجان کو بھیج دیا۔ میں اُن دنوں جھنگ میں سب جج تھا۔ ابّاجان نے وہاں مجھے اس واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا

"بجواب میں نے لکھ دیا ہے (چچا جان کو) کہ کٹر مرزائی ہونا اس رشتہ پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ البتہ اگر لڑکے کے چال چلن وغیرہ پر کوئی اعتراض ہوتا تو غور کے لائق تھا۔ میں خود بھی تو مرزائی ہوں لیکن مجھ میں اُن میں صرف جنازہ کے سوال کا فرق ہے۔"
یہ خط میرے پاس محفوظ ہے اور میرے عزیزوں میں سے جو چاہے دیکھ سکتا ہے۔
اس خط سے ظاہر ہے کہ ۲۹ء میں بھی ابا جان احمدیت پر قائم تھے۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ یہ رشتہ جو آیا تھا منظور نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ لڑکا احمدی تھا بلکہ اس لئے کہ چند سال پہلے جب میرے لئے رشتہ کی تلاش تھی یہ میرا رشتہ اس خاندان کی ایک لڑکی کے لئے گیا تھا۔ اُن دنوں میں ابھی بیعت کر کے جماعت میں شامل نہ ہوا تھا۔ رشتہ کی منظوری کے لئے بیعت کی شرط لگائی گئی۔ لیکن میں نے صرف رشتہ حاصل کرنے کے لئے بیعت کرنا اصولاً غلط سمجھا۔ اس لئے رشتہ منظور نہ کیا گیا۔ مستورات میں ایسی باتوں کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ ہماری مستورات نے یہ رشتہ اس بنا پر منظور نہ کیا کہ انہوں نے ہمارے لڑکے کا رشتہ منظور نہ کیا تھا۔
۱۹۲۹ء کے غالباً دو ایک سال بعد کی بات ہوگی کہ میں نے بیعت کر لی۔ اس کے بعد چودھری ظفر اللہ خان صاحب کسی سلسلہ میں سیالکوٹ آئے اور ہمارے ہاں قیام کیا۔ اُن کا بیان ہے کہ جب انہوں نے ابا جان سے میرے بیعت کر لینے کا ذکر کیا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔" چودھری صاب۔ اوُنے میرے پچھے ای آناں سی کہ مامے پچھے جاناں سی۔" (چودھری صاحب اُس نے میرے پیچھے ہی آنا تھا نہ کہ اپنے ماموں کے پیچھے) میرے ماموں شیخ غلام نبی بڑے نیک اور شریف النفس بزرگ تھے لیکن عقیدتاً کٹر وہابی اور احمدیت کے مخالف۔ میرے بیعت کر لینے کے بعد شاید دوسرے سال ابا جان نے میرے ہاتھ اپنی بیعت کا خط جماعت احمدیہ کے امام کے نام بھیجا تھا اور حضور نے بیعت منظور کر لی تھی۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دو ایک سال بعد میرے ہمراہ قادیان گئے اور میرے مواجہہ میں دستی بیعت بھی کی۔ اس کی خبر روزنامہ الفضل کی ۱۰ اپریل ۳۴ء کی اشاعت میں درج ہے " زندہ رُود" میں یہ ذکر نہیں کہ

کہ راویوں کے بقول ابا جان نے کب "احمدیت کو ترک کر کے جماعت سے رشتہ توڑا۔"
میرا خیال ہے جاوید کے راویوں نے ۱۹۱۴ء کے بعد ابا جان کے احمدیوں کے کسی ایک
فریق کے ساتھ شامل نہ ہونے سے یہ نتیجہ نکالا ہوگا جس کا غلط ہونا ابا جان کے ۲۹ء
کے خط سے ثابت ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں "زندہ رُود" میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابا جان کی نمازِ جنازہ شہر کے
ایک سنّی امام مولوی سکندر خان نے پڑھائی جس میں مصنف بھی شامل تھے اگرچہ یہ
بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ میں نے اور احمدی احباب نے بقول مصنف "غالباً شیخ عطا محمد
کے گزشتہ یا مفروضہ عقیدے کے پیشِ نظر علیحدہ نمازِ جنازہ پڑھی۔" یہ درست ہے
کہ ابا جان کے جنازہ کے ساتھ ہماری برادری کے کئی اشخاص اور ابا جان کے کئی ذاتی
دوست تھے۔ جاوید کا اس وقت لڑکپن تھا۔ اس لئے انہوں نے یہ بات نوٹ نہ کی
ہو یا انہیں یاد نہ رہی ہو کہ میرے چھوٹے بھائی امتیاز مرحوم نے مجھے کہا کہ یہ لوگ ابا جان
کا جنازہ پڑھنا چاہتے ہیں لیکن اپنے امام کے پیچھے۔ کیا اس میں آپ کو کوئی اعتراض ہے
میرے نزدیک یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی اور میں نے بہ خوشی اجازت دی بلکہ
کہا کہ وہ لوگ پہلے جنازہ پڑھ لیں بعد میں ہم پڑھ لیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہاں یہ
غلط فہمی بھی دور کر دوں کہ احمدیوں میں جنازہ کسی کے گزشتہ یا مفروضہ عقیدے کے
پیشِ نظر نہیں پڑھا جاتا۔

علامّہ اقبال :۔ چچا جان کے متعلق "زندہ رُود" میں لکھا ہے کہ "اس بات
میں کوئی صداقت نہیں کہ اقبال نے اپنی زندگی کے کسی مرحلے پر مرزا غلام احمد کی بیعت
کی"۔ مجھے بھی احمدیہ لٹریچر میں علامّہ کے کسی وقت حضرت صاحب کی بیعت کرنے کی
کوئی معتبر شہادت نظر نہیں آئی۔ ماہنامہ رسالہ "الفرقان" ربوہ (جولائی اگست ۱۹۶۷ء
کے ایک مضمون میں مولوی غلام محی الدین قصوری ایڈووکیٹ (جو ابتدا میں جماعت احمدیہ
میں شامل ہوئے لیکن بعد میں علیحدہ ہوگئے) کی روایت بیان کی گئی ہے کہ ۱۸۹۷-۹۶ء
میں جب ڈاکٹر اقبال بی۔ اے کلاس میں پڑھتے تھے تو آپ بانئ سلسلہ احمدیہ کی بیعت

میں شامل ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ ایک روایت خواجہ نذیر احمد ایڈووکیٹ کی ہے جو غیر مبائعین کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اضطرابات پنجاب کے سلسلہ میں انکوائری کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ اقبال نے ۱۸۹۳ء یا ۱۸۹۴ء میں بیعت کی تھی لیکن یہ بھی تسلیم کیا کہ انہیں اس کا ذاتی علم نہیں۔ میرے نزدیک علامہ کی بیعت ثابت کرنے کے لئے یہ شہادت جس میں بیعت کے سن کے متعلق بھی اختلاف ہے کافی نہیں۔ مزید برآں حسب ذیل باتیں بیعت کی تردید کرتی ہیں۔

(الف) مئی ۱۹۰۲ء کے ماہنامہ مخزن میں چچا جان کی ایک نظم شائع ہوئی تھی۔ اُس کا عنوان تھا "منظوم خط۔ پیغام بیعت کے جواب میں"۔ ظاہر ہے کہ مئی ۱۹۰۲ء سے کچھ پہلے کسی نے چچا جان کو بیعت کے لئے لکھا ہوگا جس کے جواب میں انہوں نے یہ نظم شائع کرائی۔ مجھے ذاتی علم نہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ یہ پیغام بیعت سیّد حامد شاہ صاحب نے دیا تھا جو مولانا میر حسن کے عزیزوں میں سے تھے اور سیالکوٹ کی جماعت احمدیہ کے سرکردہ رکن تھے۔ پیغام کسی طرف سے بھی گیا ہو اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ اس سے پہلے اقبال نے بیعت نہیں کی ہوئی تھی۔ اگر کی ہوتی تو یہ پیغام کیوں بھیجا جاتا۔

(ب) چچا جان کسی مسیح یا مہدی کے آنے کے قائل ہی نہ تھے۔ ان کی ۱۹۰۵ء کی ایک غزل کا شعر ہے :-

مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
یہ انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

یہ غزل ماہنامہ "مخزن" کی مئی ۱۹۰۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئی۔ اُس وقت اس میں ۱۴ اشعار تھے۔ یہ غزل بانگِ درا میں بھی ہے۔ لیکن مندرجہ بالا شعر اور ایک اور شعر حذف کر دیئے گئے ہیں۔ اُن کی وفات کے بعد کسی نے "رختِ سفر" کے نام سے اُن کا کچھ غیر مطبوعہ کلام شائع کیا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ متروکہ دو شعر اُس میں شائع شدہ ہیں۔ بہر حال میری بیاض میں دونوں شعر درج ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق مہدی کی آمد، مسیحؑ کے دوبارہ ظہور اور مجددیت کے متعلق جو احادیث ہیں وہ ایرانی اور عجمی

تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ عربی تخیلات اور قرآن کریم کی صحیح سپرٹ سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ احمدیت کے خلاف اپنے مضمون QADIANIS AND ORTHODOX MUSLIMS میں بھی اسی عقیدے کا اظہار کیا ہے اور مسلمانوں میں انتظار مسیح موعود و مہدی کے عقیدے کو پھیلانے کا ذمہ دار AMBITIOUS AND IGNORANT MULLAISM کو قرار دیا ہے (۳)

اس عقیدہ کو رکھتے ہوئے وہ کسی مسیح موعود کا دعویٰ کرنے والے کی بیعت کیسے کر سکتے تھے۔ قصہ مختصر اُن کے بیعت کرنے کی بات درست معلوم نہیں ہوتی لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ۱۹۳۵ء تک احمدیوں کو مسلمانوں کا ایک فرقہ سمجھتے تھے! ان کی اشاعتِ اسلام کی مساعی سے انہیں ہمدردی تھی اور اشاعتِ اسلام کا جوش جو جماعت احمدیہ کے اکثر افراد میں پایا جاتا ہے اسے قابلِ قدر سمجھتے تھے[۲]۔ اگرچہ ان کے بعض عقائد مثلاً ختمِ نبوت وغیرہ سے انہیں اختلاف بھی تھا اور اس کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔

مسیح و مہدی و مجددیت کی احادیث کے متعلق اُن کا عقیدہ جو اوپر بیان کیا گیا ہے اپنی جگہ لیکن ان کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی کسی روحانی مصلح کی آمد کے منتظر نہ سہی لیکن اس کی ضرورت ضرور محسوس کرتے تھے اور ایسے مصلح کے آنے کی خواہش کرتے تھے۔ اصل میں عقل و دل کی کشمکش میں ان کی راتیں ہی نہیں دن بھی گزرتے تھے (۴)۔ عقل مسیح و مہدی کے آنے کی احادیث کو عجمی تخیلات کا نتیجہ قرار دیتی لیکن اُن کا دل اُمتِ مسلمہ کی اصلاح کی فکر میں عطا ہوئی تھی جیسے روز و شب۔ کبھی یہ "تابی" حیب دیکھتا کہ "وضع میں یہ ہیں نصاریٰ تو تمدن میں ہنود : یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود" اور جب اس دور کے مُلّا انہیں ننگِ مسلمانی نظر آتے (۵) تو پکار اٹھتا "کاش کہ مولانا نظامی کی دعا اس زمانے میں مقبول ہو اور رسول اللہ صلعم پھر تشریف لائیں اور ہندی مسلمانوں پر اپنا دین بے نقاب کریں۔" (۶) جب وہ دیکھتے کہ "موجودہ زمانہ روحانیت کے اعتبار سے بالکل تہی دست ہے۔ اسی واسطے اخلاص، محبت، مروت و یک جہتی کا نام و نشان نہیں رہا۔ آدمی آدمی کا خون پینے والا اور قوم قوم کی دشمن ہے۔ یہ

زمانہ انتہائے تاریکی کا ہے۔" تو فرماتے " لیکن تاریکی کا انجام سفید ہے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرے اور بنی نوع انسان کو پھر ایک دفعہ نور محمدی عطا کرے بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس بدنصیب دنیا کی نجات نظر نہیں آتی۔" (۷)

ایک مغربی دانشور پروفیسر میکنزی نے اپنی کتاب "انٹروڈکشن ٹو سوشیالوجی" کے آخری دو پیراگرافس میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

"کامل انسانوں کے بغیر سوسائٹی معراج کمال پر نہیں پہنچ سکتی اور اس غرض کے لئے محض عرفان اور حقیقت آگاہی کافی نہیں بلکہ ہیجان اور تحریک کی قوت بھی ضروری ہے .... ہمیں معلّم بھی چاہیئے اور پیغمبر بھی .... غالباً ہمیں ایک نئے مسیح (۹) کی ضرورت ہے .... اس عہد کے پیغمبر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس ہنگامہ زار میں وعظ و تبلیغ کرے ....۔"

علامہ اقبال نے اپنے خط محررہ ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء بنام ڈاکٹر نکلسن (جس نے "اسرار خودی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا) میں پروفیسر میکنزی کے ان دو پیراگرافس کو لفظ بہ لفظ نقل کرکے لکھا ہے: (۸) "HOW VERY TRUE ARE THE LAST TWO PARAGRARHS of PROF. MACKENZIE'S INTRODUCTION TO SOCIAL PHILOSOPHY" (پروفیسر میکنزی کی کتاب "انٹروڈکشن ٹو سوشیالوجی" کے یہ دو آخری پیراگراف کس قدر صحیح ہیں)

اسی خط میں یہ بھی لکھتے ہیں " ہمارے عہد نامے، ہماری لیگیں، ہماری پنچائتیں اور کانفرنسیں جنگ و پیکار کو صفحۂ حیات سے ختم نہیں کرسکتیں۔ کوئی بلند مرتبہ شخصیت ہی ان مصائب کا خاتمہ کرسکتی ہے:۔ اور اس شعر میں مَیں نے اُسی کو مخاطب کیا ہے

باز در عالم بیار ایّام صُلح
جنگ جویاں را بدہ پیغام صُلح

مآخذ

(۱) "مئے لالہ فام" جاوید اقبال (۱۹۶۶) غلام علی اینڈ سنز لاہور

(۲) اقبال نامہ حصّہ دوم۔ مکتوب بنام چودھری محمد احسن صفحات ۲۳۰، ۲۳۱

(۳) تھاٹس اینڈ ریفلیکشنز آف اقبال مرتبہ سیّد عبدالواحد (۱۹۷۳) صفحات ۲۴۹، ۲۵۰

(۴) اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں

(۵) مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی

اس دور کے مُلّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

(بالِ جبریل)

(۶) اقبال نامہ۔ حصّہ اول۔ مکتوب بنام سراج دین صاحب پال محررہ ۱۹ر جولائی ۱۹۱۶ء صفحہ ۴۱

(۷) علامہ کا مکتوب محررہ ۳ر جنوری ۱۹۲۰ء اپنے والد کے نام۔ خط کی نقل اس کتاب کے مکتوبات کے حصّہ میں شامل ہے۔ اصل خط پاکستان نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے۔

(۸) علامہ کا خط انگریزی میں ہے جس کی نقل "تھاٹس اینڈ ریفلیکشنز آف اقبال" مرتبہ (۱۹۷۳ء) کے صفحات ۹۳ تا ۱۰۲ پر دی گئی ہے۔ خط کا اردو ترجمہ اقبال نامہ حصہ اوّل مرتبہ شیخ عطا اللہ (۱۹۴۵ء) صفحات ۴۵۷ تا ۴۷۴ پر ہے۔

(۹) پروفیسر میکینزی کی کتاب کے دو پیراگرافس میں جو علامہ اقبال نے مکتوب بنام ڈاکٹر نکلسن میں نقل کئے ہیں لفظ A NEW CHRIST استعمال ہوا۔ اقبال نامہ کے لئے خط کو اردو میں ترجمہ کرنے والے صاحب نے لفظ NEW کو حذف کر دیا ہے۔

باب ۳۳

علامہ اقبال اور احمدیت

اپنی حیات کے آخری تین چار سالوں میں چچا جان نے احمدیت کے خلاف جو محاذ کھڑا کیا اس کی ابتدا مئی ۱۹۳۵ء میں ہوئی جب احمدیت کے متعلق ان کا ایک بیان پہلے اردو روزناموں "زمیندار" اور "احسان" میں اور پھر انگریزی روزنامہ سٹیٹس مین میں ۱۴ مئی ۱۹۳۵ء کو شائع ہوا (۱) بیان کا ماحصل یہ تھا کہ چونکہ احمدی سرکار دو عالم کے بعد ختم نبوت کے قائل نہیں اس لئے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ بیان میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم اس جماعت کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ یہ مطالبہ ایسا عجیب تھا کہ سٹیٹس مین کے ایڈیٹر نے اپنے اداریے میں اس پر تنقید کی۔ بعد ازاں پنڈت جواہر لعل نہرو نے اس پر تین تنقیدی مضامین رسالہ ماڈرن ریویو کلکتہ میں شائع کئے۔ معلوم ہوتا ہے ان مضامین سے علامہ اور برافروختہ ہوئے۔ نہرو کی تنقید سے انہیں احمدی کانگرسی سیاسی گٹھ جوڑ کا شبہ ہوا جو بے بنیاد تھا۔ انہوں نے ایڈیٹر سٹیٹس مین کے اداریے کے جواب میں اُن کو ایک خط لکھا (۲) اور پنڈت نہرو کے جواب میں بھی ایک مفصل وضاحتی بیان میں اپنے پہلے بیان کا اعادہ کیا (۳) ان سب تحریروں کا لب لباب وہی تھا جو پہلے بیان کیا گیا ہے۔

احمدیوں کے متعلق ان کے تکفیری بیانات کو مسلمانوں کے سنجیدہ حلقوں میں بھی تعجب سے پڑھا گیا۔ اوّل اس لئے کہ چاچا جان تو ملاؤں کے شغل تکفیر بازی کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ خود بھی اس اوچھے اور کثرتِ استعمال سے گندشدہ ہتھیار سے گھائل ہو چکے تھے۔ دوسرے اس لئے کہ احمدیوں کے دو ایک عقائد سے اتفاق اور دو ایک سے اختلاف کے باوجود علامہ عمر بھر اپنے قول و فعل سے احمدیوں کو مسلمانوں کا ایک فرقہ تسلیم کرتے رہے تھے اور مئی ۱۹۳۵ء سے قبل انہوں نے کبھی احمدیت کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار نہیں کیا تھا اور اس وقت تک بانی سلسلہ احمدیہ اور ان کے دو جانشینوں کے متعلق اُن کی رائے عقیدت مندانہ رہی تھی۔ اس دعوے کی تائید حسب ذیل باتوں سے ہوتی ہے۔

۱۔ ۱۹۰۰ء میں جب وہ اورینٹل کالج لاہور میں پڑھاتے تھے۔ ان کا ایک مضمون بمبئی کے انگریزی زبان کے رسالہ انڈین اینٹی کویری میں شائع ہوا جس میں انہوں نے بانی سلسلہ احمدیہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا (۴)

"M. GHULAM AHMED OF QADIAN, PROBABLY THE PROFOUNDEST THEOLOGIAN AMONG MODERN INDIAN MUHAMMADENS"

(مرزا غلام احمد قادیانی موجودہ دور کے ہندی مسلمانوں میں غالباً سب سے بڑے دینی مفکر)

(۲) ۱۹۰۲ء میں جب اُن کو بعض فقہی مسائل پر رائے درکار ہوئی تو ہندوستان بھر کے علما، و فقہا کو چھوڑ کر بانی سلسلہ احمدیہ کے پہلے جانشین حضرت مولانا نورالدین (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) سے رجوع کیا۔ علامہ کو جن سوالات پر رائے درکار تھی اور حضرت مولانا کے جوابات انہیں دنوں سلسلہ احمدیہ کے اخبارات میں شائع ہو گئے تھے (۵)

(۳) ۱۹۱۰ء کے آغاز میں انہوں نے ایم اے او کالج علی گڑھ میں انگریزی زبان میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا جو "ملّتِ بیضا پر ایک

عمرانی نظر" کے عنوان سے مرغوب ایجنسی لاہور نے ایک دبدبہ زیب کتابچہ کی شکل میں شائع کیا۔ اس تقریر کا یہ اردو ترجمہ مئی ۱۹۱۱ء میں مولانا ظفر علی خاں نے برکت علی محمڈن ہال لاہور میں ایک جلسۂ عام میں پڑھ کر سنایا جس میں علامہ اقبال بھی موجود تھے۔ اس تقریر میں علامہ نے جماعت احمدیہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

"پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔" (۶)

(۴) یہ اسی رائے کا نتیجہ ہوگا کہ انہی دنوں علامہ نے اپنے بڑے بیٹے بھائی آفتاب مرحوم کو جو سیالکوٹ کے ایک مشن سکول میں تعلیم پا رہے تھے قادیان بھیج کر وہاں کے تعلیم الاسلام سکول میں داخل کرایا۔

(۵) ۱۹۱۳ء میں چچا جان کو ایک ذاتی معاملہ میں شرعی فتوے کی ضرورت پڑی تو اپنے دوست مرزا جلال الدین بیرسٹر کو قادیان بھیجا کہ بانی سلسلہ احمدیہ کے جانشین اول مولانا حکیم نور الدین (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) سے مسئلہ دریافت کریں۔ حضرت مولانا نے جو مشورہ دیا علامہ نے اس پر عمل کیا۔ اس احوال کی تفصیل مولانا سالک کے "ذکر اقبال" میں درج ہے (۷)

(۶) مارچ ۲۷ء میں بانی سلسلہ احمدیہ کے دوسرے جانشین حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) کا ایک لیکچر "مذہب اور سائنس" کے موضوع پر علامہ اقبال کے زیر صدارت لاہور میں ہوا۔ لیکچر کے بعد صدارتی خطاب میں علامہ نے فرمایا :- "ایسی پُر از معلومات تقریر بہت عرصہ بعد لاہور میں سننے میں آئی ہے اور خاص طور پر جو قرآن کریم کی آیات سے مرزا صاحب نے استنباط کیا ہے وہ نہایت عمدہ ہے ...... مجھے اس تقریر سے جو لذت حاصل ہو رہی ہے وہ زائل نہ ہو جائے۔ اس لیے میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

(۷) ۵ ستمبر ۳۰ء کو علامہ نے جماعت احمدیہ کے امام حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) کے سیکرٹری کو ایک خط میں لکھا :-

"چونکہ آپ کی جماعت منظم ہے اور نیز بہت سے مستعد آدمی اس جماعت میں موجود ہیں اس واسطے آپ بہت مفید کام مسلمانوں کے لئے انجام دے سکیں گے۔" (۹)

(۸) کشمیر کے مسلمان ڈوگرہ راج کے ظلم کی چکی میں پس رہے تھے۔ آزادیٔ کشمیر کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ وسط ۱۹۳۱ء میں مسلمانان سرینگر کے پُرامن اور نہتے مجمع کو ریاستی حکام نے گولیوں کا نشانہ بنا کر مسلمانانِ ریاست کی بے کسی اور مظلومیت انتہا تک پہنچا دی۔ جماعت احمدیہ کے اُس وقت کے امام نے پنجاب اور ہندوستان کے سرکردہ مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلائی اور درخواست کی کہ وہ جمع ہو کر کشمیر کے معاملہ پر غور کریں چنانچہ ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو نواب ذوالفقار علی خاں کی کوٹھی واقع شملہ میں ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں علامہ اقبال اور ہندوستان کے بہت سے مسلم اکابرین شامل ہوئے۔ طے پایا کہ ایک آل انڈیا کشمیر کمیٹی بنائی جائے جو تحریک آزادیٔ کشمیر کے سارے کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔ جو اکابرین اجلاس میں موجود تھے۔ سب نے کمیٹی کا رکن بننا منظور کیا۔ علامہ اقبال نے تجویز کیا کہ جماعت احمدیہ کے امام اس کمیٹی کے صدر ہوں کیونکہ ان کے پاس مخلص اور کام کرنے والے کارکن بھی ہیں اور وسائل بھی۔ امام جماعت احمدیہ نے اپنے اور اپنی جماعت کے تعاون کا یقین دلایا لیکن کمیٹی کی صدارت قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ لیکن علامہ اور دوسرے اکابرین کے اصرار پر صدارت قبول کر لی۔ کچھ دنوں بعد علامہ نے ایک خط میں امام جماعت احمدیہ کو لکھا کہ "کشمیر کے متعلق آپ کی کوششیں یقیناً بار آور ہوں گی۔ مگر ذرا ہمت سے کام لیجئے اور اس معاملہ کو انجام تک پہنچائیے۔" اسی خط میں مشورہ دیا "اس تجویز کی بجائے یہ کیجئے کہ تین معززین کا وفد جس میں ایک آپ ہوں انگلستان جائے اور وہاں صرف دو ماہ قیام کرے اور انگریزوں اور پارلیمنٹ کو کشمیر کی تاریخ اور موجودہ حالات سے آگاہ کرے۔ اس پر زیادہ سے زیادہ آٹھ ہزار روپیہ خرچ ہوگا اور نتائج بے انتہا خوشگوار ہوں گے۔" (۱۰)

(۹) ۱۹۳۱ء کے نصف آخر میں علامہ اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے

لندن تشریف لے گئے۔ احمدیہ مسجد لندن کے امام مولانا فرزند علی مرحوم نے علامہ اقبال اور بعض دوسرے اکابرین کو مسجد میں ایک تقریب میں شمولیت کی دعوت دی۔ مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر روزنامہ "انقلاب"، لاہور بھی انہی دنوں لندن میں تھے۔ وہ بھی اس تقریب میں شامل ہوئے۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں جو "انقلاب" لاہور میں شائع ہوا لکھا:

"علامہ اقبال لندن کے قیام کے دوران میں احمدیہ مسجد لندن کی ایک تقریب میں شامل ہوئے جہاں نومسلم انگریزوں کی زبان سے قرآن مجید سن کر خوش ہوئے۔ اور خصوصاً ایک انگریز نوجوان مسٹر عبدالرحمن ہارڈی کے حسن قرأت اور صحیح تلفظ سے بے حد محظوظ ہوئے۔ ایک چھ سال کی انگریز بچی نے سورۃ فاتحہ سنائی جس پر علامہ نے اسے ایک پاؤنڈ انعام دیا اور امام مسجد لندن مولوی فرزند علی صاحب کا شکریہ ادا کیا جن کی توجہ سے یہ موقع میسر آیا۔" (۱۱)

(۱۰) ۱۹۳۲ء میں ایک صاحب چودھری محمد احسن کے نام اپنے خط میں علامہ اقبال نے لکھا:

"اشاعت اسلام کا جوش جو اُن (بانی سلسلہ احمدیہ - ناقل) کی جماعت کے اکثر افراد میں پایا جاتا ہے قابلِ قدر ہے" (۱۲)

(۱۱) علامہ اقبال کئی سال انجمن حمایت اسلام لاہور کی مجلس انتظامیہ کے رکن رہے اور کچھ عرصہ انجمن کے صدر بھی رہے۔ دو ایک احمدی بھی مجلس انتظامیہ کے رکن ہوتے تھے۔ انجمن کے سالانہ جلسوں میں احمدی مقررین بھی تقریریں کرتے تھے۔ محاذ آرائی سے پہلے علامہ نے کبھی اس پر اعتراض نہ کیا۔ اسی طرح مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس میں احمدیوں کی شمولیت پر علامہ کی طرف سے کبھی اعتراض نہ ہوا۔ بلکہ ایک سال تو چودھری ظفر اللہ خاں احمدی لیگ کے صدر بھی رہے۔ لیکن علامہ کی طرف سے کوئی احتجاج نہیں ہوا۔

(۱۲) پنجاب کونسل کے انتخاب میں چودھری ظفر اللہ خاں ایک مسلم حلقے سے منتخب ہوئے۔ علامہ بھی لاہور سے منتخب ہوئے اور دونوں یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ علامہ

اقبال کی طرف سے چودھری صاحب کے ایک مسلم حلقہ سے منتخب ہونے پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔

مندرجہ بالا حقائق اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ ۱۹۳۵ء کے آغاز تک علامہ اقبال کے نزدیک احمدی دائرہ اسلام سے خارج نہ تھے۔ مسلمانوں کے مفاد کی نگہداشت کی تحریکوں میں وہ نہ صرف اُن سے تعاون کرتے تھے بلکہ تحریک آزادئ کشمیر میں جماعت احمدیہ کے امام کو تحریک کی قیادت بہ اصرار سونپی تھی۔ ان دنوں تو تعصب کا دور دورہ ہے لیکن ایک زمانہ آئے گا جب تعصب کی گھٹا چھٹ جائے گی اور محقق حضرات ضرور اس بات کی چھان بین کریں گے کہ احمدی جماعت جو بقول علامہ اقبال "اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ تھی" ۱۹۳۵ء میں ایکا ایکی کیوں علامہ کی رائے میں دائرہ اسلام سے یکسر خارج ہوگئی۔ ایسی تحقیق کے نتیجے میں انہیں معلوم ہوگا کہ احمدیت کے متعلق علامہ کی رائے میں تبدیلی جس کے لئے شاید قلبِ ماہیت کا لفظ زیادہ موزوں ہو کی وجہ کانگریس احرار سازش کے تحت احرار کا دباؤ اور ان کی ریشہ دوانیاں تھیں۔ سازشیوں کی خوش قسمتی سے انہی دنوں ایک ذاتی معاملہ میں علامہ کا احساسِ محرومی بھی شامل ہوگیا جس کی وجہ سے احمدیت کے خلاف ان کے بیانات میں وہ شدّت اور تلخی درآئی جو عام طور پر اُن کے شیوہ کے مطابق نہ تھی۔ آئندہ کے تحقیق کرنے والوں کی راہنمائی کے لئے مختصراً کچھ اشارات درج کئے جاتے ہیں۔

کشمیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی چلانے کے لئے ہندوستان کے مسلم اکابرین کے ایک اجتماع میں ایک آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کئے جانے اور اس کی قیادت جماعت احمدیہ کے سپرد کئے جانے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس کمیٹی کی مساعی سے تھوڑے ہی وقت میں کشمیری مسلمانوں کی تحریک آزادی میں جان پڑ گئی۔ اس صورت حال نے کشمیر کے ہندو مہاراجہ اور ہندوستان کی ہندو نواز کانگریس دونوں کو پریشان کر دیا۔ تحریک کو سبوتاژ کرنے کے لئے کانگریس نے اپنی باجگذار مجلس احرار کو آلۂ کار بنایا۔ باخبر حلقوں کا تو اُن دنوں بھی خیال تھا کہ تحریک آزادی کشمیر کو سبوتاژ کرنے کی احراری سازش سے پردہ اٹھا تو اُس میں کچھ کانگرسی پردہ نشینوں کے بھی نام آئیں گے۔ چنانچہ اس کا ثبوت اب احرار کی

ایک کتاب "رئیس الاحرار" سے ملتا ہے۔ اس میں احراری لیڈر حبیب الرحمٰن لدھیانوی لکھتے ہیں:۔

"ہم نے موجودہ کشمیر کمیٹی (جس کے سربراہ جماعت احمدیہ کے امام تھے۔ ناقل) کی سیاسی سازش۔ ڈاکٹر اقبال کی کشمیر کمیٹی میں شمولیت سر فضل حسین کی سرپرستی اور انگریزی حکومت کی بدنیتی۔ فرقہ داران فسادات اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں مولانا آزاد سے تفصیلی گفتگو کی تو مولانا آزاد نے سب باتیں سُن کر کہا کہ احرار کو فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے مسئلہ کشمیر کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیئے" (۱۳) گویا احرار کو تحریک آزادیٔ کشمیر کو سبوتاژ کرنے کی مہم کے لئے مارچنگ آرڈر کانگریس کے مولانا آزاد سے ملے اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے درکار فنڈز بھی وہیں سے ملے ہوں گے۔ ان مارچنگ آرڈر کی تعمیل کے متعلق حبیب الرحمان لدھیانوی لکھتے ہیں:۔ "احرار رہنماؤں نے محسوس کیا کہ کشمیر کمیٹی کی وجہ سے تمام مسلمان مرزائی اور قادیانی ہو جائیں گے۔ ہندو مسلم اتحاد کو سخت دھکا لگے گا۔ مولانا مظہر علی نے مسئلہ کشمیر میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔" (۱۴) اعلان تو کر دیا لیکن احرار اپنی کانگرس نوازی کی وجہ سے مسلمانوں میں اپنی ساکھ کھو چکے تھے۔ اس لئے کوئی انہیں گھاس نہ ڈالتا تھا۔ احراریوں کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ علامہ اقبال جنہیں مسلم عوام میں بڑی مقبولیت حاصل تھی کشمیر کمیٹی سے وابستہ تھے۔ تحریک کشمیر کی قیادت سے جماعت احمدیہ کے امام کو ہٹا کر اپنے ہاتھوں میں لینے کے لئے علامہ کو احمدیوں سے برگشتہ کرنا ضروری تھا۔ احراری لیڈروں کی فراست کی داد دینا پڑتی ہے۔ انہوں نے پہلے تو یہ ہوّا کھڑا کیا کہ احمدی کشمیر میں اپنے مخصوص عقائد کی تبلیغ کر رہے ہیں اور اگر تحریک کشمیر کی قیادت اس جماعت کے امام کے پاس رہی تو کشمیر کے تمام مسلمان مرزائی ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ احراریوں کو اور کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے اس کی تفاصیل خود احراریوں کی زبانی سنیئے۔

مفکر احرار چودھری افضل حق اپنی تصنیف تاریخ احرار میں لکھتے ہیں:۔

"اس دوران میں کشمیر پھر دیوار گریہ بن گیا۔ سرینگر کے خون شہدا کے باعث

کربلا کی سی صورت پیش کی ۔ ابھی ہماری (یعنی احرار کی۔ ناقل) سُست فکری کسی منزل پر نہ پہنچی تھی کہ کچھ عافیت کوش مسلمان شملہ کی بلندیوں سے بادل کی طرح گرجے (آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے قیام کی طرف اشارہ ہے ۔ ناقل) ۔ ان خانہ برباد رؤسا اور امراء (یہ اشارہ ہندوستان کے اُن اکابرین بشمول علامہ اقبال کی طرف ہے جو شملہ کانفرنس میں شامل تھے۔ ناقل) نے یہ غضب ڈھایا کہ مرزا بشیر محمود کو اپنا قائد تسلیم کر لیا۔ جمعیت العلماء نے ستم یہ کیا کہ اس بشیر کمیٹی سے تعاون کا اعلان کر دیا ۔" (۱۵)

تحریک آزادی کشمیر کو کامیاب بنانے کے خیال سے سکندر حیات خان نے کوشش کی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی اور احرار میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے ۔ اس غرض کے لئے انہوں نے اپنے مکان پر ایک میٹنگ کی جس میں علاوہ اور حضرات کے امام جماعت احمدیہ بطور صدر آل انڈیا کشمیر کمیٹی اور چودھری افضل حق بطور نمائندہ مجلس احرار شامل ہوئے۔ باتوں باتوں میں چودھری افضل حق جوش میں آ گئے وہ اپنی تصنیف "تاریخ احرار" میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :" میں نے کہا مرزا صاحب! کوئی الیکشن ایسا نہیں گزرا جس میں مرزائیوں نے میرے خلاف ایڑی چوٹی کا زور نہ لگایا ہو .... ہمارا بھی خدا کے فضل سے فیصلہ ہے کہ اس جماعت کو مٹا کے چھوڑیں گے۔" (۱۶)

گویا کشمیر کے مسلمانوں کی امداد کو پس پشت ڈالتے ہوئے احرار کا اولین مشن یہ قرار پایا کہ چونکہ جماعت احمدیہ نے ہر الیکشن میں چودھری افضل حق کی مخالفت کی ہے اس لئے اس جماعت کو مٹا دیا جائے اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تخریب کر کے تحریک کشمیر اپنے ہاتھ میں لی جائے ۔ چونکہ علامہ اقبال کو عوام مسلمانوں میں مقبولیت حاصل تھی اور وہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی میں شامل تھے۔ اس لئے احرار کے نزدیک یہ ضروری ہوا کہ کسی طرح علامہ اقبال اور جماعت احمدیہ کے تعاون میں رخنہ اندازی کی جائے ۔ اس غرض کو حاصل کرنے کے لئے پہلے تو اپنی روایتی شورہ پشتی سے علامہ کو ڈرانے کی کوشش کی گئی۔ علامہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر تھے۔ مارچ ۱۹۳۲ء کے آخری ہفتہ میں کانفرنس کا اجلاس ہوا پہلے دن خطبہ صدارت میں کشمیر کمیٹی کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے علامہ نے فرمایا :" جہاں تک کشمیر کا تعلق

ہے "مجھے ان واقعات کے تاریخی پس منظر میں جانے کی ضرورت نہیں جو حال ہی میں رونما ہوئے ہیں۔ ایسی قوم کا دفعتاً جاگ اٹھنا جس میں شعلۂ خودی بجھ چکا ہو غم و مصائب کے باوجود ان کے لئے مسرت کا باعث ہے۔" (۱۷)

دوسرے دن جب علامہ کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تو احرار نے علامہ کے پنڈال میں داخل ہوتے ہی جس غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا اس کی مجمل رپورٹ "انڈین انیول ریکارڈ" میں ان الفاظ میں محفوظ ہے :۔

"آل انڈیا مسلم کانفرنس کا دوسرا دن"

آج کانفرنس کا آخری اجلاس شورہ پشتی کے مظاہروں کی نذر ہو گیا۔ اجلاس کی کارروائی دو گھنٹے تاخیر سے شروع ہوئی اور جونہی سر محمد اقبال پنڈال میں داخل ہوئے ان کے ساتھ احراریوں کے ایک بڑے گروہ نے بھی داخل ہونے کی کوشش کی جنہیں روک دیا گیا۔ اس پر کانفرنس کے والینٹروں اور احراریوں میں گیٹ پر باقاعدہ رسہ کشی شروع ہو گئی۔ جس کے نتیجے میں باہم لاٹھیاں چلیں اور خشت باری ہوئی۔ بالآخر پولیس نے مداخلت کر کے مظاہرین کو منتشر کر دیا۔ لیکن جونہی پولیس ہٹی شورہ پشتی پھر شروع ہو گئی اور کانفرنس کی کارروائی بغیر کسی بحث و تقاریر کے جلد جلد ریزولیشن پاس کرنے کی شکل میں تبدیل ہو گئی اور تمام ریزولیشن انتہائی عجلت کے ساتھ اس صورت حال میں پاس ہوئے کہ پنڈال کے باہر مجمع (احراریوں کا نافل) پنڈال میں بزور داخل ہونے کے لئے کوشاں تھا اور مختلف النوع نعرے لگا رہا تھا۔" (۱۸)

علامہ کے خلاف شورہ پشتی کے اس مظاہرے کے بعد جس سے اُن پر یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ عوام مسلمانوں میں آپ کی مقبولیت کے باوجود آپ پر خشت باری بھی کرائی جا سکتی ہے۔ احرار نے ان سے مفاہمت کی طرح ڈالی۔ احرار کے ایک ماہنامے نے حسب ذیل انکشاف کیا ہے۔

"حضرت امیر شریعت (جناب سید عطاء اللہ شاہ بخاری) ڈاکٹر اقبال کو مرشد اور ڈاکٹر اقبال حضرت شاہ صاحب کو پیر جی کہا کرتے تھے۔ کشمیر کمیٹی کے سلسلہ میں ان

دونوں کے درمیان چودھری افضل حق کی معیت میں کئی ملاقاتیں ہوئیں اور طے پایا کہ بشیرالدین محمود احمد اور عبدالرحیم درد کو اگران کی موجودہ ذمہ داری سے نہ ہٹایا گیا تو کشمیر کے ۳۲ لاکھ مظلوم مسلمان کفر و ارتداد کا شکار ہو جائیں گے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ تحریک آزادیٔ کشمیر کی باگ ڈور مجلسِ احرار کے سپرد کر دی جائے۔" (۱۹)

احرار کی خوش قسمتی سے انہیں دنوں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے علامہ کو احمدیہ جماعت سے کشیدہ کرنے میں احرار کی مدد کی۔ سر فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن جون ۳۲ء سے چار ماہ کی رخصت پر جانے والے تھے اُن کی جگہ عارضی تقرری کے لئے علامہ کا نام بھی لیا جا رہا تھا لیکن حکومت برطانیہ نے چودھری ظفر اللہ خاں ایک احمدی کو مقرر کر دیا۔

چودھری افضل حق اور سید عطا اللہ شاہ بخاری کی علامہ اقبال سے "کئی ملاقاتوں" میں جو فیصلہ کیا گیا اس کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں ۴ مئی ۳۳ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ایک خبر شائع کرائی گئی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے بعض ارکان نے صدر کمیٹی کو ایک درخواست بھیجی ہے کہ آئندہ کشمیر کمیٹی کا صدر غیر قادیانی ہونا چاہیئے۔ اس خبر کی اشاعت کے بعد علامہ اقبال اور دس اور اراکین کشمیر کمیٹی کے دستخطوں سے صدر کشمیر کمیٹی (امام جماعت احمدیہ) کو ایک خط ملا کہ پندرہ دنوں کے اندر کشمیر کمیٹی کا اجلاس عہدہ داران کمیٹی کے انتخاب کے لئے بلایا جائے۔ اگرچہ کمیٹی کے بعض اراکین نے صدر کمیٹی کو آگاہ کیا کہ یہ آپ کو صدارت سے علیحدہ کرنے کے لئے ایک چال ہے اس لئے فی الحال آپ اجلاس نہ بلائیں لیکن امام جماعت احمدیہ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور ۷ مئی ۳۳ء کے لئے کمیٹی کا ایک ہنگامی اجلاس بلا لیا اور انتخاب کے لئے راستہ صاف کرنے کی غرض سے اپنا استعفےٰ پیش کر دیا جس پر علامہ اقبال کو اُن کی جگہ عارضی صدر منتخب کیا گیا۔

احرار کے جماعت احمدیہ کے امام کو اس چال سے کشمیر کمیٹی کی صدارت سے علیحدہ کرنے کا ردِّ عمل کشمیر میں کیا ہوا اس کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں۔ مسلمانانِ کشمیر کے لیڈروں مثلاً شیخ عبداللہ، بخشی غلام محمد، چودھری غلام عباس، خواجہ غلام نبی گلکار وغیرہ

نے امام جماعت احمدیہ کے استعفےٰ پر اپنے رنج کا اظہار کیا اور اپنے پیغامات میں خواہش کی کہ امام جماعت احمدیہ تحریک آزادیٔ کشمیر میں اپنی دلچسپی جاری رکھیں۔ کشمیر کے مختلف علاقوں کے اکابرین نے بھی تحریراً اسی خواہش کا اظہار کیا۔ امام جماعت احمدیہ نے سب کو یقین دلایا کہ کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کے باوجود وہ اور ان کی جماعت کشمیر کی تحریک آزادی میں ہر طرح حصہ لیتی رہے گی اور اس وعدہ کا ایفا بھی کیا (۲۰)

احرار کے امیر شریعت اور مفکر احرار کی علامہ اقبال کے ساتھ "کئی ملاقاتوں" کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ علامہ احرار کی تنظیم کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ اس کا اعتراف خود مفکرِ احرار چودھری افضل حق نے ان الفاظ میں کیا ہے ۔

"میں اس پیدا شدہ صورتِ حال سے گھبرا گیا اور لاہور پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا داؤد غزنوی تانگے پر سوار پریشان جا رہے ہیں۔ پوچھا کدھر کا عزم ہے۔ کہا کہ مرزا کی قیادت مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوگی۔ میں شہر کے علماء سے مل کر ان کی قیادت کے خلاف اعلان کرانا چاہتا ہوں۔ .... اسی دن یا اگلے دن علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی صدارت میں محمڈن ہال میں عمائدین شہر کا جلسہ تھا جس میں کشمیر کی اوس پڑی قسمت زیرِ غور تھی۔ مولانا ظفر علی۔ غالباً مولانا داؤد غزنوی بھی اور میں بھی محمڈن ہال گئے۔ خیال یہ تھا کہ کوئی تدبیر لڑا کر مرزا بشیر کی کمیٹی کے مقابلے میں احرار کے حق میں ان لوگوں کی تائید حاصل کی جائے۔ باقی حاضرین طبقہ اولیٰ سے متعلق تھے۔ وہ احرار کے نام پر حقارت سے مُنہ بسورتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب احرار کو آگے بڑھانے پر بضد تھے۔ بہرحال ہم یہ زوری و بہ زاری اُن کا اعلان اپنے حق میں کر دلانے میں کامیاب ہو گئے۔ بس تھوڑی سی کھڑے ہونے کو جگہ ملی تھی۔ بیٹھے اور پاؤں پسار کر ساری جگہ پر قبضہ کرنے کے لئے ہمت درکار تھی۔" (۲۱) مزید لکھتے ہیں " علامہ سر محمد اقبال کشمیر کمیٹی کے ضرور ممبر ہو گئے تھے لیکن یہ کیفیت اضطراری تھی۔ وہ فوراً اُچھل

کر کشمیر کمیٹی کی تخریب میں لگ گئے اور احرار کی تنظیم کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنے لگے۔" (۲۲)

حبیب الرحمن لدھیانوی" علامہ اقبال کو مرزائیت کے چنگل سے نجات دلانے" کا قصہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔ "حضرت شاہ صاحب (مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری۔ ناقل) نے تحریکِ خلافت کے زمانے سے لے کر تحریک احرار کے زمانہ تک میری اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سرپرستی فرمائی۔ انہوں نے قادیانیوں کے بارے میں جماعت احرار کا نقطۂ نظر۔ اسلام میں ختم نبوت کی بنیادی اہمیت سمجھانے کے لئے سر ڈاکٹر محمد اقبال سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر اقبال کو اپنا ختم نبوت کا رسالہ پڑھ کر سنایا۔ اس کے فوراً بعد ہی ڈاکٹر اقبال نے کشمیر کمیٹی کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا جس کے صدر مرزا بشیر الدین محمود قادیانی تھے۔ اس طرح ڈاکٹر اقبال نے مرزائیت کے چنگل سے نجات پائی اور اسلام کے صحیح اعتقادات پر عقیدہ رکھنے کی ڈاکٹر صاحب کو توفیق حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے قادیانیوں کے خلاف مضامین لکھے" (۲۳)

مجلس احرار خالصتاً ایک سیاسی جماعت تھی۔ اُن کی تحریک احمدیت کی مخالفت میں کئی عوامل کار فرما تھے۔ مثلاً نہرو رپورٹ اور کانگرس کی اندھا دھند تائید کی وجہ سے مسلمانوں میں اُن کی مقبولیت کو سخت دھچکا لگا تھا۔ اس کے ازالہ اور دوبارہ مسلمانوں میں نفوذ و مقبولیت حاصل کرنے کے لئے احمدیت کی مخالفت ایک آسان اور کارگر ہتھیار تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کی رائے میں احرار کے تحریک کشمیر میں دلچسپی لینے کی ایک اور وجہ مسلمانوں سے مالی منفعت کا حصول بھی تھا (۲۴) مزید برآں سکندر حیات خاں کے مکان پر جس میٹنگ کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اس میں چودھری افضل حق کہہ چکے تھے کہ چونکہ احمدیوں نے ہر الیکشن میں ان کی مخالفت کی ہے اس لئے وہ اس جماعت کو مٹا دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ احرار اپنے اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کی سعیٔ ناکام میں ہر حربہ سے کام لے رہے تھے۔ علامہ اقبال کو استعمال کر کے اُن سے یہ بیان دلوانا بھی اسی سلسلہ کی کڑی تھی۔ اس کی تائید علامہ کے بڑے معتقد مولانا عبدالمجید سالک کی تحریر سے ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"۳۵ء میں مولانا ظفر علی خاں اور مجلسِ احرار نے احمدیت اور احمدیوں کے خلاف ایک عام تحریک کا آغاز کیا...... خدا جانے علامّہ اقبال نے کس عقیدت مند کی درخواست پر ایک مضمون لکھا جس میں بتایا کہ اِس فرقہ کی بنیاد ہی غلطی پر ہے .... اور آخر میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ اس فرقہ کو ایک علیحدہ جماعت تسلیم کرے" (۲۵) گویا علامّہ نے وہی مطالبہ کیا جو مجلسِ احرار کر رہی تھی۔ مولانا سالک کو علم تو ہو گا کہ یہ "عقیدت مند" بزرگ کون تھے لیکن انہوں نے "خدا جانے" کے الفاظ سے ان کی پردہ پوشی کی ہے۔ اُن دنوں علامّہ کے حاشیہ نشینوں میں دو ایک "عقیدت مند" ایسے بھی تھے جنہیں سلسلہ احمدیہ سے ذاتی عناد تھا۔ اس کی تائید میں ناقابلِ تردید شہادت موجود ہے جس کی تفصیل بیان کرنا یہاں ضروری نہیں۔

سخت کلامی عام طور پر علامّہ اقبال کا شیوہ نہ تھا۔ تعلیم کے لئے انگلستان جاتے ہوئے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار پر دعا کی تھی کہ "میری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے" اور حتی الامکان وہ ایسا کرنے سے احتراز کرتے تھے سوائے اس کے کہ کبھی مقطع میں سخن گسترانہ بات آ پڑے۔ سلسلہ احمدیہ کے خلاف ۳۵ء کے بیانات میں اتنی شدّت اور تلخی شاید نہ ہوتی اگر ایک ذاتی معاملہ میں اُن کا احساسِ محرومی کارفرما نہ ہوتا۔ اور اِس مرتبہ تو ان کے احساسِ ناکامی کے شدید ہونے کی وجہ بھی تھی کیونکہ دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا والا معاملہ ہوا تھا۔ ۳۲ء میں سر فضل حسین وائسرائے ہند کونسل کونسل کے رکن چار ماہ کی رخصت پر گئے۔ ان کی جگہ علامّہ کے تقرر کا ذکر اخبارات میں آیا لیکن وزیرِ ہند نے چودھری ظفر اللہ خان کو مقرر کر دیا۔ سر فضل حسین کی تقرری کی میعاد اپریل ۳۵ء میں ختم ہونے والی تھی۔ ان کی جگہ کون لے گا۔ اس کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ چونکہ چودہری ظفر اللہ خان عارضی طور پر چار ماہ ان کی جگہ کام کر چکے تھے اس لئے ان کا نام بھی مستقل تقرری کے سلسلے میں لیا جا رہا تھا۔ ان کی تقرری کے خلاف احراریوں اور روزنامہ "زمیندار" نے زبردست پروپیگنڈہ، شروع کر رکھا تھا۔ "زمیندار" نے ایک کھلا خط زیرِ عنوان "مکتوبِ مفتوح بنام نائب السلطنت کشور ہند" شائع کیا۔ جس میں لکھا تھا کہ

"چودھری ظفر اللہ خاں قادیانی ہیں اور قادیانیت ہرگز اسلام کا کوئی فرقہ نہیں بلکہ بالکل علیحدہ مذہب ہے اس لئے سر فضل حسین کی جگہ ان کو نہ مقرر کیا جائے بلکہ اور کسی ایسے جلیل القدر مسلمان کو یہ منصب رفیع سپرد کیا جائے جو مسلمانانِ ہند کے اعتماد کا حامل ہو۔" (مراد علامہ اقبال سے تھی۔ ناقل) (۲۶) اس ضمن میں علامہ اقبال کا نام بھی لیا جا رہا تھا۔ علامہ کے غالی معتقد مشہور صحافی میاں محمد شفیع (م۔ش) کی روایت* ہے کہ جن دنوں میاں فضل حسین کے جانشین کے تقرر کا معاملہ زیر غور تھا لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند نے ایک ملاقات میں علامہ کو یہ کہہ کر کہ WE WILL BE MEETING FAIRLY OFTEN NOW (ہم اب اکثر ملتے رہیں گے۔) سر فضل حسین کی جگہ ان کے تقرر کی طرف اشارہ بھی کر دیا تھا۔ ممکن ہے احراریوں اور "زمیندار" کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر لارڈ ولنگڈن نے وزیر ہند سے علامہ کے تقرر کی سفارش کی ہو اور انہیں اپنی سفارش کے منظور ہو جانے کا یقین بھی ہو لیکن وزیر ہند نے اتفاق نہ کیا ہو۔ واللہ اعلم آخر کار اکتوبر ۳۴ء میں چودھری ظفر اللہ خاں کے تقرر کا اعلان ہو گیا اور مئی ۳۵ء میں انہوں نے چارج بھی لے لیا۔ پھر کیا تھا احراریوں اور علامہ کے حاشیہ نشینوں کو علامہ کو بھڑکانے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ چودھری ظفر اللہ خاں کا تقرر وزیر ہند نے کیا۔ اس میں جماعت احمدیہ کا کوئی ہاتھ نہ تھا لیکن نزلہ عضوِ ضعیف پر گرا۔

---

* زندہ رُود میں اس غالی معتقد کی روایت کو ناقابل اعتماد قرار دیا گیا ہے اس کو پڑھ کر م۔ش صاحب نے مجھے لکھا: "آپ نے زندہ رُود کی تیسری جلد ملاحظہ فرمائی ہو گی۔ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال نے میری روایت کو ضعیف قرار دیا ہے حالانکہ میرا دعویٰ ہے کہ خدا کے فضل سے میرا حافظہ اتنا بُرا نہیں۔ میں آپ کو خاص طور پر یقین دلاتا ہوں کہ میں نے جو روایت آپ کے سامنے بیان کی تھی میں نے اپنے کانوں سے حضرت علامہ اقبالؒ کی زبانِ اقدس سے سنی تھی۔" مزید لکھا ہے: "میں نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی خدمت میں مل کر عرض کیا تھا کہ میں اقبالؒ کے متعلق خود ساختہ بیان کا کبھی خواب میں بھی سوچ نہیں سکتا ہوں۔ میں نے جو کچھ اُن کی زبان سے سنا تھا اُسے من وعن جناب شیخ اعجاز احمد کے سامنے بیان کر دیا تھا اور ان کے اس بیان کو کسی شکل میں استعمال کرنے پر قدغن نہیں لگائی تھی۔ میں اس کی صحت کا پورا پورا ذمہ دار ہوں۔"

قدرت کی نعمتوں کی تقسیم میں ایک طرح کا توازن کار فرما معلوم ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کو اللہ تعالےٰ نے اور تو کئی نعمتوں سے نوازا ہوا تھا لیکن مالی فراغت اور آسودگی کبھی نصیب نہ ہوئی۔ زندگی کے آخری آٹھ دس سالوں میں کچھ تو ان کی علالت کے باعث اور کچھ سیاست میں پڑ جانے کی وجہ سے آمدنی اور بھی محدود ہوگئی۔ بس لشتم پشتم گزر ہوتی تھی۔ تلی میں آیا گلی میں کھایا والا حال تھا۔ وہ خود تو بڑے قناعت پسند اور "تہی کیسہ دخورسند" رہنے والے تھے لیکن آٹے دال کا بھاؤ تو گھرداری کا انتظام کرنے والی خاتونِ خانہ کو معلوم ہوتا ہے۔ وہ گاہے گاہے اس بات پر اُن سے اُلجھتی رہتی تھیں کہ یا تو ڈھنگ سے وکالت کریں یا کہیں ملازمت کرلیں۔ علامہ دل سے ملازمت کو پسند نہ کرتے تھے لیکن حالات سے مجبور ہو کر چاہتے تھے کہ اگر کوئی مناسب انتظام ہوسکے تو ملازمت کرلیں لیکن کوئی مناسب انتظام نہ ہوسکا۔

احمدیت کے خلاف محاذ آرائی کے دنوں میں اخبار کے ایک نمایندے نے اُن کی ۱۹۱۰ء والی علی گڑھ کی تقریر کے حوالے سے ان سے دریافت کیا کہ آپ تو اس فرقہ کو "اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ" سمجھتے تھے۔ علامہ نے جواب میں اعتراف کیا کہ ۲۵ سال پہلے انہیں اس تحریک سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی امیدیں تھیں۔ لیکن انہیں اس وقت شکوک پیدا ہوئے جب بانیٔ اسلام کی نبوت سے برتر ایک نئی نبوت کا دعویٰ کیا گیا (۲۷) بانیٔ سلسلۂ احمدیہ نے کبھی حضور رسالت مآبؐ کی نبوت سے برتر نبوت کا دعویٰ نہیں کیا نہ کوئی احمدی بانیٔ سلسلہ احمدیہ کو سرکارِ دوعالمؐ سے برتر یقین کرتا ہے۔ حضرت محمد مصطفےٰؐ کو قرآن کریم میں خاتم النبیّن کہا گیا ہے اور انہیں خاتم النبیّن تسلیم کرنا ہر احمدی کا جزوِ ایمان ہے۔ حضور رسالت مآب کی نبوت سے برتر نبوت کے دعوے کی تہمت احراریوں اور علامہ کے حاشیہ نشینوں نے ان کے عشقِ رسول کو EXPLOIT کرتے ہوئے ان کو احمدیت کے خلاف بھڑکانے کے لئے تراشی اور علامہ نے اسے درست باور کرلیا۔ اپنی خداداد عقل ودانش کے ساتھ ساتھ علامہ میں ایک ذرا بچوں والی معصومیت اور بھولپن بھی تھا۔ اِن معنوں میں کہ وہ سُنی سنائی بات کا بغیر تحقیق یقین کرلیتے۔ اس کی ایک مثال جس نے انہیں ایک

بڑی مشکل سے دوچار کیا۔ مولانا سالک کے "ذکر اقبال" میں بیان کی گئی ہے (۲۸)
سنہ ۲۲ء میں کسی حاشیہ نشین نے گپ ہانکی کہ روس کی سلطنت کا صدر اب ایک مسلمان
محمد ستالین نام مقرر ہوا ہے۔ علامہ نے باور کرلیا اور بڑے شوق سے یہ "خبر" اپنے بڑے
بھائی کو خط میں لکھی (۲۹)۔ سنہ ۲۶ء میں کسی ملنے والے سے سنا کہ البانیہ میں مسلمانوں نے
نماز سے پہلے وضو کرنا غیر ضروری قرار دے دیا ہے۔ دوسرے نے ترکی میں نماز میں
بند بلیوں کی خبر سنائی۔ تیسرے نے کہا مصر میں بھی ایسی تحریک جاری ہے۔ علامہ ان خبروں
سے دل گرفتہ ہوئے اور بڑے افسوس سے سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں ان کا
ذکر کیا۔ انہوں نے جواباً اطمینان دلایا کہ خبریں غلط اور بے اصل ہیں (۳۰) معلوم ہوتا ہے اسی
طرح کسی عقیدت مند حاشیہ نشین نے احمدیت سے اپنے عناد کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ دیا ہو
گا کہ احمدی بانی سلسلہ احمدیہ کو (نعوذ باللہ، نعوذ باللہ) حضور رسالت مآب سے SUPERIOR
(برتر) مانتے ہیں۔ علامہ نے اس افترا کو سچ سمجھ لیا حالانکہ اس کی تحقیق کچھ مشکل نہ تھی۔ اور
تحقیق کے لئے گھر سے باہر جانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اسی طرح ایک معتقد نے جو آخری
ایام میں ان کے بہت قریب تھے غلط قصہ گھڑا کہ "جماعت احمدیہ میں ہر کوئی شامل ہو سکتا
ہے خواہ اس کے عقاید کچھ بھی ہوں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ احمدیوں کے خلیفہ کی بیعت کرلے" (۳۱)
غرضیکہ اُن دنوں احمدیت کے خلاف ایسی ایسی بے بنیاد اور بے سرو پا باتیں اُن کے حضور
بیان کی جاتیں اور باور کر لی جاتیں۔ اس کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جائے۔

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

مآخذ

۱۔ تھاٹس اینڈ ریفلیکشنز آف اقبال (انگریزی) مرتبہ سید عبدالواحد صفحہ ۲۴۷

۲۔ ایضاً صفحہ ۲۹۱

۳۔ ایضاً صفحہ ۲۵۷ تا ۲۹۰

۴۔ رسالہ انڈین " اینٹی کویری" بمبئی جلد ۲۹ (۱۹۰۰ء) صفحہ ۲۴۶

۵۔ اخبار" الحکم" قادیان ۱۲؍ دسمبر ۱۹۰۹ء علامہ کے سوالات اور ان کے جوابات ماہنامہ" الفرقان" ربوہ جلد ۲۵ شمارہ ۸ اگست ۱۹۷۵ء کے صفحات ۳۰۔ ۲۹ پر بھی شائع شدہ ہیں۔

۶۔" ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" مطبوعہ ۱۹۱۹ء مرغوب ایجنسی لاہور جسے آئینہ ادب چوک مینار۔ انارکلی۔ لاہور نے دوبارہ اشرف پریس لاہور سے طبع کرا کر ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔

۷۔" ذکر اقبال" مولانا عبدالمجید سالک صفحہ ۰۷

۸۔ روزنامہ" الفضل" قادیان، ۱۵؍ مارچ ۲۷ء

۹۔ خط کا عکس" تاریخ احمدیت"، جلد ششم (۱۹۶۵ء) کے صفحہ ۴۶۵ پر شائع شدہ ہے۔

۱۰۔" تاریخ احمدیت" جلد ششم (۱۹۶۵ء) صفحہ ۴۹۷

۱۱۔ روزنامہ" انقلاب" لاہور ۲۹؍ اکتوبر ۳۱ء

۱۲۔ " اقبال نامہ" حصہ دوم یعنی مجموعہ مکاتیب اقبال مرتبہ شیخ عطاء اللہ ناشر شیخ محمد اشرف تاجر کتب، کشمیری بازار لاہور (۵۱ء) صفحہ ۲۳۲

۱۳۔ رئیس الاحرار" حبیب الرحمٰن لدھیانوی صفحہ ۱۳۸

۱۴۔ ایضاً صفحہ ۱۵۹

۱۵۔ " تاریخ احرار" مصنفہ مفکر احرار چودھری افضل حق۔ ناشر" زمزم" بک ایجنسی۔ بیرون موری دروازہ لاہور (سن طباعت درج نہیں) صفحہ ۳۷

۱۶۔ ایضاً صفحہ ۷۶۔ ۷۵

۱۷۔" حرف اقبال" صفحہ ۶۷

۱۸۔ مرجمہ اندراج INDIAN ANNUAL REGISTER (انڈین اینویل رجسٹر ۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء

۱۹۔ مجلس احرار کا رسالہ "تبصرہ" لاہور اشاعت اکتوبر ۱۹۶۵ء "تاریخ احمدیت" جلد ۶ صفحہ ۶۰۸ (حاشیہ)

۲۰۔ "تاریخ احمدیت" جلد ۶ صفحہ ۶۱۰ تا ۶۱۶

۲۱۔ "تاریخ احرار" مصنفہ چودہری افضل حق۔ ناشر "زمزم" بک ایجنسی۔ بیرون موری دروازہ لاہور (سن طباعت درج نہیں) صفحہ ۳۸

۲۲۔ ایضاً صفحہ ۱۶۳

۲۳۔ "رئیس الاحرار"۔ حبیب الرحمٰن لدھیانوی۔ صفحہ ۱۰۰

۲۴۔ روز نامہ "زمیندار" لاہور ۱۲ اگست ۱۹۳۵ء صفحہ ۳ کالم ۱

۲۵۔ "ذکر اقبال" مولانا عبدالمجید سالک صفحہ ۲۱۰

۲۶۔ روزنامہ "زمیندار" لاہور ۲۷ اگست ۱۹۳۴ء

۲۷۔ تھاٹس اینڈ ریفلیکشنز آف اقبال (انگریزی) مرتبہ عبدالواحد (۱۹۷۳ء) صفحہ ۲۹۷

۲۸۔ "ذکر اقبال" مولانا عبدالمجید سالک صفحہ ۶۷ تا ۷۰

۲۹۔ علامہ اقبال کا خط محررہ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۲ء اپنے بڑے بھائی کے نام جس کی نقل اس کتاب میں شامل ہے۔ اصل خط پاکستان نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے۔

۳۰۔ "اقبال نامہ" حصہ اول مرتبہ شیخ عطا اللہ صفحہ ۴۴۱

۳۱۔ "اقبال کے حضور" جزو اوّل۔ سید نذیر نیازی، ناشر ڈائریکٹر (اقبال اکادمی۔ کراچی۔ جولائی ۱۹۷۱ء (صفحہ ۱، سطر ۱۳ تا ۱۶، صفحہ ۳، سطر ۷)

باب ۳۴

شکوۂ جور وجفا

شکوۂ جور وجفا سے باز آ جاتے ہیں ہم
کیوں صفِ محشر میں حالت تیری بے تابانہ ہے

یہ علامّہ اقبال کی ابتدائی غزلوں میں سے ایک کا شعر ہے (۱) عرصۂ محشر تو رہا ایک طرف۔ انہیں تو اِس دنیا میں بھی ان پر ہونے والے ظُلم کا شکوہ کرنے کی عادت نہ تھی۔ خود فرماتے ہیں " نہ گلہ ہے دوستوں سے نہ شکایت زمانہ۔" ان کی یہ درگزر کی عادت اپنی جگہ لیکن اگر اُن طرح طرح کے مظالم کا جو اُن پر اپنوں اور پرایوں کی طرف سے ہوتے رہے شمار کر لیا جائے تو شاید نقاد حضرات خصوصاً ماہرینِ نفسیات کو انہیں سمجھنے میں مدد مل سکے۔

ان پر ظلم کی ابتدا تو پہلے گھر سے ہی ہوئی۔ ظلم دانستہ بھی ہو سکتا ہے اور نادانستہ بھی اور کبھی کبھی تو کرم ہو جائے تمہیدِ ستم ایسا بھی ہوتا ہے۔ ابھی عمر کے سولہ سال پورے نہ ہوئے تھے کہ ان پر ایک اسی قسم کا "کرم" کیا گیا یعنی انہیں شادی کی زنجیر میں جکڑ دیا گیا۔ شادی بھی ایسے گھرانے میں جو اُن دنوں مالی لحاظ سے اُن کے گھرانے سے بَرتر تھا۔ یہ تو ابھی تعلیم کی عمارت میں داخل ہونے کے لئے اُس کے دروازے پر کھڑے تھے یعنی انٹرنس کا امتحان دیا تھا۔ برسرِ روزگار ہونا تو ابھی دور کی بات تھی۔ ان حالات میں شادی اُن پر ہی نہیں فریقِ ثانی پر بھی

ظلم سے کم نہ تھی اور اس ظلم کے لئے دونوں خاندانوں کے بزرگوں کو ذمہ دار سمجھنا چاہیئے۔ اس ظلم کے نتیجے میں فریقین کی زندگی تلخ رہی سو رہی لیکن علامہ کو تو مر کر بھی چین نہ ملا۔ ان کی وفات کے تیس سال بعد ایک نام نہاد بلکہ برعکس نہند نام زنگی کافور "مجلس محبان علامہ اقبال" نے ایک کتابچہ میں جو ان پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی وہ اسی ظلم کا ایک شاخسانہ ہی تو تھا جسے اُن کے کچھ "اپنوں" نے "اپنا صحیح مقام حاصل کرنے" کی سعی لاحاصل میں اپنی انا کی تسلّی کے لیے بہ صرف زر کثیر کھڑا کیا (۲)

تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۹۰۵ء میں اقبال مزید تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ معلوم ہوتا ہے، جستجو جس گُل کی انہیں تڑپاتی تھی وہ گُل وہاں قیام کے دوران آخر انہیں مل گیا۔ ذاتی علم نہ ہونے کی وجہ سے اس گُل کو یقین کے ساتھ IDENTIFY کرنا راقم الحروف کے لئے ممکن نہیں وہ عطیہ فیضی تھی یا مس ڈناسٹ یا کوئی اور (اغلباً اوّل الذکر)۔ لیکن جو کوئی بھی تھی اُن دنوں وہ انہیں اپنے "باغ سخن کے لئے بادِ بہار" محسوس ہوئی جس نے ان کے بے تاب تخیل کو گزار دیا اُن کے آبگینے میں نئے جوہر پیدا کئے اور ان کی امید دل کے نہال سرسبز ہوئے۔ اُس زمانے کا ان کا کلام ان کی اس قلبی کیفیت کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے (۳) افسوس کہ وہ اپنے حالات سے مجبور نہ تو اُس گُل کو توڑ کر اپنی دستار میں رکھ سکے نہ زیب گلو کر سکے اگرچہ اقبالیات کی بعض مطبوعات سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ گُل خود بھی اُن کے زیب گلو ہونے کا خواہش مند اور انتظار صید میں اک دیدۂ بے تاب تھا۔ انہیں چمن میں آنے کے لئے بار بار دعوت دی گئی لیکن وہ اپنی "مصلحت اندیش پختہ عقل" کی وجہ سے کنی کترا گئے۔ یہ اُن پر اُن کے حالات کا ظلم تھا جو انہیں چار و ناچار سہنا پڑا۔ راقم الحروف کی رائے میں یہ ستم اُن کے لئے تمہید کرم ہوا اُن کے حالات میں اس گُل کی بیل شاید کیا یقیناً منڈھے نہ چڑھتی۔

لاہور میں بیرسٹری کی پریکٹس شروع کی تو شاموں کی تنہائی سے واسطہ پڑا۔ ایسے میں "زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا" کی خواہش ایک قدرتی خواہش تھی۔ گھر والوں سے دوسری شادی کا ذکر کیا تو والد اور بڑے بھائی نے چاہا کہ کسی طرح موجودہ اہلیہ سے ہی موافقت ہو جائے اور نکاح ثانی کی نوبت نہ آئے سال دو سال اسی حیص بیص میں گزر گئے۔ وہ اُن دنوں بزرگوں کے

اس تامل کو ظلم سمجھنے کی وجہ سے سخت دل گرفتہ تھے۔ اُن کی قلبی کیفیت اور بزرگوں کے رویہ کے خلاف احتجاج کا اظہار اُن دو ایک خطوط سے ہوتا ہے جو انہوں نے جذبات کے ہیجان میں اپنے دل کا درد ایک دوست سے کہنے کے لئے عطیہ فیضی کو لکھے۔ افسوس کہ اُن محترمہ نے ان خطوط کو شائع کر کے ایک مرحوم دوست پر بڑا ظلم کیا۔ خیر خدا خدا کر کے کچھ عرصہ بعد قرآن کریم کی ایک آیت کی مدد سے انہوں نے یہ ہفت خواں سر کر لیا اور میاں جی نے ان کے نکاح ثانی کر لینے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ ایک اچھا رشتہ بھی مل گیا اور بخیر و خوبی نکاح ہو گیا۔ لیکن رخصتی سے پہلے ان پر ایک اور ظلم ٹوٹا گیا۔ یہ ظالم فریقِ ثانی کے ایک قرابت دار تھے جنھوں نے اس صاحب زادی کا رشتہ اپنے بیٹے کے لئے مانگا تھا جو منظور نہ ہوا۔ اس عداوت کی بنا پر انہوں نے چچا جان کے نام دو ایک گمنام خط بھجوائے جن میں اس عفیفہ پر کچھ ناروا الزامات لگائے گئے تھے۔ تعجب ہوتا ہے کہ یہ عقل کے ایسے پختہ کانوں کے اتنے کچے نکلے کہ اُن گمنام خطوں سے متاثر ہو کر رخصتی کا ارادہ ترک کر دیا اور طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔ اس اجمال کی تفصیل باب ۱۱ میں بیان کی جا چکی ہے۔ اس ظلم کے نتیجے میں انہیں ایک نہیں دو نئی بیویوں کی ذمہ داری اٹھانی پڑی۔ مالی لحاظ سے اُن کے حالات میں یہ ایک بھاری بوجھ ضرور تھا لیکن شکر ہے اُن کی اہلی زندگی میں ایک ٹھہراؤ آ گیا۔

اب ۱۹۱۵ء میں ہندوستان بھر کے صوفیا اور روایتی مشائخ نے علامہ پر جو ظلم ڈھایا اس کا حال سنیے۔ اُس وقت تک علامہ کی شاعری کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ ان کا کلام خاص و عام میں مقبول ہو چکا تھا۔ سالک کے بقول وہ اپنے کلام کی وجہ سے "اسلامی ہند کی آنکھ کا تارا بن گئے اور تمام مسلمان بلا امتیاز مسلک و عقیدہ اُن کے فدائی ہو گئے"۔ احیائے ملتِ اسلامیہ کے لئے اُن کے دل میں ایک تڑپ تھی۔ وہ اسلام کی دینی و دنیوی شوکت و عظمت کے آرزومند تھے۔ لیکن یہ کام اس ہندوستانی مسلمان سے تو ہونا ممکن نہ تھا جو بقول ان کے "نہ تو ایک توانا جسم میں مضبوط قوتِ ارادی رکھتا ہے۔ نہ اس میں زندہ رہنے کا عزم موجود ہے۔ نہ وہ اپنے اندر اتنی قوت کردار رکھتا ہے کہ ان تمام طاقتوں کا مقابلہ کر سکے جو اس کے معاشرتی نظام کو پارہ پارہ کرنے کے درپے ہیں۔" علامہ کی رائے میں اس صورت حال کا ذمہ دار وہ تصوف

تھا جو خودی کو مٹا دینے اور قطرے کو دریا میں گم ہو جانے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ اسے آبرومند انسانوں کا مسلک نہیں بلکہ کیش گوسفندی سمجھتے تھے جس نے قوموں کو ذوقِ حیات سے عاری کر دیا ہے اور خصوصاً مسلمان معاشرے پر اِس غلط مکتبِ فکر کا وہ اثر پڑا ہے جس سے وہ زوال اور انحطاط کی منزلیں نہایت سرعت سے طے کر رہا ہے۔ ان کی رائے تھی کہ جب تک فکرِ اسلامی اور ادبیات اسلامی کو اس مہلک رجحان سے نجات نہ دلائی جائے گی اور ایک تنومند اور حیات افروز ادبی نصب العین قائم کر کے ادبیاتِ اسلامیہ میں انقلاب پیدا نہ کیا جائے گا مسلمانوں کی زندگی میں کوئی خوشگوار تغیّر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس غرض کے لئے وہ دو سال سے فارسی میں ایک مثنوی کی تیاری میں مصروف تھے۔ اس کتاب کے باب ۱۳ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ مثنوی اُن کے ایک کشف اور میاں جی کی اُس کشف کی تعبیر کی بنا پر لکھی گئی۔ یہ مثنوی جس کو اسرارِ خودی کا نام دیا گیا وسط ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ مثنوی میں خودی کو مٹا دینے اور قطرے کو دریا میں گُم ہو جانے کی تعلیم دینے والے تصوف کی مذمت کی گئی ہے اور ملّت کو خودداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں خواجہ حافظ شیرازی کے کلام کو ایسے ادب کی مثال کے طور پر پیش کیا گیا جو بقول اُن کے ایک بے حد لذیذ زہر ہے جو نوجوانوں کو حیات و عمل کے تقاضوں سے غافل کر دیتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے حافظ شیرازی کے متعلق بھی کچھ سخت الفاظ استعمال ہو گئے۔ اس پر حافظ کے معتقدین بڑے سیخ پا ہوئے۔ مثنوی کا شائع ہونا تھا کہ ہندوستان بھر کے وجودی تصوف کے حامی صوفیوں اور روایتی سجادہ نشینوں نے علامہؒ کے نکتۂ نگاہ اور حافظ پر اُن کی کڑی نکتہ چینی کے سبب مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ ان معترضین کے سرخیل اُن کے دیرینہ دوست حسن نظامی تھے۔ اسرارِ خودی کی مخالفت میں اخبارات و رسائل میں مضامین شائع ہونے لگے۔ علامہؒ کے نکتۂ نگاہ کی تائید میں لکھنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ یہ قلمی جنگ دو تین سال جاری رہی۔ علامہؒ کے نکتۂ نگاہ سے اختلاف کرنے والوں کا حق تو تھا کہ وہ اپنا موقف پیش کریں لیکن کئی معترضین نے جن میں تعجب ہے مولانا اکبر الہ آبادی بھی شامل تھے سرے سے مثنوی پڑھی ہی نہ تھی اور دوسروں کی ہنگامہ آرائی سے متاثر ہو گئے تھے۔ کچھ مخالفین نے تو علمی سطح سے گر کر علامہؒ کی ذات پر بھی حملے کئے۔ کون سی گالی تھی جو نظم و نثر

میں نہ دی گئی۔ نقل کفر کفر نہ ہوتے کے باوجود راقم الحروف اُن القابات کو نہیں دہرا سکتا جن سے انہیں نوازا گیا۔ اِن حضرات کے اِس بازاری طرزِ عمل کو ظلم نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔ علامہ نے ان اخلاقی بالشتیوں کی اس ہرزہ سرائی کا تو کوئی نوٹس نہ لیا لیکن اس بات کا انہیں ضرور افسوس تھا کہ مثنوی میں بیان کردہ ان کے موقف کو معترض صوفیا نے اپنے بیانات میں غلط بلکہ اُلٹے معنی پہنا کر عوام کو گمراہ کیا۔ پانچ چھ سال بعد جب مثنوی کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو میاں جی کے نام اپنے ایک خط میں اس افسوس کا اظہار اِن الفاظ میں کیا۔ "اسرارِ خودی کا ترجمہ انگریزی میں ہو گیا ہے۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہو گا کہ جب یہ کتاب ہندوستان میں شائع ہوئی تو یہاں کے صوفیا نے اس پر اعتراض کیا کہ کتاب کا مصنف مسلمانوں کو مغربی خیالات سکھاتا ہے اور ان کو فرنگ کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ مغرب والے مترجم نے دیباچہ میں یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب ایک زبردست آواز ہے جو مسلمانوں کو محمدؐ اور قرآن کی طرف بلاتی ہے اور اس آواز میں صداقت کی آگ ایسی ہے کہ ہم اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے" (۴) گویا وہی ہوا جو وہ اپنے ایک شعر میں کہہ چکے تھے کہ "زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا۔ اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں"۔ جیسا کہ اس کتاب کے ایک پہلے باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ علامہ نے میاں جی کے کہنے پر "اسرارِ خودی" کا دوسرا ایڈیشن شائع کرتے وقت وہ اشعار حذف کر دیئے تھے جن پر حافظ کے معتقدین کو اعتراض تھا۔

زاہدانِ تنگ نظر اور "دو رکعت کے امام" کٹھ مُلاؤں کو علامہ ابتدا ہی سے ناپسند فرماتے تھے۔ وہ ایسے مُلاّؤں کو "ننگِ مسلمانی" سمجھتے تھے (۵) ممکن ہے یہ مولانا میر حسن کی تعلیم اور صحبت کا اثر ہو کیونکہ مولانا سرسیّد کے معتقدین میں سے تھے۔ جواباً مُلاّ حضرات بھی اُن سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں اُن مُلاؤں کو علامہ سے بدلہ لینے کا موقعہ مِل گیا۔ اُن دنوں سلطان ابن سعود کی تطہیر حجاز کے سلسلے میں ہندوستانی عُلما میں اُن کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان تکفیر بازی کا ہنگامہ برپا تھا۔ علامہ نے سلطان کی حمایت میں بیان دیا۔ اس پر کسی "پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری" نے لاہور کی مشہور مسجد وزیر خاں کے خطیب مولانا سیّد دیدار علی شاہ کو ایک استفتا بھیجا جس میں علامہ کے کچھ اشعار درج کر کے دریافت کیا کہ ایسے اشعار کہنے والا اسلام

پہ ہے با کفر ہے۔ مولانا دیدار علی شاہ یوں بھی تکفیر سازی کی مشین سمجھے جاتے تھے اور علامہ کی تکفیر کے لئے تو ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے جھٹ ایسے اشعار کہنے والے کو کافر اور فاسق قرار دے دیا (۲) جس سے تمام مسلمانوں کو ملنا جلنا ترک کر دینا چاہیئے ورنہ سخت گنہگار ہوں گے۔ مولانا کے جاہلانہ فتوے پر کسی مسلمان نے عمل تو کیا کرنا تھا۔ اس کے برعکس فتوے صادر کرنے والے مولانا پر ہر طرف سے لعن طعن ہوئی۔ اُن دنوں اس پر بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں کہ علامہ کے برسوں پہلے کے اشعار کی بنیاد پر ۲۵ء میں فتویٰ حاصل کرنے کے لئے "پیرزادہ محمد صدیق" کی باسی کڑھی میں کیوں اُبال آیا۔ ایک خیال یہ تھا کہ "پیرزادہ محمد صدیق" ایک فرضی نام ہے۔ اُن دنوں اگلے سال ۲۶ء میں پنجاب کونسل کے انتخاب ہونے کی خبریں تھیں۔ علامہ سے بھی اصرار ہو رہا تھا کہ وہ لاہور کے حلقہ مسلم سے انتخاب میں کھڑے ہوں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اسی حلقہ کے کسی دوسرے امیدوار نے یہ سب احسانہ کھڑا کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ کچھ لوگ دور کی کوڑی بھی لائے۔
انگریزی حکومت نے ۲۳ء کے شروع میں علامہ کی علمی اور ادبی حیثیت کے اعتراف میں انہیں "نائٹ ہڈ" (سر) کا خطاب دیا تھا۔ پھر اُسی سال اکتوبر میں لاہور میں والسرائے ہند نے پنجاب ہائیکورٹ کا افتتاح کیا۔ اس موقعہ پر اپنی پبلک تقریر میں انہوں نے شاندار الفاظ میں علامہ کی تعریف کی۔ دور کی کوڑی لانے والے حضرات کا خیال تھا کہ علامہ کے سیاسی یا ذاتی مخالفین کے گروپ کو اندیشہ ہوا کہ یہ علامہ کو حکومت ہند میں لئے جانے کی مبادیات نہ ہوں اس لئے مولانا کے فتویٰ کے ذریعہ انگریز حکام پر یہ اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی کہ علامہ کو تو مسلمان بھی نہیں سمجھا جاتا۔ واللہ اعلم اصل حقیقت کیا تھی۔ اُن دنوں کے ایک بڑے سیاسی بزرگ کی علامہ سے ذاتی پرخاش تو تھی اور اُن کے گروپ کے لوگ سیاسی چالوں میں بڑے ماہر تھے اس لئے ہو سکتا ہے کہ یہ کوڑی اتنی دور کی نہ ہو۔ واللہ اعلم۔ بہرحال جس کسی نے بھی ایک ایسے شخص پر جس نے بقول (۷) قصبہ شرق پور کے نہایت متقی اور خدا رسیدہ بزرگ میاں شیر محمد صاحب "لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے قلوب میں ایمان اور عمل کے چراغ روشن کر دیئے" کفر کا فتوےٰ لگوایا اور لگایا۔ اس نے ظلم اکبر کا ارتکاب کیا۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ہمارا گھرانہ کوئی امیر گھرانہ نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ شاید متوسط

کی تعریف میں آسکتا۔ خاندان خاصا بڑا تھا اور بسراوقات صرف ابا جان کی کمائی پر تھی۔ وہ بھی دو چار سال بعد ریٹائر ہونے والے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں جب چچا جان نے لاہور میں وکالت کے پیشے سے عملی زندگی کا آغاز کیا تو فکرِ معاش کے لئے جو تگ و دو کرنا پڑتی ہے اس سے دوچار ہوئے جو اُن کی اُفتادِ طبع کے خلاف تھی۔ معلوم ہوتا ہے قیام یورپ کے دوران انہیں ہر جگہ ملّتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کا شدید احساس ہوا تھا اور وہ اپنی تخلیقی قوت سے احیائے ملّت کا عزم رکھتے تھے۔ لیکن یہ کام فکرِ روزگار کے ساتھ ساتھ ہونا ممکن نہ تھا۔ پہلے زمانوں میں بھی علم دوست بادشاہ اور صاحبِ ثروت اُمرا تخلیقی کام کرنے والوں کی سرپرستی کرتے آئے ہیں اُن دنوں ریاست حیدرآباد کے فرمان روا میر محبوب علی خاں تھے جن کی دریا دلی اور اہلِ سخن کی قدر افزائی کے چرچے عام تھے۔ علامّہ کو توقع ہوئی ہوگی کہ اگر اس مسلم ریاست کے فرماں روا کو وہ احیائے ملّت کے اپنے عزائم کی سرپرستی پر آمادہ کرسکیں تو شاید فکرِ معاش کی مشکل بھی حل ہو جائے۔ اُن دنوں وہ وکالت کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی پڑھاتے تھے۔ چنانچہ کالج سے دس دن کی رخصت لے کر وہ مارچ ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد گئے۔ لیکن اس قلیل مدت میں میر محبوب علی خاں کی خدمت میں باریابی حاصل ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ بقول نظر حیدرآبادی " وہ اپنی دریا دلی کے باوجود عجیب طبیعت کے مالک تھے۔ داغ پہلی دفعہ حیدرآباد گئے تو ایک طویل مدت تک انتظار کرنے کے باوجود دربارِ نظام میں باریاب نہ ہو سکے اور وطن واپس چلے گئے۔ پھر دوبارہ بلوائے گئے لیکن اُستادیٔ شاہ کا شرف ساڑھے تین سال کے قیام کے بعد بخشا گیا۔" (۷ الف) علامّہ کی طبیعت اور ان کے حالات بھی ایسے تھے کہ وہ ایسا صبر آزما انتظار نہ کر سکتے تھے لہٰذا وہ بے نیل مرام واپس آگئے۔ اس سفر کی صعوبت سے ان کو تو سوائے " وزیر سلطنت (مہاراجہ کشن پرشاد) سے " عزّت افزائی " (۸) اور " درمیان کارزار کفر و دیں۔ ترکش مارا خدنگ آخریں " اورنگ زیب عالمگیر کی تربت کی زیارت (۹) کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ ہاں اردو ادب کو ایک شاہکار " نظم گورستانِ شاہی (۱۰) حاصل ہوگئی۔

اپنی تخلیقی قوت کے اظہار کی خواہش اور فکرِ معاش کے درمیان جو کشمکش تھی اُس کیفیت کو انہوں نے سرکشن پرشاد کے نام ایک خط میں اس طرح بیان کیا ہے " افسوس کہ ترکِ عثمانیہ

کے لئے کچھ نہیں لکھ سکا۔ مگر قانونی مسائل ہیں اشعار کے لئے کہاں سے وقت نکلے۔ دل اور دماغ دونوں کام کرنا چاہتے ہیں مگر پیٹ کا حکم ہے کہ ہماری رضا کے بغیر ایک خیال یا ایک تاثر اپنے اندر داخل نہ ہونے دو۔ عجب کشمکش کی حالت ہے "(۱۱) کون جانے کیسے کیسے "سخن ہائے گفتنی" خوفِ فسادِ خلق سے نہیں بلکہ فکرِ روزگار کی وجہ سے "ناگفتہ رہ گئے"۔ اقبال نامہ حصّہ دوم میں مہاراجہ کشن پرشاد کے نام علامہؒ کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں اُن کے بین السطور سے ظاہر ہے کہ عہد عثمانی میں بھی اُن کی بڑی خواہش تھی کہ اسلامی ریاست حیدر آباد سے کسی طرح کا تعلق پیدا ہو سکے۔ معلوم ہوتا ہے ۱۷ء میں کوئی بات چلی بھی تھی جو کامیاب نہ ہوئی۔ بلکہ اُن کا تھوڑا بہت نقصان ہی ہوا۔ مہاراجہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "یہاں پنجاب اور یوپی کے اخباروں میں چرچا ہوا تو دور دور سے مبارک باد کے تار بھی اُڑ گئے اور پنجاب کے اہل مقدمات جن کے مقدمات میرے سپرد ہیں اُن کو گونہ پریشانی ہوئی۔ بہر حال مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ "(۱۲) ایک اور خط میں مہاراجہ کو لکھتے ہیں "حیدری صاحب تو اقبال کو بلاتے بلاتے رہ گئے۔ یونیورسٹی کے کاغذات اُن کی طرف سے کبھی کبھی آجاتے ہیں کہ یہیں سے مشورہ لکھوں۔ اُدھر مولوی عبدالحق صاحب اصطلاحات علمیہ کی ایک طویل فہرست ارسال کرتے ہیں کہ اُن کے اردو تراجم پر تنقید کروں۔ گویا اُن بزرگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اقبال کو کوئی اور کام نہیں۔ ترجمہ کرنے والوں کو معقول تنخواہیں دے کر بلایا ہے تو یہ کام بھی انہیں سے لینا چاہیئے۔ میرا جذبِ دل تو بوڑھا ہو گیا ہے۔ آپ کا جذبہ تو بفضلہ ابھی جوان ہے، پھر کیوں اقبال کو وہاں نہیں کھینچ لیا جاتا"(۱۳)

ریاستِ حیدر آباد میں مہاراجہ کشن پرشاد اور سر اکبر حیدری علامہؒ کے مداحوں میں سے سمجھے جاتے تھے۔ پھر کیوں وہ "اقبال کو وہاں نہ کھینچ سکے"؟ پچھلے سال اقبال اکیڈمی حیدر آباد نے اپنے سہ ماہی رسالہ "اقبال ریویو" کا ایک خصوصی نمبر شائع کیا ہے۔ اُس میں علامہؒ اقبال اور حیدر آباد کے متعلق ریاست کی دفتری فائلوں سے بعض دلچسپ انکشافات کئے گئے ہیں اُن میں سے دو ایک کا ذکر کیا جاتا ہے جو مندرجہ بالا سوال کا جواب بھی مہیا کرتے ہیں۔

۱۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے دور وزارتِ عظمیٰ میں جامعہ عثمانیہ کی دعوت پر جب علامہؒ توسیعی لیکچرز کے لئے ۲۹ء میں حیدر آباد تشریف لے گئے تو مختلف وجوہات کی بنا پر حکومت سرکار

عالی کے بعض وزیرا ورعہدیدار علامہ کو سرکاری مہمان بنانے یا ان کا سرکاری سطح پر استقبال کرنے سے متفق نہ تھے۔ خود نظام حیدرآباد نے دبے الفاظ میں علامہ کو سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرائے جانے پر اپنی ناپسندگی کا اظہار کیا۔ لیکن چونکہ وہ خود اُن دنوں کلکتہ میں تھے اور اُن کی عدم موجودگی میں مہاراجہ نے شخصی دلچسپی لے کر علامہ کو گیسٹ ہاؤس سرکاری میں ٹھہرانے کا حکم دے دیا تھا اس لئے نظام زیادہ مداخلت نہ کر سکے (۱۴)

۲۔ ۱۹۳۲ء میں نواب صاحب بھوپال نے نظام حیدرآباد کو ایک ذاتی خط میں علامہ کے لئے مالی امداد کی تحریک کرتے ہوئے لکھا " دنیائے ادب میں ایک شاعر اور فلسفی ہونے کی حیثیت سے ڈاکٹر اقبال کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ ذاتِ شاہانہ پر بخوبی روشن ہے۔ اُن کی شاعری نے مسلمانان ہندوستان کے نام کو تمام عالم میں روشن کر دیا ہے اور یہ نہایت مستعدی کیساتھ پیامِ اسلام کی مغربی ممالک میں ترجمانی کر رہے ہیں لیکن اُنکی مالی مشکلات انکی ادبی جدوجہد میں سخت مزاحم ہو رہی ہیں۔ پس اگر اُن کو ان مشکلات سے نجات دلوادی جائے تو یہ اپنے ادبی مشاغل میں ہمہ تن مصروف ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو اپنے خاندان کی پرورش کے لئے ماہانہ -/۱۰۰۰ کی آمدنی فراہم ہو جائے تو مالی مشکلات سے نجات پائیں گے۔" اس خط پر مہدی یار جنگ صدر المہام سیاسیات نے جس رائے کا اظہار کیا وہ نوٹ کرنے کے قابل ہے لکھتے ہیں۔" یہ امر کہ سر محمد اقبال اچھے شاعر ہیں اسکے بارے میں فن شاعری کے ماہروں میں اختلاف ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ وہ اچھے شاعر ہیں تب بھی یہ وجہ ان کو ایک ہزار روپیہ ماہوار دینے کیلئے کافی نہیں۔ نواب صاحب بھوپال جو انکی سفارش کرتے ہیں وہ خود اُن کو کیوں نہیں دیتے اصولاً حیدرآباد کا روپیہ اسٹیٹ کے باہر نہ جانا چاہیے جب تک کوئی واقعی ضرورت نہ ہو، موجودہ فنانشل تنگی اور اسٹیٹ کی آمدنی کی کمی کے نظر کرتے ایک حبہ بھی باہر بھیجنا گویا جرم ہے۔ نواب صاحب بھوپال کے رقعہ کے جواب میں یہاں سے عذر ہونا بہتر ہے۔" مہدی یار جنگ کی اس رائے نے نواب صاحب بھوپال کی تحریک پر کارروائی کے مستقبل کا رُخ متعین کر دیا۔ محکمہ فنانس نے بھی اُن کی رائے سے اتفاق کیا۔ جب کاغذات مہاراجہ کشن پرشاد صدر المہام بابِ حکومت کی خدمت میں پیش ہوئے تو وہ بھی نواب صاحب بھوپال کی تحریک کی تائید کی جرأت نہ کر سکے۔ معاملہ کونسل میں پیش ہوا تو سب اراکین نے مہدی یار جنگ کے ساتھ اتفاق کیا (مہدی یار جنگ نے ملکی غیر ملکی کا سوال جو کھڑا کر دیا تھا) چنانچہ نظام کی طرف سے نواب صاحب بھوپال کو جواب میں اُن کی تحریک پر عمل نہ کر سکنے کی معذرت کر دی گئی (۱۵)

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ کی زندگی میں اُن کی کسی رنگ میں بھی امداد کے لئے ریاست حیدر آباد میں فضا سازگار نہ تھی اور مہاراجہ کشن پرشاد بھی اس معاملہ میں بے دست دپا تھے۔ ایک اور مثال جس سے علامہ کے متعلق خود نظام کا اندازِ فکر ظاہر ہوتا ہے بھی اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے متذکرہ بالا اقبال ریویو کی خصوصی اشاعت میں دی گئی ہے۔ حیدرآباد کی "مسلم کلچر سوسائٹی" کی جانب سے جنوری ۱۹۳۸ء میں اقبال ڈے منایا گیا۔ صبح کے اجلاس کی صدارت شہزادی برار نے کی اور بعد دوپہر اور شام کے اجلاسوں کی مہاراجہ کشن پرشاد نے۔ یہ اجلاس ٹاؤن ہال میں منعقد ہوئے جس کے لئے نظام کی اجازت ضروری تھی۔ درخواست پر نظام کا یہ فرمان جاری ہوا۔" اس وقت اجازت دی جاتی ہے مگر آئندہ سے ٹاؤن ہال کے استعمال کی اجازت خاص حالات کے تحت دی جائے گی نہ کہ ایسے ویسے کام کے لئے" (۱۶) گویا نظام کی نظر میں اقبال کا دن منانا "ایسا ویسا کام تھا"۔ یہ وہ سلوک تھا جو کہ خود نظام کے الفاظ میں "سب سے بڑی مسلم ریاست" حیدرآباد نے "ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے۔ نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر" سکھلانے والے حکیم الامت کے ساتھ روا رکھا۔ اگر علامہ کو فردوسی کی طرح خفا ہو کر ہجو کرنے کی عادت ہوتی تو وہ بھی چودھری محمد حسین کو آواز دیتے "چوہدری صاحب لانا میرا قلمدان"۔ لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتے ہوئے صرف یہ کہنے پر اکتفا کی

تیری بندہ پروری سے میرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں سے نہ شکایتِ زمانہ

ریاستِ حیدرآباد کے اربابِ اقتدار نے علامہ کے غیر ملکی ہونے کے بہانے نواب صاحب بھوپال کی تحریک پر عمل کرنے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ لیکن جہاں وہ غیر ملکی نہ تھے وہاں اُن سے کون سا اچھا سلوک روا رکھا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں انہیں وکالت کی پریکٹس کرتے ۱۷ سال ہو چکے تھے اور وہ ہائیکورٹ کے سینئر وکلا میں سے تھے۔ اُن کی قابلیت مسلّمہ تھی۔ ۱۹۲۳ء کے شروع میں حکومت کی طرف سے نائٹ ہڈ بھی مل چکی تھی۔ اُسی سال اکتوبر میں والسرائے ہند نے پنجاب ہائیکورٹ کا افتتاح کرتے ہوئے نہایت شاندار الفاظ میں علامہ کی تعریف کی تھی (۱۷)۔ ۱۹۲۵ء میں ہائیکورٹ میں ایک مسلم جج کی جگہ خالی ہوئی۔ علامہ ہر لحاظ سے اس کے لئے موزوں تھے۔

اُن دنوں ہائیکورٹ کے چیف جسٹس سر شادی لال تھے جو اپنے تعصب کے لئے مشہور تھے۔ ان کو چیف جسٹس بنوانے میں سر میاں محمد شفیع کی مساعی کو بڑا دخل تھا لیکن وہ ذہنی فطرت چیف جسٹس ہونے کے بعد میاں سر محمد شفیع اور میاں فیملی سے بر سر پیکار ہو گیا۔ میاں شفیع کے داماد میاں شاہ نواز سے علامہ کے گہرے مراسم تھے۔ شادی لال نے علامہ کے دوست مرزا جلال دین کے ذریعہ علامہ کو میاں شفیع کے خلاف بھڑکانے اور ان کے ساتھ اپنے تنازعہ میں علامہ کو اپنا طرفدار بنانے کی کوشش کی لیکن علامہ اُن کے بھرّے میں نہ آئے (۱۸) ایک تو کریلا اور پھر نیم چڑھا۔ شادی لال تعصب کے زیر اثر پنجاب کی ہر مسلم شخصیت کے خلاف تھا۔ علامہ کے میاں فیملی کے خلاف شادی لال کا ساتھ نہ دینے سے علامہ کے اور بھی خلاف ہو گیا۔ پنجاب کی اسلامی انجمنوں اور مسلم اخباروں نے بڑے زور سے مطالبہ کیا کہ مسلمان جج کی خالی جگہ پر علامہ اقبال کو مقرر کیا جائے۔ ہائیکورٹ کے ججوں کی تقرری میں چیف جسٹس کی رائے کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ شادی لال نے علامہ کے متعلق یہ رائے دی کہ "ہم اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ قانون دان کی حیثیت سے نہیں۔" (۱۸ الف) چنانچہ علامہ کی بجائے شادی لال نے یو۔ پی کے رہنے والے آغا حیدر کو جج مقرر کرا دیا۔ اس پر مسلم اخبارات میں شادی لال کے خلاف بڑی لے دے ہوئی۔ شادی لال کے بعض مسلمان خوشامدیوں نے انہیں یہ باور کرایا کہ آپ کے خلاف یہ سب ایجی ٹیشن علامہ کے ایما پر ہو رہی ہے۔ حالانکہ یہ بات درست نہ تھی لیکن اس سے علامہ کی پریکٹس پر برا بڑا اثر پڑا۔ یہ حالات تھے جن کے تحت علامہ نے اکتوبر میں سر جان تھامسن کو ایک خط لکھا جس میں ان سے خواہش کی کہ وہ انہیں ریاست کشمیر کی سٹیٹ کونسل میں کوئی جگہ دلوائیں۔ اس خط کو بعض اخبار گاہے گاہے علامہ پر اعتراض کے رنگ میں اچھالتے رہتے ہیں۔ صرف ایک کالم نویس نے اپنے کالم میں اس خط کا ذکر کرتے ہوئے دریافت کیا ہے کہ وہ مسلمان جاگیردار، رؤسا اور وہ افسران اعلیٰ جنہوں نے موقع آنے پر علامہ کو اپنا لیا ہے اس وقت کہاں تھے جب علامہ کو ایک متعصب چیف جج کی وجہ سے پریکٹس کرنی بھی مشکل ہو گئی تھی۔

اس بات کے ثبوت میں کہ علامہ کی بجائے آغا حیدر کو جج بنوانے میں شادی لال کا ہاتھ تھا ڈاکٹر جاوید اقبال نے "زندہ رود" میں ایک دلچسپ تحریر شائع کی ہے جو ہندوستان کے ادیب

ویدمہتہ کی اپنے خاندان کے متعلق انگریزی میں لکھی ہوئی یادداشتوں کا ایک اقتباس ہے (۱۹) یہ یادداشتیں امریکی رسالہ نیو یارکر میں تین اقساط میں پروفاسیلز کے زیر عنوان شائع ہوئیں ہیں۔

بقول ویدمہتہ شادی لال کا ان کے والد سے گہرا دوستانہ تھا۔ ویدمہتہ لکھتے ہیں "ایک شام سر شادی لال بابو جی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے مجھے مبارک باد دو بھائی۔ میں نے آج دو پنجابی مسلمانوں کی" لٹیا ڈبا دی ہے" (یہ ایک انگریزی محاورہ ہے جس کا مطب اردو میں یہ ہوگا کہ میں نے ان دونوں کا پتہ کاٹ دیا ہے۔ یعنی ان کو ختم کر دیا ہے)۔ تمہیں معلوم ہے ہائی کورٹ میں ایک مسلم جج کی آسامی خالی تھی۔ اس کے لئے گورنر کے زیر غور دو نام سر محمد اقبال اور میاں شاہ نواز داماد میاں محمد شفیع کے تھے۔ آج میں نے گورنر سے اپنی پسند کے الہ آباد سے تعلق رکھنے والے ایک اچھے اور فرمانبردار مسلمان کا تقرر کرا لیا ہے۔ جب بابوجی نے کہا تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اگر تم ان دو پنجابی مسلمانوں سے کسی ایک کو مقرر کرا دیتے تو وہ تمام عمر تمہارا احسان مند رہتا اور یوں ایک معروف پنجابی شخصیت تمہاری جیب میں ہوتی۔ شادی لال نے جواب دیا میری جیب میں الہ آباد کا جج ہے۔ مجھے اور کیا چاہیے" بقول ویدمہتہ شادی لال نے اُن کے والد سے وہ ترکیب بھی بیان کی جس سے اُس نے دونوں پنجابی مسلمانوں کو گورنر کی نظروں سے گرایا۔ راقم الحروف کی رائے میں شادی لال کی بیان کردہ ترکیب جھوٹ کا پلندہ معلوم ہوتی ہے جو اس نے ویدمہتہ کے والد پر اپنی "مکاری" کا سکہ بٹھانے کے لئے گھڑی۔ اس کے لئے صرف اتنا کہنا کافی تھا کہ وہ ان دونوں کو ججی کے لئے موزوں نہیں سمجھتے چنانچہ علامہ کے متعلق جو تحریری رائے اس نے بھیجی تھی۔ اُس کا علم نواب ہر ایک کو ہے یعنی یہ کہ" ہم اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ قانون دان کی حیثیت سے نہیں"۔ جو بھی علامہ اقبال اور میاں شاہ نواز سے اور اُن دونوں کی گہری دوستی سے واقف ہے وہ شادی لال کی بیان کردہ کہانی کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔

بقول شادی لال آغا حیدر کے اُن کا "فرمانبردار" اور "اُن کی جیب میں ہونے" کی شہرت (صحیح لفظ تو بدنامی ہے) عام تھی۔ چودھری محمد ظفر اللہ خاں (اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہو) اُن دنوں ہائیکورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے سوانح حیات "تحدیث نعمت" میں اس کی ایک افسوسناک مثال تحریر کی ہے (۲۰) "ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں میں ایک بنئے کو قتل کر دیا

گیا تھا تین مُسلم اشخاص پر شبہہ ہوا۔ اُن میں ایک عبداللہ تو مفرور ہوگیا اور باقی دو گرفتار ہوئے۔ کیس سیشن سپرد ہوا۔ سیشن کی عدالت میں پیشی سے پہلے دونوں ملزمان میں سے ایک مرگیا۔ سیشن کی عدالت میں استغاثے کی طرف سے تین چشم دید گواہ پیش ہوئے۔ سیشن جج صاحب نے ان کی شہادت کو ناقابل اعتبار قرار دے کر ردّ کر دیا اور ملزم کو بری کر دیا۔ کچھ سال بعد عبداللہ منٹگمری (حال ساہیوال) کے ضلع میں گرفتار ہوا جہاں اس نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس پر مقدمہ چلا۔ سیشن کی عدالت میں استغاثے کی طرف سے وہی تین چشم دید گواہ پیش ہوئے اور مزید شہادت یہ پیش کی گئی کہ ملزم نے اپنی نئی جائے سکونت میں ایک سکھ سے کہا تھا کہ میں تو اپنے گاؤں سے ایک بنیئے کے قتل کی وجہ سے مفرور ہوں۔ سیشن جج صاحب نے اپنے پیش رو کی طرح چشم دید شہادت تو ردّ کر دی لیکن ملزم کے بیان کردہ اقبالِ جرم پر انحصار کر کے ملزم کو مجرم قرار دے دیا اور پھانسی کی سزا کا حکم صادر کیا۔ ہائیکورٹ میں عبداللہ کی طرف سے اپیل ہوئی۔ میں نے اپیل کنندہ کی طرف سے سر شادی لال اور آغا حیدر کے اجلاس میں اپنی بحث میں اقبالِ جرم کی شہادت کی کئی خامیوں کی طرف توجہ دلائی جن کی وجہ سے اقبالِ جرم کی کہانی بالکل ناقابلِ اعتبار ٹھہرتی تھی۔ سرکاری وکیل صاحب سے جواباً کچھ بن نہ آیا۔ عدالت (شادی لال و آغا حیدر) نے فیصلہ محفوظ رکھا۔ چند دن بعد جب فیصلہ صادر ہوا تو بالکل خلاف توقع عدالت نے مزید شہادت کے لئے دفعہ ۴۲۸ ضابطہ فوجداری کے ماتحت کیس عدالت سیشن میں واپس کیا۔ گویا عدالت نے یہ تو تسلیم کیا کہ جو شہادت پیش کی جا چکی ہے اس کی بنا پر اپیل کنندہ عبداللہ کے خلاف جرم ثابت نہیں ہوتا اس صورت میں انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ اپیل منظور کر کے عبداللہ کو بری کیا جاتا مگر عدالت (شادی لال آغا حیدر ڈویژن بنچ) نے میری بیان کردہ خامیوں کی طرف توجہ دلا کر مزید شہادت قلم بند کئے جانے کا حکم صادر کیا۔ جب کیس ہائیکورٹ میں واپس آیا تو پھر تفصیلی بحث ہوئی اور عدالت نے یہ قرار دیتے ہوئے کہ اب کوئی خامی باقی نہیں رہی عبداللہ کی اپیل خارج کر دی۔ چند ماہ بعد ایک دن گرمی کی شدّت کے موسم میں ہائیکورٹ میں بجلی کی رو بند ہوگئی۔ میں اُس وقت مسٹر جسٹس آغا حیدر کے سنگل بنچ اجلاس میں کسی اور مقدمہ میں پیش تھا۔ روشنی اور پنکھے بند ہوگئے۔ خس کی ٹٹیوں میں سے ہوا گزارنے والی مشین بھی بند ہوگئی اور شدید حبس محسوس ہونے لگا۔ مسٹر جسٹس

آغا حیدر لحیم شحیم بھاری بھرکم پہلوان تھے۔ چند منٹوں میں بے چین ہو گئے۔ میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا یہ بھی کوئی عدالت ہے ؟ عمارت ایسی ہے کہ گرمیوں میں شدید گرم اور سردیوں میں سخت سرد۔ یہاں کام کیسے ہو اور یہاں انصاف بھی کیا ہوتا ہے۔ تمہیں یاد ہے وہ عبداللہ کا کیس اُس میں کیا ہوا تھا ؟ میں ان کا آخری فقرہ سن کر ششدر رہ گیا۔ اُن کی واضح مراد تھی کہ عبداللہ کے کیس میں انصاف نہیں ہوا تھا اور اُسے ناحق پھانسی دے دی گئی۔ لیکن باوجود اس احساس کے ان جج صاحب نے نہ صرف اُس فیصلہ میں شرکت کی تھی بلکہ پھانسی کے وارنٹ پر دستخط بھی کئے تھے۔ اگر انہیں چیف جسٹس کے ساتھ اتفاق نہیں تھا تو اپنا اختلافی فیصلہ لکھتے۔ اس صورت میں اپیل کی سماعت کسی تیسرے جج کی عدالت میں ہوتی اور آخری فیصلے کی ذمہ داری اُس پر ہوتی ۔ لیکن انہیں چیف جسٹس (شادی لال) سے اختلاف کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اپنے ضمیر کا خون کرنا گوارا ہو گیا۔" (مقتول بنیا تھا اور جس پر الزام تھا وہ مسلمان)

شادی لال کا ذکر پہلے ہی طویل ہو گیا ہے۔ ورنہ قدرت نے انہیں مسلمانوں کے ساتھ اُن کی ناانصافیوں کی جو عبرت ناک سزا دی اور آخری عمر میں جو اُن کا حال ہوا وہ اُن کے ایک ہندو قریبی دوست کی زبانی یہاں نقل کرتا۔ اگر ناظرین میں سے کسی کو اس میں دلچسپی ہو تو "تحدیثِ نعمت" طبع ثانی کے صفحات ۲۳۱ اور ۲۳۲ پر "سر شادی لال کے آخری ایام" کے عنوان کے تحت جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ملاحظہ فرمالیں۔ بیشک "ہر عمل کے لئے ہے ردِّ عمل۔ وہر نیش کا جواب ہے نیش۔ نیز سے آسمان لیتا ہے انتقام شغال وانشتر دبیش۔ شادی لال میں شیر والی کوئی خوبی نہ تھی۔ اُس کی "خوبیاں" روباہی تھیں لیکن قدرت نے اُن کے زخم خوردہ عبداللہ جیسے مظلوموں کا انتقام لے کے چھوڑا۔

یہاں یہ ذکر بھی کر دوں کہ ۱۹۲۴ء کی آخری سہ ماہی میں علامہؒ نے راقم الحروف کے پنجاب کی جوڈیشل سروس میں لئے جانے کے سلسلہ میں جو کوشش کی اُس میں شادی لال سے سفارش بھی شامل تھی۔ اُن کی کوشش کامیاب رہی۔ اُن دنوں تو نہیں لیکن جلد ہی مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بھی شادی لال کی ایک چال تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ اگلے سال ہائیکورٹ میں ایک مسلم جج کی جگہ خالی ہونے والی ہے۔ اُس نے علامہؒ کو اُس سے محروم رکھنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ اس لئے علامہؒ کی

سفارش پر اُن کے ایک عزیز کو سب جج مقرر کرکے یہ ظاہر کیا کہ انہیں علامہ سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں۔ راقم الحروف کے لئے ابھی تک یہ احساسِ ندامت سوہانِ روح ہے کہ اس کے لئے انہیں شادی لال ایسے شخص سے "مومیائی" مانگنا پڑی (۲۱) راقم الحروف کو بھی علامہ پر ظلم کرنے والوں کی فہرست میں شامل سمجھنا چاہیئے۔

پچھلے صفحات میں علامہ سے "بیگانوں کی ناخوشی" کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اب "اپنوں کے خفا" ہونے کی بات بھی بیان کر دی جائے (۲۲) میاں فضل حسین پنجاب کے چوٹی کے وکلا میں سے تھے۔ ۱۹۲۱ء سے پہلے بھی وہ پنجاب کی سیاست میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ۲۱ء میں وہ حکومت پنجاب کے وزیر مقرر ہوئے اور ۳۰ء تک دس سال بطور وزیر اور بطور ممبر عاملہ پنجاب میں سرگرم عمل رہے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک وہ حکومتِ ہند میں وائسرائے کی کونسل کے رکن رہے۔ یہ پندرہ سال کا عرصہ فضل حسینی دور تھا جس میں اُن کا اقتدار اپنے عروج پر تھا اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ پنجاب میں اور دہلی میں جہاں بھی وہ اقتدار میں ہوتے ان کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہ ہل سکتا تھا۔ وہ دوربین، دور اندیش سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے حسنِ تدبیر سے کام لینے والے انگریز شناس سیاست دان تھے۔ اُن کے دور اقتدار میں ان کی تعمیری خدمات مسلمانانِ ہند کے لئے عموماً اور مسلمانان پنجاب کے لئے خصوصاً اُن کے مستقبل کے لحاظ سے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِن سب خوبیوں کے باوجود وہ ایک انسان تھے۔ فرشتہ نہ تھے۔ ہم سب کی طرح اُن میں بھی بشری کمزوریاں تھیں۔ وہ اپنے خلاف کہی گئی بات کو دل میں رکھتے تھے۔ درگذر کا لفظ شاید اُن کی لغت میں نہ تھا۔ پہلے کسی باب میں ذکر کیا گیا ہے کہ ۱۹۱۱ء میں علامہ نے ایک قطعہ میں ان دنوں کے مسلمان لیڈروں کی ہجو کی تھی۔ یہ قطعہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں نظم "شکوہ" سنانے سے پہلے سنایا گیا تھا۔ اُس میں اُن دنوں کے مسلمان لیڈروں کے "اوصاف" بیان کرتے ہوئے بین السطور انہیں قوم فروش کہا گیا تھا۔ اس کتاب میں وہ قطعہ نقل کر دیا گیا ہے شاعر کا اشارہ کسی خاص لیڈر کی طرف تھا یا نہیں لیکن عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ اشارہ میاں فضل حسین کی طرف ہے جو اُن دنوں سرکار دربار میں جگہ پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُس وقت سے میاں صاحب کو علامہ سے درپردہ پرخاش رہی۔ علامہ نے اس رنجش کو مٹانے کی کوشش بھی کی لیکن کامیابی

نہ ہوتی۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ میاں صاحب کے اقتدار کے زمانے میں مسلمانوں کے خواص میں جنہیں اُن سے کام پڑتا رہتا تھا میاں صاحب مقبول تھے۔ لیکن عوام میں انہیں وہ مقبولیت حاصل نہ تھی جو اپنی شاعری کی وجہ سے علامّہ کو حاصل تھی۔ یہ بات بھی میاں صاحب کو ناگوار تھی۔

میاں صاحب کی علامّہ اور ان کے دو ایک ساتھی مسلمان زعما بالخصوص میاں شاہ نواز کو سرکاری مناصب کے لئے نظر انداز کرنے کی پالیسی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ بیگم شاہ نواز نے اپنی ایک تصنیف میں کھلے بندوں اس کا ذکر کیا ہے(۲۳) یہ تاثر اس قدر عام تھا کہ میاں صاحب کے فرزند میاں عظیم حسین کو میاں صاحب کے متعلق اپنی تصنیف (۲۴) میں اس کی تردید میں بہت زور لگانا پڑا ہے۔ اب اُن سے کون کہے کہ۔

اتنا نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

۲۶ء کے آخر میں پنجاب کی مجلس قانون ساز کے لئے انتخاب ہوا تو علامّہ بھی لاہور کے مسلم حلقہ سے کامیاب ہوئے۔ میاں فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی اپنی اکثریت کی وجہ سے برسر اقتدار تھی۔ اس میں ہندو زمیندار بھی شامل تھے۔ مخالف پارٹی ہندو سبھائیوں وغیرہ کی تھی۔ علامّہ بھی یونینسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے۔ ان کو سبز باغ دکھایا گیا کہ چودھری شہاب الدین کی میعاد ختم ہوئی تو انہیں اسپیکر بنایا جائے گا۔ وقت آیا تو پھر چودھری شہاب الدین کو ہی چن لیا گیا۔ عظیم حسین اس بدعہدی کے جواز میں یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ علامّہ کو اسپیکر منتخب کرنے کی تجویز تھی اور اس تجویز کا سہرا وہ اپنے والد کے سر باندھتے ہیں لیکن کہتے ہیں "چونکہ علامّہ نے پارٹی کی پالیسی پر تنقید کرکے اور اخباروں میں اس کے خلاف لکھ کر اس کی ہمدردی کھو دی اس لئے پارٹی کی اکثریت نے ان کو کونسل کا صدر منتخب کرنے سے انکار کر دیا۔" (۲۵) اپنے بیان کی تائید میں انھوں نے انتخابِ اسپیکر سے پہلے علامّہ کے کسی بیان کا حوالہ نہیں دیا۔ یہ بات کہ میاں صاحب کی مرضی کے خلاف پارٹی کی اکثریت کوئی فیصلہ کرے وہی شخص مان سکتا ہے جو میاں صاحب اور ان کے طریقہ کار سے ناواقف ہو۔ جب تک میاں صاحب پارٹی کے لیڈر رہے۔ میاں صاحب ہی پارٹی تھے اور پارٹی کا جو فیصلہ ہوتا انہیں کی ایما کے مطابق ہوتا تھا۔

میاں عظیم حسین اپنے والد کے علامہ کی امداد کی ایک اور مثال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "۱۹۲۴ء میں فضل حسین نے سر میلکم ہیلی گورنر پنجاب کو ترغیب دی کہ وہ ڈاکٹر اقبال کو عدالت عالیہ کی ججی کا عہدہ دیں لیکن یہ امر ابھی زیر غور تھا کہ ڈاکٹر اقبال نے حکومت پر بے لگام تنقید کر کے سرکاری افسران کی ہمدردیاں کھو دیں۔" اُن کے اس بیان کی تردید شادی لال کے اُس بیان سے ہوتی ہے جو پچھلے صفحات میں نقل کیا گیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ججی کی آسامی کے لئے گورنر علامہ اور میاں شاہنواز میں سے کسی ایک کو مقرر کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے ایک ترکیب سے گورنر کو اُن کے نامزد کردہ آغا حیدر کو مقرر کرنے پر آمادہ کیا۔ یوں بھی ججوں کی تقرری کے معاملہ میں چیف جسٹس کی رائے کو بڑا دخل ہوتا ہے اور ان کی رائے علامہ کے خلاف تھی۔" حکومت پر بے لگام تنقید سے سرکاری افسروں کی ہمدردیاں کھو دینے کی "طوطا مینا" کی کہانی عظیم حسین صاحب کی ایجاد معلوم ہوتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سر فضل حسین نے علامہ کو جنوبی افریقہ میں ہندوستان کا ایجنٹ جنرل بنانے کی پیش کش کی تھی جو علامہ نے قبول نہ کی۔ یہ پیش کش کرتے وقت میاں صاحب کو معلوم تھا کہ علامہ کی بیگم پردہ کرتی ہیں اور اس لئے وہ اس پیشکش کو منظور نہ کر سکیں گے۔ یہ پیش کش صرف یہ کہہ سکنے کے لئے کی گئی کہ ہم تو مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن علامہ خود ہی انکار کر دیتے ہیں۔ ایسی پیشکش کرنا ستم ظریفی نہ تھی تو اور کیا تھی

اس سلسلہ میں میاں صاحب کی علامہ سے ہمدردی کے ثبوت میں اُن کے اُس خط کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جو انہوں نے ۲ مئی ۱۹۳۴ء کو میاں امیر دین کو لکھا (۲۶) جس میں دریافت کیا گیا کہ "اقبال کا کیا حال ہے۔ میں نے سُنا تھا وہ علیل ہیں اور مالی مشکلات سے دوچار۔ مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر آپ مجھے بصیغۂ راز اطلاع دیں کہ صحیح پوزیشن کیا ہے۔ میں کالج کے ایام سے اُن کا بڑا مداح رہا ہوں۔ اور ایک بار پھر اُن کی امداد کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہو سکے کہ صحت اور مالی اعتبار سے وہ کس حال میں ہے۔ اگر واقعی پریکٹس کر رہے ہیں تو فی الحال اُس سے آمدنی کی کیا صورت ہے۔" کچھ بدگمان اقبالیئے تو سمجھتے ہیں کہ اس خط میں علامہ کی بدحالی پر تعلیں بجائی گئی ہیں لیکن ایسا خیال کرنا سخت بدظنی اور ناانصافی ہوگی۔ میاں صاحب سے ایسی خفیف الحرکتی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ میاں صاحب اُن دنوں خود بھی کافی علیل تھے۔ اس خط کو

زیادہ سے زیادہ "زود پشیماں کا پشیماں ہونا" سمجھا جا سکتا ہے۔

چھوٹے موٹے ظلم تو اُن پر اُن حضرات نے بھی روا رکھے جو اُن کے حلقۂ احباب میں شمار ہوتے تھے۔ مثلاً مولانا سالک جن کے علامہ سے گہرے مراسم تھے۔ راقم الحروف کو بھی مولانا سے نیاز حاصل تھا اس لئے علامہ سے مولانا کی عقیدت سے بخوبی واقف ہوں۔ تحریک خلافت کے سلسلہ میں مولانا کو ایک سال جیل میں رہنا پڑا۔ ۱۹۲۲ء کے آخر میں رہا ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد جب یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو نئے سال کے خطابات کی فہرست شائع ہوئی تو اُس میں علامہ کے لئے بھی نائٹ ہڈ کا خطاب درج تھا۔ تحریک ترک موالات کی وجہ سے عوام میں سرکاری خطابات کے خلاف ایک گونہ نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ اس لئے علامہ کو خطاب ملنے پر اخبارات میں بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ مولانا سالک جیل میں ایک سال کی صعوبت برداشت کر کے تازہ تازہ رہا ہوئے تھے۔ انہوں نے انگریز کے خلاف جیل کی کلفت کا اپنا سارا غصّہ علامہ پر نکالا۔ اپنے مشہور کالم "افکار و حوادث" میں علامہ کو رگیدا اور روزنامہ "زمیندار" میں بھی کچھ اشعار علامہ کے خطاب کے خلاف شائع کئے جو زبانِ زدِ عام ہو گئے۔ راقم الحروف کو وہ اشعار سوائے ایک مصرعہ کے یاد نہیں رہے۔ ایک مصرعہ جو یاد ہے وہ یہ تھا۔

سرکار کی دہلیز پر سر ہو گئے اقبال

بقول مولانا سالک "وہ ایک فوری جذبہ تھا" جب انہیں "بازی بازی باریش بابا ہم بازی" کا احساس ہوا تو بقول ان کے "اشعار چھپ جانے کے بعد راقم پر ندامت کا غلبہ ہوا اور چند ہفتے علامہ کی خدمت میں حاضری کی جرأت نہ کر سکا۔ لیکن جب آخر ڈرتے ڈرتے حاضر ہوا تو علامہ کے طرزِ تپاک اور محبت آمیز سلوک میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ بلکہ وہ شاکی تھے کہ اتنی مدت تک ملنے کیوں نہ آئے۔" (۲۷)

مولانا ظفر علی خاں جن کا صحافت اور شاعری میں بڑا نام ہے کے بھی علامہ سے ظاہرا طور پر گہرے مراسم تھے۔ مولانا طبیعت کے ذرا متلون مزاج اور جلد مشتعل ہو جانے والے تھے۔ ایک دفعہ معلوم نہیں کس بات پر علامہ سے ناراض ہو گئے تو اپنے اخبار میں یہ ڈینگ ماری کہ منم کردہ ام رستم داستاں۔ دگرنہ یلے بود در سیستاں" اسی طرح جب علامہ نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ

کی مخالفت کی تو "زمیندار" جس نے اُن دنوں کانگریس کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی علامہ کے خلاف نہ صرف زہریلے مقالات شائع کئے بلکہ مولانا نے اُن کے ہجو میں ایک نظم بھی شائع کی جس کے یہ دو شعر یاد رہ گئے ہیں ۔

مانگ کر احباب سے رجعت پسندی کی کدال

قبر آزادی کی کھودی کس نے سر اقبال نے

کہہ رہے تھے ڈاکٹر عالم یہ افضل حق سے

قوم کی لٹیا ڈبو دی کس نے سر اقبال نے (۲۹)

اسی طرح ایک اور سیاست دان تھے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں علامہ اقبال سے نہایت گہری عقیدت تھی (نام دانستہ نہیں لکھتا) راقم الحروف کی موجودگی میں ایک دن علامہ کی ملاقات کو آئے۔ علامہ پلنگ پر دراز تھے۔ شاید طبیعت ناساز تھی اور ملاقاتی بھی پلنگ کے ارد گرد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ دو ایک کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ یہ عقیدت مند پلنگ کی پائینتی زمین پر بیٹھ گئے۔ خود علامہ کے اصرار کے باوجود کہ کرسی پر بیٹھیں وہ ٹس سے مس نہ ہوئے اور یہی کہتے رہے "اس دربار میں میرے لئے یہاں بیٹھنا بھی قابل فخر ہے۔" اسی عقیدت مند نے اپنی ایک تحریر میں علامہ کو دول ہمت۔ شیر قالین، عملی بات سمجھنے سے قاصر کہا اور یہ بھی کہ اقبال سے نہ پہلے کچھ ہو سکا اور نہ اب ہو سکے گا۔ تھے اقبال کے مہرباں کیسے کیسے

پھر ان کی زندگی کے آخری سالوں میں ایک سیاسی جماعت سے تعلق رکھنے والے ایسے ہی مہربانوں نے اُن پر ایک اور ظلم کیا جس کا ذکر پہلے ایک باب میں کر دیا گیا ہے۔

ان کے بستر مرگ پر آل انڈیا مسلم لیگ نے جو ظلم ان کے ساتھ روا رکھا اس کا ذکر محمد احمد خاں کی تصنیف "اقبال کا سیاسی کارنامہ" کے حوالہ سے "زندہ رود" حصہ سوئم کے صفحہ ۶۴۶ پر کیا گیا ہے۔

علامہ نے بقول جاوید اقبال " بالآخر اپنا کام ادھورا چھوڑ کر عجب بے چینی، بے تابی اور بیقراری کے عالم میں وفات پائی "(۲۸) انا للہ وانا الیہ راجعون

سر آمد روزگارے آں فقیرے

دگر دانائے راز آید کہ ناید

ماٰخذ

۱۔ "روزگارِ فقیر" جلد دوئم صفحہ ۲۵۱

۲۔ "علامہ اقبال اور اُن کی پہلی بیوی" مطبوعہ "انجمن پریس" کراچی (جون ۶۷ء)

۳۔ (الف) ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یعنی قیامِ انگلستان کے زمانے کی وہ نظم جو "بانگِ درا" میں "وصال" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے :-

جستجو جس گُل کی تڑپاتی تھی اے بُلبُل مجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مِل گیا وہ گُل مجھے

علامہ کے کاغذات میں اس نظم کا عنوان "..... کے نام" تھا اور میری بیاض میں یہ نظم اسی عنوان سے درج ہے۔

(ب) اسی زمانہ قیامِ انگلستان کی نظم جو بانگِ درا میں "حسن و عشق" کے عنوان کے تحت شامل ہے جس کے آخری بند میں یوں خطاب کیا ہے :-

ہے مرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار ؛ میرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں ؛ نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال ؛ تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال
قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

(ج) اُسی زمانے کی ایک نظم جو علامہ کے کاغذات میں "پیش کش بہ ....." کے عنوان سے درج تھی اور اسی عنوان سے میری بیاض میں درج ہے۔ یہ نظم ان کے کسی مجموعہ میں شائع نہیں ہوئی۔ صرف فقیر وحید الدین نے میری بیاض سے لے کر "روزگارِ فقیر" حصہ دوئم میں شائع کی ہے۔ اس نظم کے دو چار شعر یہ ہیں :-

ہے ترے دم سے شررِ آباد خاکستر مری ؛ واسطے تیرے طبیعت ہے چمن پرور مری
گلستاں بن کر مہک اٹھا دلِ پرخوں مرا ؛ ہے سرود آموزِ بلبل نالۂ موزوں مرا
میرے نقاشے میں پیدا ہو گیا اندازِ نو ؛ اور ہی میری زمیں ہے اور ہے گردوں مرا
ہے ترے نورِ خفی سے محفل افروزی مری ؛ تیرے قدموں پر تصدق ہے جگر سوزی مری

(د) اُسی زمانۂ قیام انگلستان کی نظم "جگنو" کے عنوان سے بانگ درا میں شائع ہوئی۔ اس کے دو ایک شعر یہ ہیں:

میرے خورشید کبھی تو بھی اٹھا اپنی نقاب ٭ بہر نظارہ تڑپتی ہے نگاہِ بے تاب

تیرے جلوے کا نشیمن ہو مرے سینے میں ٭ عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں

زندگی ہو تیرا نظارہ مرے دل کیلئے ٭ روشنی ہو تیرا گہوارہ مرے دل کے لئے

(ہ) عطیہ فیضی کی ہمشیرہ نازلی بیگم جنجیرہ کی تعریف میں بھی زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں:

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر ٭ اور فیض آستاں بوسی سے گل بر سر قمر

روشنی لے کر مگر تیرے غبار راہ سے ٭ آسماں کو دیتا ہے اک نور کی چادر قمر

۴۔ خط بنام میاں جی محررہ ۳ جنوری ۱۲ء جس کی نقل اس کتاب میں شامل ہے۔

۵۔ مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی

۶۔ روزنامہ "زمیندار" لاہور شمارہ ۱۵ اکتوبر ۲۵ء
"ذکر اقبال" سالک صفحہ ۱۲۹

۷۔ "ذکر اقبال" سالک صفحہ ۱۳۰

۷۔(الف) "اقبال اور حیدر آباد دکن" نظر حیدرآبادی صفحہ ۱۸

۸۔ کی وزیر شاہ نے وہ عزت افزائی مری ٭ چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے تھے نثار
(نظم "شکریہ" "سرود رفتہ" صفحہ ۱۷۱)

۹۔ زندہ رود جلد دوم صفحہ ۱۴۵

علامہ کا خط بنام اکبر الہ آبادی محررہ ۴/۱۲/۱۷ اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۴۳

۱۰۔ "بانگ درا" طبع ۲۱ صفحہ ۱۶۰

۱۱۔ خط بنام مہاراجہ کشن پرشاد محررہ ۲۸ دسمبر ۱۴ء اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۲۱۰

۱۲۔ خط بنام مہاراجہ کشن پرشاد محررہ ۱۰ اپریل ۱۷ء اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۱۸۴

۱۳۔ ایضاً محررہ ۲۰ جنوری ۱۸ء اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۱۹۱

۱۴۔ اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے سہ ماہی رسالہ "اقبال ریویو" کی خصوصی اشاعت (اپریل جون ۱۹۸۴ء) صفحہ ۱۰

۱۵۔ ایضاً صفحات ۳۰ تا ۳۸

۱۶ ایضاً صفحہ ۴۲

۱۷۔ ذکرِ اقبال۔ سالک صفحہ ۱۱۷ بحوالہ شاد اقبال

۱۸۔ ایضاً صفحہ ۱۲۶

۱۸ (الف) ایضاً صفحہ ۱۲۷

۱۹۔ زندہ رود جلد دوم (۱۹۸۱) صفحات ۲۸۷، ۲۸۸

۲۰۔ تحدیثِ نعمت طبع ثانی (۱۹۸۱ء) صفحات ۲۲۷، ۲۲۸

۲۱۔ مرا از شکستن چناں عار ناید
که از دیگراں خواستن مومیائی

۲۲۔ اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

۲۳۔ نادر ایسٹ ڈاکٹر جہاں آرا شاہنواز ۱۹۷۱ء صفحہ ۶۵

۲۴۔ فضل حسین۔ ایک سیاسی بیاگرافی (انگریزی)

۲۵۔ ذکرِ اقبال سالک صفحہ ۱۹۳

۲۶۔ زندہ رود جلد سوئم صفحہ ۵۹۸

۲۷۔ ذکرِ اقبال سالک صفحہ ۱۱۷

۲۸۔ "زندہ رود" حصہ سوم (۱۹۸۴ء) پیش لفظ صفحہ ب

۲۹۔ "سر اقبال کو" آزادی کی قبر کھودنے اور قوم کی لٹیا ڈبونے کا طعنہ دینے والے مولانا خود برسوں ہر صبح اپنے "خیر خواہ دولت برطانیہ" اور "جاں نثار قیصر ہند" ہونے کا اعلان بہ بانگ دہل کرتے رہے۔ ان کے روزنامہ کی پیشانی پر ہر روز ان کا یہ شعر بڑے فخر کے ساتھ چھپتا تھا۔

تم خیر خواہ دولتِ برطانیہ رہو ؛ سمجھیں جنابِ قیصرِ ہند اپنا جاں نثار

علامہ اقبال کے مکاتیب

نقل و حرکت کے معاملہ میں چچا جان "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد" واقع ہوئے تھے لیکن خط و کتابت میں بڑے مستعد تھے۔ ان کے نام خاصی تعداد میں خطوط موصول ہوتے۔ خط کسی عزیز کا ہو یا دوست کا۔ کسی واقف کا ہو یا ناواقف کا وہ پہلی فرصت میں اپنے ہاتھ سے جواب لکھتے۔ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے کبھی جواب میں تاخیر ہو جائے تو ہو جائے ورنہ حتی الامکان خط لکھنے والے کو جواب کے انتظار کی زحمت نہ دیتے۔ ۱۹۳۷ء کے شروع میں موتیا شدت سے اترنا شروع ہوا تو معالجوں نے لکھنے پڑھنے کی ممانعت کر دی۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے اس معمول میں فرق نہ آنے دیا۔ اتنا ہوا کہ اب خط کے جواب کا مضمون اپنے حاشیہ نشین احباب میں سے کسی کو لکھوا دیتے۔ اگرچہ جاوید کی عمر اس وقت صرف تیرہ سال تھی لیکن کبھی کبھی یہ کام اس سے بھی لے لیا جاتا تھا۔

لاہور میں تعلیم و تعلم کے زمانے میں انہوں نے جو خطوط اپنے والد یا بڑے بھائی کو لکھے ان میں سے کوئی خط محفوظ نہیں۔ اُن دنوں کسی کو اُن کے خطوط کی قدر قیمت کا احساس بھی کہاں ہو گا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اُن کا قیام زیادہ تر انگلستان میں رہا۔ اگرچہ وہ میرے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہاں سے اُن کا خط میاں جی کے

نام ہفتہ میں ایک بار ضرور آتا۔ شہر میں "ولایت کی ڈاک" کی تقسیم کا ایک دن مقرر تھا۔ اُس دن بے جی کو ڈاکیے کا سخت انتظار رہتا۔ وہ خط لاتا تو بے جی اُسے چار آنے دیا کرتی تھیں۔ اگر ولایت کی ڈاک کی تقسیم کے دن کسی وجہ سے ڈاک نہ آتی تو گھر بھر کی شامت آجاتی۔ بے جی ہر ایک سے بات بے بات اُلجھتیں۔ بیچارے بے قصور ڈاکیے کو کوستیں۔ ایسے موڈ میں اُن سے کوئی بات منوانا میرے لئے بھی ممکن نہ ہوتا حالانکہ میری بات وہ بہت کم ٹالتی تھیں۔ اُن ایام میں ابّا جان کا قیام اپنی جائے ملازمت پر ہوتا تھا۔ ان کے نام چچا جان کے خطوط وہاں جاتے ہوں گے۔ اُن تین سالوں میں جو خطوط میاں جی اور ابّا جان کے نام آئے اُن میں سے بھی کوئی خط محفوظ نہیں رہا۔

انگلستان سے واپس آکر چچا جان نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ اپنی وفات تک قریباً تیس سال کے عرصہ میں انہوں نے بہت سے خطوط میاں جی اور ابّا جان کو لکھے ہوں گے۔ ان میں سے صرف ۶۳ خطوط محفوظ ہو سکے کیونکہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۱ء تک تعلیم کے سلسلہ میں اور پھر ۱۹۲۶ء سے چچا جان کی وفات تک ملازمت کے سلسلہ میں میرا قیام سیالکوٹ سے باہر رہا۔ تعلیم کے دوران چھٹیوں میں سیالکوٹ جاتا تو ان کا کوئی خط اگر میرے ہاتھ لگتا تو اُسے محفوظ کر لیتا۔ ملازمت کے عرصہ میں اس کا اہتمام بھی نہ ہو سکا۔ ان ۶۳ خطوط کے علاوہ ۳۸ خطوط ایسے ہیں جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۷ء کے دوران مجھے لکھے گئے۔ ایک خط ہماری پھوپھی کریم بی بی کے نام ہے اور ایک میرے چھوٹے بھائی مختار کے نام۔ یہ ۱۰۳ خطوط ضروری وضاحتوں کے ساتھ شائع کئے جا رہے ہیں۔ خطوط کی ترتیب اُن کی تاریخِ تحریر کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ ہر مکتوب علیہ کے نام خطوط یکجا درج نہیں کئے گئے۔ ان خطوط کے لئے یہی ترتیب مناسب معلوم ہوئی۔

ان خطوط کی اشاعت سے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں۔ اس لئے خطوط کے وہ حصے حذف کر دیئے گئے ہیں جن میں چچا جان کی متاہل زندگی کے المیہ کا ذکر ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے چچا جان اور بڑی چچی جان کی وفات کے بعد اس المیہ کے متعلق پبلک میں بحث و تمحیص مجھے مناسب معلوم نہیں ہوئی اور اب تو بھائی آفتاب بھی فوت ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

تینوں سے رحمت کا سلوک فرمائے۔ اچچا جان کے دستخطی سب خطوط اب پاکستان نیشنل میوزیم کراچی کی تحویل میں دے دیئے گئے ہیں۔

(١)

۱۹۱۴ء کی پہلی ششماہی میں میں نے سکاچ مشن سکول سیالکوٹ سے انٹرنس کا امتحان دیا۔ میں ریاضی کے مضمون میں سخت کمزور تھا اور امتحان میں میری کامیابی مشکوک تھی۔ میرے ایک ہم جماعت امتحان کے نتیجے کا پتہ لگانے کے لئے لاہور گئے۔ اُن کا کوئی عزیز غالباً یونیورسٹی کے دفتر میں ملازم تھا۔ نتیجے کے مشتہر ہونے سے ایک دن قبل وہ سیالکوٹ واپس آئے اور امتحان میں اپنی اور میری کامیابی کا مژدہ سنایا۔ میں نے اُسی وقت چچا جان کی خدمت میں خط لکھ کر دریافت کیا کہ آئندہ تعلیم کے لئے مجھے کس کالج میں داخلہ لینا چاہیئے۔ اُن کے نام یہ میرا سب سے پہلا خط تھا۔ اس کے جواب میں اُن کا یہ خط موصول ہوا جو میرے نام ان کا پہلا خط تھا۔

لاہور ۲۴ جون ۱۴ء

عزیزاز جان اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا نتیجہ کل نکلا تھا مگر مجھے علم نہ تھا کہ نتیجہ نکل گیا ہے۔ آج پتہ چلا تو میں یونیورسٹی گیا اور تمہارا نام کامیاب طلباء میں دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی۔ گھر آیا کہ تم کو تار دوں مگر میز پر تمہارا کارڈ پڑا پایا۔ الحمدللہ تم نے پہلی منزل طے کر لی۔ تمہارے نمبر ۲۴۰ ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئے ہو۔ ایف اے کے لئے اس سے زیادہ محنت و توجہ کی ضرورت ہوگی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالے تمہیں ہمیشہ اسی طرح کامیاب کرتا رہے۔ ایف اے کورس کی فہرست بنا کر مجھے ارسال کرنا ممکن ہے بعض کتابیں گھر میں موجود ہوں۔ ان کے خرید کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ میری رائے میں یہ بہتر ہے کہ تم ابھی دو سال اور سیالکوٹ میں رہ لو اور وہاں کے سکاچ مشن کالج میں داخل ہو جاؤ اور نیز یہ بھی لکھو کہ کون کون سے مضمون

امتحان ایف اے کے لئے لینا چاہتے ہو۔ یہ یاد رکھو کہ تم اب کالج میں داخل ہوا چاہتے ہو تمہارا بچپن کا زمانہ گزر گیا ہے کالج کے لڑکے جنٹلمین سمجھے جاتے ہیں نہ لڑکے۔ یہ مرحلہ ایف اے کا مشکل ہے شروع سے ہی توجہ اور بلاناغہ کام کرنا چاہیئے۔ تین گھنٹے ہر روز پڑھائی کافی ہے بشرطیکہ باقاعدہ ہو۔ ایف میں کم از کم تم کو سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہونا چاہیئے۔ بی اے کے واسطے تم کو گورنمنٹ کالج میں داخل کر دیا جائے گا۔ اپنے اباّ سے میرا سلام کہنا اور ان کو میری طرف سے بہت بہت مبارکباد دینا۔ علی ہذالقیاس والد مکرم اور والدہ کی خدمت میں بھی مبارک باد کہنا۔

والسلام
محمد اقبال

چچا جان کے ارشاد کے بموجب میں نے سیالکوٹ میں اُن کے پرانے کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت تک اس کالج میں بی اے تک تعلیم کا انتظام ہو چکا تھا۔ کالج کے لئے علیحدہ عمارت شہر سے باہر تعمیر ہو گئی تھی اور نام بجائے سکاچ کالج کے مرے کالج لکھا جا چکا تھا۔ چچا جان کے استاد مولانا میر حسن کالج میں عربی پڑھاتے تھے۔ وہی مجھے داخلہ کے لئے پرنسپل کے پاس لے کر گئے۔ مولانا پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے سروقد کھڑے ہو کر تعظیم دی اور جب تک مولانا کرسی پر بیٹھ نہ گئے وہ بھی کھڑے رہے۔ کالج کے دیگر اساتذہ اور طلباء بھی اسی طرح مولانا کی تعظیم کرتے تھے۔ مولانا نے یہ کہہ کر پرنسپل سے میرا تعارف کرایا کہ آپ کے کالج کے ایک "اولڈ بوائے" کے "ینگ بوائے" کو داخلہ کے لئے لایا ہوں۔ پھر چچا جان سے میری قرابت کا ذکر کیا۔ داخلہ کے لئے مولانا کا ساتھ لے جانا ہی کافی تھا۔ چنانچہ داخلہ میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

ایف اے میں فارسی بھی میرا ایک مضمون تھا۔ کالج میں گیارہویں جماعت کو مولانا

فارسی نہیں پڑھاتے تھے لیکن میں نے اُن کے گھر جا کر اُن سے فارسی پڑھی ہے۔ چچا جان کے جاننے والوں اور مداحوں میں سے ایک پروفیسر غلام محمد تھے جو شاعر تھے اور طورؔ جن کا تخلص تھا وہ ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے اور دوسرے پروفیسر محمد شفیع ہسٹری کے استاد تھے دونوں چچا جان سے تعلق کی وجہ سے مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ کالج میں پڑھتے ایک سال ہو چکا تھا کہ پروفیسر طورؔ لاہور گئے اور چچا جان سے بھی ملے۔ انہوں نے میرے متعلق دریافت کیا۔ طورؔ صاحب نے پہلے تو تکلفاً دو ایک کلمہ خیر کہے اور پھر لوپست کندہ میری خامیاں بھی گنوا دیں۔ اس پر چچا جان نے ابّا جان کو یہ خط لکھا۔

لاہور ۱۲ جون ۱۵ء

برادر مکرم۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط ملا الحمد للہ کہ گھر میں سب طرح خیریت ہے پروفیسر طور یہاں بھی آئے تھے میں نے اُن سے اعجاز کے متعلق دریافت کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا مذاق لٹریری ہے۔ عام طور پر وہ اس کی ذہانت کی تعریف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کا دماغ نہایت صاف و روشن ہے مگر جو نقص انہوں نے بیان کئے وہ بھی لکھتا ہوں۔

۱۔ طرز تحریر انگریزی میں اچھا ہے مگر الفاظ بہت نہیں جانتا اور ہجا عموماً غلط لکھتا ہے۔

۲۔ ریاضی میں کمزور ہے یہاں تک کہ ایف اے میں اس مضمون میں پاس ہو جائے تو غنیمت ہے۔

۳۔ پھرتا بہت ہے۔ بیٹھنے سے اُسے نفرت معلوم ہوتی ہے۔

میرے خیال میں نقص نمبر ۳ پہلے دو نقصوں کا ذمہ دار ہے اگر بیٹھنے کی عادت ہو گی تو پڑھنے کی عادت بھی پیدا ہو گی اور اگر پڑھنے کی عادت ہو گئی تو الفاظ بھی بہت سے آجائیں گے اور ہجے بھی صحیح ہو جائیں گے۔ ہجا درست کرنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ کثرت سے مطالعہ ہو اور ہر لفظ جو نہ آتا ہو اس کے معانی ڈکشنری میں دیکھے جائیں اور اس کا ہجا ذہن نشین

کیا جائے۔ جو شخص ایک اجنبی زبان سیکھتا ہے اور ڈکشنری دیکھنے میں سستی کرتا ہے وہ کبھی اس زبان کو سیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کو کم ازکم چار گھنٹہ روز علاوہ کالج کے اوقات کے پڑھنا چاہیے۔ انگریزی ناول پڑھنا مفید ہے کہ دلچسپی کی دلچسپی ہے اور زبان بھی سیکھی جاتی ہے۔ ریاضی کی طرف ابھی سے خاص توجہ چاہیئے ورنہ امتحان میں کامیابی موہوم ہے۔

والسلام
محمد اقبال

چچا جان کے ارشادات میں سے "کم ازکم چار گھنٹے علاوہ کالج کے اوقات کے پڑھنا چاہیئے" اور "ریاضی کی طرف ابھی سے خاص توجہ دینی چاہیئے ورنہ امتحان میں کامیابی موہوم ہے" پر تو افسوس ہے میں نے کچھ ایسا عمل نہ کیا۔ ہاں "انگریزی ناول پڑھنا مفید ہے" پر عمل کرنے میں ساری کسر نکال دی۔ نتیجہ وہی نکلا جس کا اندیشہ طور صاحب نے اور چچا جان نے ظاہر کیا تھا یعنی میں ایف اے کے امتحان میں ریاضی میں فیل ہو گیا۔

آئندہ تعلیم کے لئے مجھے لاہور بھیج دیا گیا۔ ایک فیل شدہ طالبعلم کے گورنمنٹ کالج میں داخلے کا تو امکان ہی نہ تھا لہٰذا مجھے اسلامیہ کالج میں ایف اے سیکنڈ ایئر میں داخل کرادیا گیا۔ اُن دنوں ایف اے میں ریاضی لازمی مضمون تھا۔ اس لئے یہاں بھی ریاضی سے میری خلاصی نہیں ہوئی۔ اسلامیہ کالج سے ایف اے کا امتحان دیا تو میں کامیاب ہو گیا اور بی اے میں اُسی کالج میں داخلہ لے لیا۔

بھائی آفتاب نے سینٹ سٹیفنز کالج دہلی میں داخلہ لیا ہوا تھا۔ چچا جان علاوہ اس ماہانہ رقم کے جو وہ ہماری بڑی چچی محترمہ کو بھیجتے تھے بھائی آفتاب کو ۲۵ روپیہ ماہوار بھیجتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے ۱۸ء میں ان سے مطالبہ کیا گیا کہ ۵۰ روپیہ ماہوار کے حساب سے دو سال کے ۱۲۰۰ روپے یکمشت دیئے جائیں۔ چچا جان کا حال تو "چیل کے گھونسلے میں ماس

کہاں" والا تھا۔ چچی سردار اگرچہ ہماری طرح ایک متوسط حال خاندان کی بیٹی تھیں لیکن بڑی فراخ دل تھیں۔ انہیں اس مطالبے کا علم ہوا تو انہوں نے میاں جی کو لکھا کہ اُن کا زیور فروخت کر کے اس مطالبے کو پورا کر دیا جائے۔ میاں جی نے جواب میں جو خط سردار چچی کو لکھا وہ چچا جان نے پڑھا تو انہیں سردار چچی کی اس پیش کش کا علم ہوا۔ اس پر انہوں نے میاں جی کو یہ خط لکھا۔

نوٹ:۔ یہ تین صفحات کا خط ہے جس میں سے قریباً نصف خط حذف کر دیا گیا ہے۔

لاہور ۹ر جون ۱۸ء

قبلہ و کعبہ من السلام علیکم۔ آپ کا خط جو اعجاز کی چچی کے نام آیا ہے میں نے دیکھا ہے اور نیز اس نے اس خط کا مضمون بھی مجھے سنایا ہے جو اس نے آپ کی خدمت میں تحریر کیا تھا۔ یہ اس کے دل کی وسعت اور فراخ حوصلگی کی دلیل ہے مگر یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ میں اس کا زیور لے کر ایک ایسے لڑکے کی تعلیم پر صرف کر دوں جس سے نہ اسے کچھ توقع ہو سکتی ہے نہ مجھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنا زیور اس خیال سے نہیں دیتی کہ کل کو اسے اس کا معاوضہ ملے گا بلکہ وہ محض اس غرض سے دیتی ہے کہ مجھ پر کوئی شخص حرف گیری نہ کرے لیکن اگر کوئی شخص مجھ پر حرف گیری کرے تو اس کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ وہ شخص مجھ سے ناخوش ہے۔ برخلاف اس کے ناانصافی میں خدا اور رسول کی ناخوشی ہے جس کا برداشت کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔ میں اور لوگوں کی حرف گیری آسانی سے برداشت کر سکتا ہوں خدا و رسول کی ناراضگی سے میرا دل کانپتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ گزشتہ دس سال کے عرصہ میں بیس پچیس ہزار میرے ہاتھوں میں آیا ہے مگر یہ سب اپنے اپنے موقع پر مناسب طور پر خرچ ہوا جس کے لئے اللہ تعالےٰ کا شکر ہے۔ تاہم اس وقت تک میں ایک عمدہ مکان کرایہ پر نہیں لے سکا۔ نہ مکان کے لئے فرنیچر اور ساز و سامان خرید کر سکا ہوں۔ نہ عمدہ گاڑی گھوڑا خرید سکا ہوں یہ سب لوازمات اس پیشہ کے ہیں۔ اب میں نے تہیہ کیا ہے کہ جس طرح ہو سکے یہ لوازمات بہم پہنچائے جائیں۔ اب

حالات اس قسم کے پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کا بہم پہنچانا لازم اور ضرور ہے ہیں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر فضل کرے تو اپنی نظم و نثر سے کوئی مالی فائدہ نہ اٹھاؤں گا کہ یہ ایک خداداد قوت ہے جس میں میری محنت کو دخل نہیں خلق اللہ کی خدمت میں اسے صرف ہونا چاہیئے مگر ضروریات سے مجبور ہو کہ مجھے اس عہد کے خلاف کرنا پڑا - - - - - - - -

- -

- -

شیخ گلاب دین صاحب کو بھی اس نے خط لکھا تھا مگر انہوں نے اُسے یہ جواب دیا ہے کہ حالات مجھے معلوم ہیں اس واسطے میں ڈاکٹر صاحب سے اس بارے میں گفتگو کرنا نہیں چاہتا . . . .

. . . .

اگر کچھ عرصہ بعد میرے ہاتھ میں روپیہ آ گیا تو میں اُسے یکمشت بارہ سو روپیہ دے دوں گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ اپنی خیریت سے اطلاع دیں۔

محمد اقبال لاہور

اس خط میں چچا جان نے وکالت کے پیشے کے بعض ضروری لوازمات کا ذکر کیا ہے جو وہ اپنی دس سالہ پریکٹس میں بہم نہ پہنچا سکے تھے اور لکھا ہے کہ ان لوازمات کو جس طرح ہو سکے بہم پہنچانے کا اب انہوں نے تہیہ کر لیا ہے۔ البتہ ارادہ ان کی افتادِ طبیعت کے بالکل خلاف تھا۔ ان کی شانِ استغناء ظاہری ٹھاٹھ باٹھ سے بے نیاز تھی۔ بھلا جو مفکر "مال و دولتِ دنیا" کو "نقشِ وہم و گماں" سمجھتا ہو وہ "افرنگی صوفوں اور ایرانی قالینوں" کے حصول کے لئے ضروری تگ و دو کیسے کر سکتا تھا۔ اُن کے ہاں آنے جانے والے جانتے ہیں کہ اُن کا "ہر سٹرانہ" ارادہ جس کا اس خط میں ذکر ہے عمر بھر عملی جامہ نہ پہن سکا۔ ۲۲ء کے آخر میں انارکلی والا مکان چھوڑ کر انہوں نے میکلوڈ روڈ پر ایک کوٹھی کرایہ پر ضرور لی لیکن وہ شکستہ کوٹھی "عمدہ مکان" کہلائے جانے کی کسی طرح مستحق نہ تھی اور خود ان کے بقول وہ بس ان کی دعاؤں کے سہارے کھڑی تھی۔ مکان کے لئے تھوڑا بہت فرنیچر اور سازوسامان

بھی خریدا لیکن وہ معمولی سا تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس کوٹھی میں زیادہ تر وہی سامان تھا جو انارکلی والے مکان میں تھا علاوہ ان دو چار گھٹیا (غالباً اٹلی کے بنے ہوئے) قالینوں کے جو ایک ٹھگ اُن کے پاس مہنگے داموں فروخت کر گیا تھا۔ ۲۴ء میں "عمدہ گاڑی گھوڑا" خریدنے کی بجائے ایک موٹر بھی خریدا لیکن سیکنڈ ہینڈ اور بالکل کھٹارا جو اکثر قابلِ مرمت رہتا۔

"یوں رہیں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے"

لیکن خود اس "اہل کمال" کو اس آشفتہ حالی میں رہنے کا افسوس تھا نہ رنج۔ گلہ تھا نہ شکایت۔ بڑے بڑے اہلِ ثروت اور اہلِ کمال ملنے آتے تو اُن سے اپنے معمولی ساز و سامان والے کمرے میں ملتے انہیں ذرا بھی جھجک محسوس نہ ہوتی۔ چونکہ "ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی" کے قائل تھے اس لئے "منظور ہے گزراحت غارت گر ساماں ہو" پر عامل تھے۔

شیخ گلاب دین جن کا اس خط میں ذکر ہے سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ اُن کا مکان ہمارے ساتھ کے محلے میں تھا۔ وہ عرصہ سے لاہور ڈسٹرکٹ عدالتوں میں وکالت کا کام کرتے تھے۔ اس پیشے سے انہوں نے کافی روپیہ کمایا۔ چونکہ سوچ سمجھ کر خرچ کرنے والوں میں سے تھے۔ اس لئے خاصی جائیداد بنائی۔ چچا جان سے اُن کے دوستانہ مراسم ولایت جانے سے پہلے کے تھے۔ لاہور میں ان کی سکونت بھاٹی دروازہ کے اندر داخل ہو کر بائیں ہاتھ ایک گلی میں تھی۔ ولایت جانے سے قبل چچا جان بھی ان کے پڑوس میں ایک مکان میں رہائش رکھتے تھے۔ جب میں نے ایل ایل بی کا امتحان پاس کر لیا تو چچا جان مجھے دو چار ہفتے شیخ صاحب کے ساتھ ڈسٹرکٹ عدالتوں میں بھیجتے رہے تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ ضلع کی عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کس طرح کی جاتی ہے۔

یہاں ایک روایت کی صحت بھی کرتا چلوں۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی اپنے مضمون "لاہور میں علامہ اقبال کی قیام گاہیں" ("صحیفہ" کا اقبال نمبر حصہ اول۔ دسمبر ۷۳ء) میں میکلوڈ روڈ والے مکان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مکان کی شکل صورت بنانے میں علامہ کے بڑے

قبلہ و کعبہ ام ۔ اسلامُ علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے ۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے ۔ کل ایک کارڈ لکھ چکا ہوں ۔ امید ہے ملاحظہ عالی سے گزرا ہو گا ۔ مجھے تو دہلی سے کبھی کوئی خط نہیں آیا اور نہ کسی پروفیسر نے مجھے اُس کی بابت لکھا ہے ۔ . . . . میں نے سنا تھا کہ حافظ صاحب ملازمت چھوڑ کر گجرات چلے گئے ہیں اور اب گجرات میں ہیں مگر یقیناً یہ خبر بھی معلوم نہیں ۔ میرے خیال میں آپ اُسے خط لکھیں اور تسلی دے دیں کہ بیماری سے گھبرانا نہ چاہیئے اور نہ موت سے ڈرنا چاہیئے اور شاید یہ اُس کے لئے تو بہتر ہو کہ اپنے علاج کے لئے چند روز کے لئے گجرات چلا جائے ۔ اچھا ہو جائے تو پھر کالج چلا جائے . . . .

. . . .

. . . . باقی خیریت ہے

محمد اقبال لاہور

(نوٹ : یہ خط دو صفحات کا ہے جس کا اکثر حصہ حذف کر دیا گیا ہے)

خط میں جن حافظ صاحب کا ذکر ہے وہ بھائی آفتاب کے نانا جان ڈاکٹر حافظ عطا محمد صاحب تھے جو سرکاری ملازمت سے پنشن پانے کے بعد ریاست مالیر کوٹلہ میں ملازم ہو گئے تھے ۔ ان کا وطن مالوف گجرات تھا ۔ ریاست کی ملازمت سے فارغ ہو کر وہ گجرات میں سکونت پذیر ہو گئے تھے ۔

۶

چچا جان میاں جی سے اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ کبھی لاہور آ کر ان کے پاس بھی کچھ دن قیام کریں لیکن میاں جی عمر کے تقاضے سے سیالکوٹ سے باہر جانے پر آمادہ نہ ہوتے تھے ۔ یوں تو خدا کے فضل سے اس وقت تک اُن کے قوائے جسمانی اچھی حالت میں تھے ۔ بصارت اور سماعت میں کچھ فرق تو پڑ چکا تھا لیکن چلنے پھرنے میں کوئی دقت

نہ تھی ۔ ضرورت پڑنے پر بازار سے سودا سلف بھی لے آتے ۔ لیکن ضعیف العمری میں معمولاتِ زندگی میں ذراسی تبدیلی بھی گوارا نہیں ہوتی ۔ یہ بھی تھا کہ بے جی کی وفات کے بعد ان کی دیکھ بھال کی ساری ذمہ داری میری والدہ محترمہ نے سنبھال لی ہوئی تھی اور وہ اپنے آرام و آسائش کے لئے اُن پر بہت انحصار کرتے تھے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹ء کے ابتدا میں میاں جی نے کچھ دنوں کے لئے چچا جان کے پاس لاہور جانے کا عزم کیا اور انہیں اس کی اطلاع دی ۔ اِسپر چچا جان نے میاں جی کو یہ خط لکھا۔

"قبلہ و کعبہ اُم السلامُ علیکم ۔ آپ کا کارڈ ابھی ملا ہے الحمداللہ کہ گھر میں سب طرح خیریت ہے ۔ میں دہلی ۲۸ فروری کو غالباً جاؤں گا اور دہلی سے دو چار روز بعد واپس آجاؤں گا ۔ آپ ابھی آجاتے تو یہاں بھی میری عدم موجودگی میں رونق ہو جاتی ۔ اگر آپ تحریر فرمادیں تو میں اعجاز یا علی بخش کو سیالکوٹ بھیج دوں کہ آپ کو ہمراہ لے آئے اور اگر ماہ مارچ میں آنے کی صلاح ٹھہری تو مضائقہ نہیں اس وقت علی بخش یا اعجاز کو بھیج دیا جائے گا اعجاز تو امتحان میں مصروف ہوگا علی بخش کو بھیج دیا جائے گا ۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے ۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ بھاوجہ صاحبہ کو اب بالکل آرام ہے ۔ بھائی صاحب کا خط بھی آج آیا تھا وہ بھی بفضلِ خدا خیریت سے ہیں ۔

والسلام

محمدؐ اقبال لاہور ۲۲ فروری ۱۹ء

میں ان دنوں بی اے کے آخری سال میں تھا اور دو تین ماہ بعد میرا امتحان ہونے والا تھا ۔ پنجاب میں رولٹ ایکٹ کے سلسلہ میں حکومت کے خلاف تحریک کی وجہ سے سفر مشکل ہوگیا اس لئے میاں جی اس سال لاہور نہ جا سکے ۔ خط میں "بھاوجہ صاحبہ" سے مراد میری والدہ محترمہ ہیں ۔ جنہیں گھر میں اور محلے میں سب "بھابھی جی" کہتے تھے ۔ یہاں تک کہ ان کی اولاد بھی یہی کہتی تھی۔

۷

رولٹ ایکٹ کے خلاف سیاسی تحریک زور پکڑ گئی ۔ اپریل کے پہلے ہفتے میں لاہور اور بعض دیگر شہروں میں حکومت کے خلاف مظاہرے ہوئے ۔ جلوس نکلے اور بعض مقامات پر پولیس کے ساتھ تصادم بھی ہوا ۔ ۶ / اپریل کو امرتسر میں مکمل ہڑتال ہوئی ۔ وہاں کے سرکردہ لیڈروں کو شہر بدر کر دیا ۔ لوگ اور مشتعل ہو گئے ۔ ایک دن لاہور کے طلباء نے ایک بڑا جلوس نکالا جس میں میں اور ہمارے اسلامیہ کالج کے بہت سے طلبا پیش پیش تھے ۔ جلوس کے آگے آگے ایک پرچم تھا جس پر رولٹ ایکٹ کے خلاف نعرے لکھے ہوئے تھے ۔ اس پرچم کو ایک طرف سے میں نے اٹھایا ہوا تھا ۔ دوسری طرف سے ایک اور طالب علم نے ۔ جلوس نعرے لگاتا ہوا ریلوے روڈ سے ہوتا ہوا انارکلی بازار میں داخل ہوا ۔ ارادہ مال روڈ پر واقع گورنمنٹ ہاؤس جانے کا تھا ۔ جب جلوس انارکلی میں چچا جان کے مکان کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ مکان کی بالکونی میں کھڑے ہیں ۔ میرے شانہ بشانہ ایک نوجوان چل رہے تھے جنہوں نے دو ایک مرتبہ مجھ سے پرچم لینے کی ناکام کوشش کی تھی ۔ چچا جان کو دیکھ کر میں نے فوراً پرچم اس نوجوان کو پکڑا دیا اور خود جلوس کے عقب میں چلا گیا تاکہ چچا جان مجھے نہ دیکھ سکیں ۔ نیلے گنبد کے قریب پولیس نے جلوس کو روکنا چاہا اور جب جلوس والے نہ رکے تو پولیس نے گولی چلا دی ایک گولی اس نوجوان کے گھٹنے کے نیچے لگی جس نے میری جگہ پرچم اٹھایا تھا ۔ یہ نوجوان اے ۔ ایم ۔ جان (عطا محمد جان) تھے ۔ لاء کالج کے قریب ان کی قانونی کتب کی دوکان تھی ۔ افسوس کہ وہ بیچارے عمر بھر لنگڑاتے رہے اور میں چچا جان کی نظروں سے بچنے کی وجہ سے لنگڑا ہونے سے بچ گیا

امرتسر میں مظاہرین نے تین انگریزوں کو مار ڈالا ۔ ایک انگریز عورت کو بھی پیٹا گیا ۔ گورنر اوڈوائر نے جنرل ڈائر کو امرتسر میں امن قائم کرنے کے لئے مقرر کیا ۔ اس نے آتے ہی پبلک جلسوں پر پابندی لگا دی ۱۳ / اپریل کو جلیانوالہ باغ میں ایک پبلک جلسہ منعقد

کیا گیا تو جنرل ڈائر نے نہتی پبلک پر فوج سے گولی چلوا کر قتل عام کرایا۔ دوسرے دن چچا جان نے میاں جی کو یہ خط لکھا۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم ۔ آپ کا کارڈ مل گیا ہے ۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ اعجاز کل سیالکوٹ گیا ہے ۔ لاہور کے حالات اس نے مفصل بیان کئے ہوں گے ۔ لاہور میں آج دو روز سے ہڑتال ہے ۔ دکانیں بند ہیں اور شہر میں قبرستان کی خموشی الحمد للہ کہ کوئی امرتسر وغیرہ کی طرح یہاں کوئی ایسا فساد نہیں ہوا میں خدا کے فضل و کرم سے بمعہ اہل و عیال تندرست ہوں ۔ کل ایک مقدمہ کے لیے پٹیالہ جاؤنگا ۔ اتوار کو وہاں سے واپس آجاؤں گا بھائی صاحب کو امید ہے رخصت مل جائے گی اور اگر مل گئی تو امید ہے وہ کل یا پرسوں تک آپ کی خدمت میں پہنچ جائیں گے ۔ باقی خیریت ہے ۔ بچوں کو دعا

والسلام

محمد اقبال لاہور ۱۴ اپریل ۱۹ء

اس خط میں ایک دن قبل میرے سیالکوٹ جانے کا ذکر ہے لیکن سفر میں دقت کی وجہ سے میں جا نہ سکا تھا ۔ خط کے مضمون سے ظاہر ہے کہ اس وقت تک جلیانوالہ باغ کے حادثہ کی اطلاع چچا جان کو نہیں ہوئی تھی ۔ امرتسر میں فساد کا ذکر تو ہے لیکن اس سے مراد وہ گڑ بڑ معلوم ہوتی ہے جو ان دنوں امرتسر میں ہو رہی تھی ۔ خط میں ۱۵ اپریل کو پٹیالہ جانے کے ارادہ کا بھی ذکر ہے لیکن یہ سفر انہیں ملتوی کرنا پڑا تھا ۔ ابا جان نے کچھ دنوں کی رخصت لی تھی اور وہ سیالکوٹ پہنچ گئے۔

ابا جان کے رخصت پر سیالکوٹ پہنچنے کی اطلاع چچا جان کو ۱۵ اپریل کو ملی تو انہیں فوراً یہ خط لکھا

لاہور ۱۵ اپریل ۱۹ء

برادر مکرم السلام علیکم ۔ الحمد للہ آپ مع الخیر سیالکوٹ پہنچ گئے۔ میں نے آپ کو تین چار روز ہوئے خط لکھا تھا جواب نہ آنے سے تردد تھا ۔ ڈاک اور ریل کا نظام درست نہیں۔ اس واسطے خطوط نہیں پہنچے ۔ کل والد مکرم کی خدمت میں کارڈ لکھا تھا امید ہے پہنچا ہو گا لیکن گجرانوالہ میں سنا ہے کہ فساد ہو گیا ہے اور کوئی پل توڑ دیا گیا ہے اس واسطے ممکن ہے کہ ڈاک میں تعویق ہو جائے ۔ مجھے آج ایک مقدمہ کے لئے پٹیالے جانا تھا ۔ ریل کا انتظام مخدوش ہونے کی وجہ سے نہیں جا سکا ۔ کل وہاں تار دے دیا تھا کہ ٹکٹ نہ ملتے تھے ۔ غرضیکہ بڑی گڑبڑ ہے ۔ ہر طرف سے دہشت ناک خبریں آ رہی ہیں ۔ لاہور میں آج چھ روز سے ہڑتال ہے پہلے تو کچھ فساد ہوا اور چند لوگ مارے گئے مگر اب شہر میں بالکل خموشی ہے اور لوگ دکانیں نہیں کھولتے اپنی ضد پر قائم ہیں ۔ غالباً آج یا کل (اگر یہی حالت رہی) تو شہر فوجی قبضے میں دے دیا جائے گا مجھے اب نہیں ہو گا۔ اعجاز کو میں نے پہلے سے منع کر دیا تھا اور کل پیغام بھی بھیجا تھا کہ وہ یہاں آ جائے اور مطالعہ کرے کہ بورڈنگ میں اسے تکلیف ہوتی ہو گی مگر وہ کہتا ہے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ آج میں نے آپ کا خط اس کو دکھانے کو بھیجا ہے ۔ اول تو یہاں آ جائے گا ورنہ سیالکوٹ چلا آئے گا ۔ مگر خدا کے فضل و کرم سے کوئی تردد کی بات نہیں ہے آپ مطمئن رہیں ۔ جب تک پورا اطمینان نہ ہو جائے کہ ریل کا انتظام درست ہے آپ لاہور کی طرف نہ آئیں کیونکہ تکلیف کا احتمال ہے ۔ پرسوں رات امرتسر میں پھر شدید فساد ہوا ہے بہت سے ریلوے اسٹیشنوں کو آگ لگا دی گئی ہے ۔ خدا رحم کرے ۔ میں تو آپ کو خط لکھنے والا تھا کہ ملازمت چھوڑ کر گھر آ جائیے جو کچھ تھوڑا بہت پاس ہے اس پر چل چل کر گزارہ کر لیں گے ۔ پشاور کی تبدیلی کے موقع پر بھی میں نے آپ کو لکھا تھا کہ جہاں آپ ہیں وہیں رہیئے ۔ اس طرف نہ جائیے اس وقت نظام عالم کا مطلع نہایت غبار آلود ہے اور معلوم نہیں کیا واقعات ظہور پذیر ہوں گے ۔ ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین ۔

لاہور میں بالکل خموشی ہے اور کسی قسم کا فساد نہیں ہے مطمئن رہیئے ۔ والد مکرم کی خدمت میں سلام عرض کر دیں ۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۔

جیسا کہ خط میں لکھا ہے چچا جان نے علی بخش کو ریواز ہوسٹل بھیجا تھا کہ وہ مجھے ہوسٹل سے گھر لے آئے لیکن میں نے کہلا بھیجا کہ ہوسٹل میں کوئی خطرہ نہیں۔ دوسرے دن انہوں نے ابا جان کا خط جو ان کے نام تھا مجھے بھیجا جس میں تاکید تھی کہ میں ہوسٹل چھوڑ کر گھر چلا جاؤں۔ لیکن میں پھر بھی ہوسٹل میں ہی رہا کیونکہ وہاں کوئی خطرہ تھا نہ کوئی تکلیف تھی۔ صوبے میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا تھا۔ فوج نے کئی قسم کی پابندیاں عاید کر دی تھیں۔ طالب علموں کو خاص طور پر مارشل لا والے تکالیف میں ڈال رہے تھے۔ بعض کالجوں کے طالب علموں کو روزانہ مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں حاضری دینی ہوتی تھی۔ ہمارے پرنسپل ہنری مارٹن کے رسوخ کی وجہ سے ہمارے کالج کے طلباء ان مشکلات سے بچے رہے۔

اس خط میں چچا جان نے پھر اپنی اس خواہش کا اعادہ کیا کہ ابا جان ملازمت چھوڑ کر گھر آ جائیں۔ اصل میں وہ شروع ہی سے ابا جان کے دوبارہ ملازمت کرنے کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ابا جان اب گھر پہ آرام کریں اور اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ انہیں اٹھانے دیں۔ دوسری طرف ابا جان چچا جان کی افتاد طبیعت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ انہیں روپیہ کمانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اپنی ذمہ داریوں سے مجبور ہو کر بادل ناخواستہ وکالت کا کام کرتے ہیں۔ منشی طاہر دین نے انہیں بتلایا ہوا تھا کہ جینے کی ضرورت کے لئے کافی روپیہ ہاتھ میں آ جائے تو چچا جان وکالت کا مزید کام مشکل سے ہی لیتے ہیں۔ اس طرح منشی جی کی آمدنی بھی متاثر ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ منشی جی نے حکمت کا کام بھی شروع کر دیا ہوا تھا۔ علاوہ اور ادویات کے انہوں نے مغلی پھوڑے جسے لاہور سور بھی کہتے ہیں کے لئے ایک دوائی "دل روز" نام تیار کی ہوئی تھی جو بڑی مقبول ہوئی۔ اس کی فروخت سے منشی جی نے بڑا روپیہ پیدا کیا۔ بیرسٹر صاحب تو کرایہ کی بوسیدہ کوٹھی میں رہتے رہے اور ان کے منشی جی نے فیروز پور روڈ پر حکمت کی کمائی سے ایک کوٹھی تعمیر کی جس کا نام "دل روز ولا" رکھا۔ اندریں حالات ابا جان چچا جان پہ حتے الامکان اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے تھے اور ان کے اصرار کے باوجود جس کا اظہار اس خط میں بھی کیا گیا ہے وہ جب تک ہوسکا ملازمت کرتے رہے۔

رخصت کے ختم ہونے پر ابّا جان اپنی ملازمت پر چلے گئے۔ ملک میں جو حالات تھے اُس کی وجہ سے وہ چچا جان سے ملنے لاہور نہ جا سکے۔ میاں جی کی طبیعت ناساز تھی۔ چچا جان نے یہ خط لکھ کر مزاج پرسی کی۔

لاہور ۳۰ اپریل ۱۹ء

قبلہ وکعبہ ام السلامُ علیکم

خدا کے فضل وکرم سے ہر طرح خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا کارڈ بھی آیا ہے وہاں بھی خدا کا فضل ہے۔ آپ کی طبیعت ناساز تھی اپنی خیریت مزاج سے آگاہ فرمائیں کہ اب کیا کیفیت ہے۔ بچّوں کو دعا۔

والسلام
محمد اقبال لاہور

جواب میں خیریت کی اطلاع دی گئی تو اس خط میں اطمینان کا اظہار کیا۔

قبلہ وکعبہ ام ۔ السلام علیکم

پوسٹ کارڈ مل گیا ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آج ہی ملا ہے۔ وہاں بھی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔ الحمد اللہ کہ اب آپ کا مزاج بالکل ٹھیک ہے۔ موسم بھی غیر معمولی ہے۔ یہاں سب لوگ بفضلہٖ خیریت سے ہیں اور سب کی طرف سے آپ کو آداب عرض ہے۔ بچوں کو دعا

محمد اقبال لاہور ۵ مئی ۱۹ء

۱۱

انگریزی حکومت ہند اور افغانستان کے مابین جنگ چھڑ گئی ۔ آبا جان کی ملازمت جنگی علاقہ میں تھی اس لئے چچا جان کو بڑی تشویش رہتی ۔ خیریت کی اطلاع ملنے میں کبھی دیر ہو جاتی تو گھبرا کر تار دیتے ۔ خیریت کی اطلاع ملتی تو میاں جی کو بھی مطلع کرتے ۔ میرا بی ۔ اے کا امتحان شروع ہو گیا ۔ انگریزی کا پہلا پرچہ اچھا ہو گیا تو اس خط سے میاں جی کو اس کی اطلاع دی

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

بھائی صاحب کے دو خط سات اور آٹھ تاریخ کے لکھے ہوئے مل گئے ہیں ۔ میں نے آج صبح ان کو تار دیا تھا مگر تار دینے کے بعد ہی یہ خطوط مل گئے ۔ الحمد اللہ کہ وہ بہمہ نوع خیریت سے ہیں تردد رفع ہو گیا ہے امید ہے کہ آپ کو بھی ان کی خیریت کا خط مل گیا ہو گا ۔ چونکہ سرکار انگریزی کی جنگ افغانستان سے شروع ہو گئی ہے اس واسطے خطوط کے ملنے میں دیر ہوئی امید ہے کہ اس صورت حال کا خاتمہ جلد ہو جائے گا ۔ پھر اس قسم کی تعویق نہ ہو گی ۔ میں نے تو انکو لکھا تھا کہ گرما کے مہینوں کے لئے رخصت لے لیویں مگر اب بوجہ جنگ چونکہ ان کا کام زیادہ ہو جائے گا اس واسطے ان کو رخصت نہ مل سکے گی ۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے اپنی خیریت سے مطلع کریں ۔ اعجاز کا پہلا پرچہ آج ہو گیا ہے ۔ اور اس نے یہ پرچہ اچھا کر لیا ہے ۔

والسلام محمد اقبال لاہور ۱۲ مئی ۱۹ء

دو دن بعد پھر میاں جی کو میری انگریزی کے دونوں پرچے اچھے ہو جانے کی اطلاع اس خط میں دی ۔

قبلہ و کعبہ ام   السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا تھا۔ خدا کے فضل و کرم سے سب طرح خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا تار بھی آیا ہے۔ یہ تار انہوں نے معلوم ہوتا ہے از خود دیا ہے۔ میرے تار کا جواب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ میں نے بھی انکوتار دیا تھا۔ بہر حال خدا کے فضل و کرم سے وہاں پر سب طرح خیریت ہے۔ امید ہے کہ اس جنگ کا جلد خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ سرکار انگریزی کی قوت کے مقابلے میں افغان کچھ نہیں کر سکتے۔ دیگر خیریت ہے۔ اعجاز کا انگریزی کا امتحان ہو گیا ہے۔ اب تاریخ کا امتحان ہے۔ اس کے بعد اُس کو آٹھ روز کی فرصت ہو گی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ یہاں آ جائے مگر وہ بورڈنگ میں رہنا پسند کرتا ہے۔ وہاں بھی بورڈنگ ہر طرح محفوظ ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ امید ہے کہ غلام نبی کا خط بھی آ گیا ہو گیا۔ والسلام بچوں کو دعا

محمد اقبال لاہور ۲۴ مئی ۱۹ء

شیخ غلام نبی جن کا اس خط میں ذکر ہے میرے ماموں تھے۔ وہ بھی ملٹری ورکس میں سب ڈویژنل افسر تھے اور اُن کی تعیناتی بھی سرحد کے علاقہ میں تھی۔

۱۴

دوسرے دن پھر میاں جی کو میرے پرچے اچھے ہونے کی اور ابا جان کی خیریت کی اطلاع اس خط میں دی:

قبلہ و کعبہ اُم السلام علیکم

آج آپ کا کارڈ مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ سب طرف خیریت ہے۔ اعجاز امتحان دے رہا ہے۔ اس کے پرچوں کے متعلق پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس وقت تک اس نے کام اچھا کیا ہے امید ہے کہ آپ کی دعا برکت سے کامیاب ہو جائے گا۔ بھائی صاحب کا تار آیا تھا خیریت سے ہیں۔ آج ان کو بھی خط لکھا ہے۔ باقی خدا کا فضل ہے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ انصاف نہ کرے۔ کیونکہ ہم اس کے انصاف کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ البتہ وہ ہم پہ اپنا فضل و رحم کرے

بچوں کو دعا   والسلام

محمد اقبال ۱۰ مئی ۱۹ء لاہور

اس خط کے آخری فقروں کا پس منظر یہ ہے کہ پھوپھی کریم بی بی کی جو میاں جی کے خطوط لکھا کرتی تھیں اپنے کسی عزیز سے کچھ اَن بن ہوگئی تھی۔ پھوپھی جی کے خیال میں اُس تنازعہ میں زیادتی اُس عزیز کی طرف سے ہوئی۔ انہوں نے میاں جی کے خط میں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی طرف سے لکھا کہ اللہ تعالےٰ منصف ہے وہ انصاف کرے گا۔ اس کے جواب میں چچا جان نے لکھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے انصاف طلب نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ہم اس کے انصاف کے متحمل نہیں ہوسکتے البتہ ہمیں اس کے فضل و رحم کی استدعا کرنا چاہیئے۔

ابا جان دوسرے تیسرے دن تار کے ذریعہ چچا جان کو اپنی خیریت سے مطلع کرتے تو میاں جی کی تشویش دور کرنے کے لئے وہ انہیں خیریت کا تار ملنے کی اطلاع دیتے۔ میرے امتحان کے متعلق بھی لکھتے کہ پرچے کیسے ہورہے ہیں۔ ۱۹ مئی کو یہ خط لکھا۔

قبلہ و کعبہ ام۔ السلامُ علیکم

خدا کے فضل و کرم سے ہر طرح خیریت ہے۔ آپ کا کارڈ مل گیا ہے۔ بھائی صاحب کا تار بھی پرسوں آیا تھا۔ وہ بھی خیریت سے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کی دعا سے اعجاز امتحان میں کامیاب ہو جائے گا۔ آیہ کریمہ کا ورد شروع ہے۔ ہمشیرہ بھی چند گھنٹوں کے لئے لاہور ٹھہری تھی۔   والسلام

محمد اقبال لاہور ۱۹ مئی ۱۹ء

اس خط میں امتحان میں میرے کامیاب ہونے کی امید کا ذکر کرکے لکھا ہے "آیہ کریمہ کا ورد شروع ہے"۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ شاید وہ آیہ کریمہ کا ورد میری کامیابی کے لئے کررہے تھے۔ لیکن امتحان میں میری کامیابی ایسا اہم معاملہ تو نہ تھا جس

کے لئے وہ آیۂ کریمہ کا ورد کرتے۔ ممکن ہے کوئی اور امر درپیش ہو لیکن مجھے یاد نہیں کہ ان دنوں کوئی ایسا امر درپیش تھا جس کے لئے وہ آیۂ کریمہ کا ورد کرتے میاں جی حلِ مشکلات کے لئے آیۂ کریمہ کے ورد کی تاکید کیا کرتے تھے۔

۱۵ تا ۱۷

پچھلے خط کے بعد ان تین خطوط میں صرف اپنی اور آبا جی کی خیریت کی اطلاع دی ہے۔ موخرالذکر خط کی تاریخ غلطی سے ۷ مئی لکھی گئی۔ یہ خط دراصل ۷ جون ۱۹۱۹ء کا ہے جیساکہ ڈاکخانہ کی مُہر سے ظاہر ہے اس خط میں جس ظفر کا ذکر ہے وہ ہماری پھوپھی کریم بی بی کے سب سے بڑے بیٹے ظفرالحق ہیں جنہوں نے اس سال انٹرنس کا امتحان پاس کیا تھا۔ کوئٹہ میں اُن کے والد ملازم تھے۔ موضع نت ضلع گوجرانوالہ میں ان کا ددھیال تھا۔

قبلہ و کعبہ ام ۔ السلام علیکم

خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا ہے ۔ وہ بھی خیریت سے ہیں۔ اپنی خیریت سے آگاہ فرمائیے۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۲۴ مئی ۱۹ء

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

کارڈ مل گیا ہے الحمدللہ کہ گھر میں سب طرح خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا تھا۔ وہاں بھی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ بچوں کو دعا

والسلام

محمد اقبال لاہور ۲۹ مئی ۱۹ء

قبلہ وکعبہ اُم اسلام علیکم

کارڈ مل گیا الحمداللہ کہ گھر میں ہر طرح خیریت ہے۔ بھائی صاحب کے کل دد خطوط آئے تھے وہاں بھی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔ ظفر کوئٹہ سے آیا ہوا ہے۔ امتحان میں پاس ہو گیا ہے۔ آئندہ کالج کی فکر کر رہا ہے کل یہاں سے روانہ ہو کر نت جائے گا۔ باقی خیریت ہے۔ بچّوں کو دعا

محمدؐ اقبال لاہور ۷ مئی ۱۹ء اصل میں جون ہے

اعجاز کا خط بھی مل گیا تھا۔

۱۸

پچھلے خط سے دو دن بعد پھر میاں جی کو یہ خط لکھا

لاہور ۹ جون ۱۹ء

قبلہ وکعبہ ام اسلام علیکم

آپ کا کارڈ ابھی ملا الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ یہاں بھی خدا کے فضل سے خیریت ہے میں امتحان کے پرچوں میں مصروف رہا اور اب تک ہوں اس واسطے خط لکھنے میں توقف ہوا انشاء اللہ جون کے آخر سب کاموں سے فراغت ہو جائے گی تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ امید ہے جون کے آخر پرچے بھی ختم ہو جائیں گے اور ریل کے سفر کی مشکلات بھی کم ہو جائیں گی۔ ظفر چلا گیا ہے میں نے اس کو یہی مشورہ دیا تھا کہ کتابیں ابھی نہ خرید کرے۔ پہلے نت جائے گا۔ وہاں سے سیالکوٹ آئے گا۔ اس کا ارادہ ہے کہ لاہور اسلامیہ کالج میں داخل ہو ابھی دو ماہ باقی ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ اُمید ہے آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

والسلام

محمدؐ اقبال لاہور ۹ جون ۱۹ء

معلوم ہوتا ہے میاں جی نے اُنہیں سیالکوٹ آنے کے لئے لکھا ہوگا جس کے جواب میں جون کے آخر میں امتحان کے پرچوں سے فارغ ہوکر آنے کا لکھا ہے۔ معلوم نہیں خط لکھنے میں توقف کی معذرت کیوں کی ہے کیونکہ دو ہی دن پہلے ۲ جون کو خط لکھ چکے تھے شاید وہ خط یاد نہ رہا ہو۔

۱۹

میں بی۔ اے کے امتحان سے فارغ ہوکر سیالکوٹ چلا گیا تھا۔ کامیابی کی صورت میں میری خواہش ایم اے میں داخل ہونے کی تھی۔ حکومتِ ہند کی حکومتِ افغانستان کے ساتھ صلح کی بات چیت چل رہی تھی اور توقع تھی کہ ۱۹ء کے خاتمہ تک جنگ بھی ختم ہو جائے گی اور اباجی کی ملازمت بھی۔ میں چاہتا تھا کہ ایم اے میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ کہیں ملازمت بھی کر لوں تاکہ تعلیمی اخراجات کا بوجھ کسی پر نہ پڑے۔ میرا خیال تھا کہ چچا جان کی وساطت سے شاید پنجاب یونیورسٹی کے دفتر میں ملازمت کی صورت نکل سکے۔ چنانچہ میں نے اس کے متعلق اُن کو خط لکھا جس کے جواب میں ان کا یہ خط آیا۔

یہ خط انہوں نے خلاف معمول انگریزی میں لکھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ایم اے کے تعلیمی اخراجات کے لئے تعلیم کے ساتھ ساتھ ملازمت کرنے کی میری تجویز انہیں پسند نہیں آئی تھی۔ اس تجویز کا مطلب غالباً یہ سمجھا گیا کہ تعلیمی اخراجات کے لئے ان سے مالی امداد ملنے کا مجھے یقین نہیں۔ شاید تجویز کے ناپسند ہونے کے اظہار کی شدّت کو کم کرنے کے لئے انگریزی زبان استعمال کی گئی ہو۔ ۲۱ء کے ابتداء میں بھی میری ایک احمقانہ تجویز کو انہوں نے انگریزی میں جواب دے کر نامنظور کیا تھا۔ خیر اس کا ذکر بعد کے صفحات میں آئے گا۔

Lahore,
11th June, 1919.

My dear Ijaz,

Your letter. You need not bother about service yet. Let us wait till the results are out. The University Office may give you a clerkship carrying Rs. 50/- a month; but in that case you cannot, as a clerk appear at the M.A. Exam. If you secure an Asst. Professorship of History it will be much better. I am not quite sure whether History is a paying subject. Economics may be more paying than History. But this point will be considered when the results are out. After you have passed your M.A. I may try and get something for you in the Government of India. In case you do not get any job I shall, somehow or other manage to provide your expenses for the M.A.

Yours affectionately,

(MUHAMMAD IQBAL)

میں نے اُن کے خط کا جواب نہ دیا۔ اور کوئی جواب طلب بات اُس میں تھی بھی نہیں۔ میاں جی کی طرف سے بھی اُن کے خط محررہ ۹ جون کا جواب نہ گیا تو میاں جی کے نام اُن کا یہ خط آیا۔

قبلہ و کعبہ ام ۔ السلام علیکم

کئی دن ہوئے خط لکھا تھا امید ہے پونہچکر ملاحظہ عالی سے گزرا ہوگا۔ اعجاز کے نام بھی خط لکھا تھا۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ یہاں پر خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ آپ اپنی خیریت مزاج سے آگاہ کریں۔ بھائی صاحب کے خطوط بھی آتے جاتے ہیں وہ بھی بفضلہ خیریت سے ہیں۔ گرمی کا سخت زور ہے۔ بارش کے کوئی آثار نہیں ایسے زور سے لاہور میں آج تک گرمی نہیں ہوئی۔ باقی خیریت ہے۔ بچوں کو دعا۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۱۷ جون ۱۹۱۹ء

میاں جی کے نام ۹ جون ۱۹۱۹ء کے خط میں چچا جان نے جون کے آخر میں سیالکوٹ آنے کے ارادے کا اظہار کیا تھا لیکن اِس ارادے کی تکمیل کی راہ میں کئی رکاوٹیں حائل ہو رہی تھیں۔ اُن کا تفصیلی ذکر میاں جی کے نام اس خط میں کیا۔

لاہور ۲۰ جون ۱۹۱۹ء

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

آپ کا پوسٹ کارڈ ابھی ملا ہے۔ الحمد اللہ کہ گھر میں سب طرح خیریت ہے۔

بھائی صاحب کا خط بھی آیا تھا۔ وہ بھی خیریت سے ہیں۔ اب تو صلح کے انتظام ہو رہے ہیں امید ہے سفر کی مشکلات کا جلد خاتمہ ہو جائے گا۔ چند روز تک شاید مزید گاڑیاں کھل جائیں۔ پھر موٹر کی ضرورت نہ رہے گی۔ بھائی کرم الٰہی کے موٹر اگر منگوائے گئے تو ان کو کرایہ کا بہت نقصان ہو گا۔ ذوالفقار علی خان کا موٹر موجود ہے مگر چونکہ پرانا ہو گیا ہے اس واسطے لمبے سفر کے قابل نہیں رہا لہٰذا میں انتظار میں ہوں کہ شاید ریل گاڑی کی ہی سہولت ہو جائے۔ اس کے علاوہ مختار لدھیانے گئی ہے آٹھ دس روز میں آئے گی۔ اس کا انتظار بھی کرنا ہو گا دونوں ملازم بھی اپنے اپنے گاؤں جانا چاہتے ہیں۔ پیچھے مکان کی حفاظت کے لئے ایک آدمی کا رہنا ضروری ہے۔ اس کے لئے بھی علی بخش نے ہشیار پور خط لکھا ہے اس کا بھی انتظار ہے نوکر تو لاہور سے بھی شاید مل جاتا مگر ایسا آدمی پیچھے چھوڑنے کی ضرورت ہے جو قابل اعتبار ہو جہاں ایک دفعہ گھر بن جائے وہاں سے اُٹھنے کے لئے سو انتظام کی ضرورت ہوتی ہے پھر ماہ جولائی کے مقدمات کا بھی انتظام کرنا ہے۔ وہ بھی کسی کے سپرد ہو جائیں تو یہاں سے مل سکوں۔ یہ بھی خیال ہے کہ جولائی کے مہینے میں تو میں نے چھٹی کر لی آگے دو ماہ کے لئے کچہری چھٹی کر دے گی گویا تین ماہ بیکاری کے ہوں گے خیر اللہ مالک ہے۔ میں مناسب موقع پر آپ کی خدمت میں لکھوں گا کہ کب حاضر ہوں گا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہیں۔ بچوں کو دعا

محمد اقبال لاہور

اصل میں چچا جان سفر سے جی چُراتے تھے۔ اور مستورات کے ساتھ ریل کے سفر سے تو اُن کی جان جاتی تھی۔ مستورات کا ساتھ ہو تو جب تک ریل کا ڈبہ ریزرو نہ ہو سکے سفر نہ کرتے تھے۔ جن ایام کا ذکر ہے اُن دنوں کئی وجوہات کے باعث سفر میں بڑی مشکلات تھیں۔ کچھ پرمٹ ورمٹ کا جھنجھٹ بھی تھا۔ میاں جی نے لکھوایا تھا کہ اگر ریل کے سفر میں دشواری ہے تو سفر کے لئے پھوپھا کرم الٰہی کا موٹر بھجوا دیا جائے۔ یہ ہمارے سب سے بڑے پھوپھا تھے۔ ان کے بڑے بیٹے بھائی فضل الٰہی سے میری بڑی ہمشیرہ آپا اکبری بیاہی ہوئی تھیں۔ پھوپھا جی کا کاروبار کوئٹہ میں تھا۔ پہلے سپورٹس کے سامان کی دکان تھی۔ پھر موٹروں کی مرمت کے لئے گیراج بھی کھول لیا۔ پھر موٹر کے پرزوں اور موٹروں کی خرید و فروخت بھی کرنے لگے۔ اس

کاروبار نے بڑی ترقی کی۔ بڑا روپیہ کمایا۔ سیالکوٹ چھاؤنی میں بھی ایک برانچ کھول لی۔ دو تین موٹر کاریں بھی ان کی اپنی تھیں جو کرایہ پر دی جاتی تھیں۔

اس خط میں نواب ذوالفقار علی خاں کے موٹر کا بھی ذکر ہے یہ وہی موٹر تھا جو بقول سردار جگندر سنگھ کبھی "مانند برق تیز مثال صبا خموش" تھا معلوم ہوتا ہے یہ قصہ تھا جب کا کہ موٹر جوان تھا۔ اب بوجہ پیرانہ سالی "پاشکستہ" ہو کر لمبے سفر کے قابل نہ رہا تھا۔

مختار حسن کے لدھیانے سے آٹھ دس روز میں آنے کا خط میں ذکر ہے ہماری "لدھیانے والی چچی" مختار بیگم تھیں۔ ان کا میکہ لدھیانے میں تھا۔

۲۲

پچھلا خط لکھنے کے دوسرے دن سیالکوٹ کے ایک صاحب مستری نور دین جو اپنے کسی مقدمہ کے سلسلہ میں لاہور گئے ہوئے تھے۔ چچا جان سے ملے اور انہیں بتلایا کہ وزیر آباد سے لاہور تک سفر کے لئے پرمٹ لینا پڑتا ہے اور پھر بھی گاڑی میں جگہ کا مل جانا یقینی نہیں ہوتا۔ چونکہ انہیں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں ۲۴ جولائی کو پٹیالے جانا تھا اس لئے فوراً مجھے یہ خط لکھا

لاہور ۲۶ جون ۱۹۳۸ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

آج صبح مستری نور دین سیالکوٹ سے آیا تھا وہ کہتا تھا کہ سیالکوٹ سے وزیر آباد تک تو کوئی دقت سفر کی نہیں ہے مگر وزیر آباد سے لاہور تک آنے میں بہت دقت ہے۔ وہاں سے پرمٹ لینا چاہیئے اور پرمٹ ملنے پر بھی یقینی نہیں کہ گاڑی میں جگہ مل جائے۔ اس معاملے کی تحقیق کر کے مجھے جلد خط لکھو۔ کیونکہ ۲۴ جولائی کو مجھے پٹیالہ جانے کے لئے سیالکوٹ سے واپس آنا ہوگا۔ اگر واپس آنے میں دقت ہو تو پھر میں سب کام کر کے آؤں کہ دو ماہ تک پھر واپس آنا نہ پڑے۔ والد مکرم کی خیریت میں آداب۔ بچوں کو پیار

محمد اقبال

میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مین لائن پر ریل گاڑیوں میں بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ فوجی نقل و حرکت کی وجہ سے گاڑیوں کے نظام اوقات غیر یقینی ہیں۔ پرمٹ ہو تو ٹکٹ تو مل جاتا ہے لیکن گاڑی میں جگہ کا ملنا یقینی نہیں ہوتا۔ میں نے صورتِ حال سے مطلع کیا اور لکھا کہ وہ ٹپیالے والا کام نمٹا کر ہی آئیں۔ پھوپھا کرم الٰہی مُصر تھے کہ اگر ریل کے سفر میں دقت ہو تو اُن کا موٹر استعمال کیا جائے اور اُن کے نقصان کی فکر نہ کی جائے۔ میں نے اس کے متعلق بھی انہیں مطلع کر دیا۔ جواب میں یہ خط آیا۔ خط میں انہوں نے "سردیوں میں اپنا موٹر خریدنے" کا ذکر تو کیا ہے لیکن یہ ارادہ کہیں ۵ سال بعد ۲۴ء میں پورا ہوا جب انہوں نے ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر خریدا۔

لاہور ۸ ر جولائی ۱۹ء

برخوردار اعجاز کو بعد دعائے عمر درازی کے واضح ہو تمہارا خط مل گیا تھا۔ طاہر دین پھر پشاور گیا ہے کل امید ہے واپس آ جائے گا۔ تمہارے ابّا کا خط بھی آج آیا تھا۔ وہاں ہر طرح خیریت ہے۔ طاہر دین بھی زبانی پیغام خیریت کا لے آئے گا۔ اس سے پیشتر بھی طاہر دین گیا تھا۔ اس کے متعلق پہلے لکھ چکا ہوں۔

میں انشاءاللہ ۲۹ جولائی کو یہاں سے سیالکوٹ آنے کا قصد رکھتا ہوں اگر ریل کے سفر کی حالت بدستور رہی تو موٹر کے لئے تم کو "تار" دوں گا یا خط لکھ دوں گا۔ لیکن یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ آیا موٹر میں اتنے آدمیوں کے لئے جگہ ہوگی پھر کچھ تھوڑا بہت اسباب بھی ہوگا معلوم نہیں بھائی کرم الٰہی کے موٹر میں کتنے آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ تین آدمی تو ہم ہوں گے۔ دو نوکر یعنی کھانا پکانے والی عورت اور اس کی لڑکی۔ ان سب کے علاوہ تم اور موٹر ہانکنے والا۔ کل سات آدمی ہوئے۔ دو تین ٹرنک اسباب بھی ہوگا۔ غرضیکہ تم یہ سب امور پہلے دیکھ کر مجھے مطلع کرو کہ آیا اس موٹر میں اس قدر وسعت ہے۔ اگر ہو تو جب میں لکھوں تم موٹر لے کر

آجانا۔ یہاں سے سیالکوٹ تک گجرانوالہ کے رستے صرف تین چار گھنٹے کا سفر ہے صبح پانچ بجے چل کر ۸ یا ۹ بجے سیالکوٹ پہنچ سکتے ہیں۔ پٹرول وہیں سے خرید لینا قیمت ادا کر دی جائے گی کیونکہ ممکن ہے یہاں سے نہ ملے یا گراں ملے۔

میں نے آج نواب صاحب کو بھی شملہ خط لکھا ہے کہ ان کا موٹر مرمت ہو کر سفر کے قابل ہوا یا نہیں۔ امید نہیں کہ ہوا ہو کیونکہ یہاں پر ان کے آدمیوں سے آج کل کوئی نہیں ہے۔ مذکورہ بالا امور کے متعلق مجھے جلد آگاہی دو۔ انشاءاللہ سردیوں میں شاید میں اپنا موٹر خرید لوں گا۔

باقی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔ والدمکرم کی خدمت میں میری طرف سے اداب کہیں۔ تم اپنے نتیجہ امتحان کی طرف سے مطمئن رہو۔ انشاءاللہ ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ اب یہ سوچنا چاہیئے کہ ایم اے میں کون سا مضمون لوگے۔ باقی خیریت ہے۔ وسیمہ کو پیار

محمد اقبال۔ لاہور

جولائی ۱۹۳۱ء کے دوسرے ہفتے میں مجھے ایک دوست کی برات کے ساتھ لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو میں چچا جان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ پھوپھا جی کی کار کے متعلق میں نے بتلا دیا کہ موٹر بڑا ہے۔ اس میں سب کے لئے گنجائش نکل آئے گی چنانچہ چچا جان نے سفر کے لئے ۲۹ جولائی مقرر کی اور کہا کہ وہ مجھے بذریعہ تار کار لانے کو کہیں تو میں کار لے کر لاہور آجاؤں۔ اس پروگرام سے انہوں نے میاں جی کو بھی اس خط کے ذریعہ مطلع کیا۔

قبلہ وکعبہ ام السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا ہے۔ وہاں بھی خدا کا فضل ہے۔ یہ خدا تعالیٰ نے اچھا سبب بنا دیا ہے۔ بھائی صاحب کی خیر خیریت ہر دوسرے تیسرے روز مل جاتی ہیں۔ یا تو کوئی آدمی وہاں سے آجاتا ہے یا دستی خط آجاتا

ہے ۔غرضیکہ یہ خدا کا خاص فضل ہے ۔ اعجاز برات پر آیا تھا اور مجھ سے بھی ملا تھا۔ اب وہ گھر پہنچ گیا ہے ۔ امید ہے آپ کو اس نے سب حالات بتا دیئے ہوں گے۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ آپ کی زندگی میں یہ خوشی نصیب ہوئی۔ بارش کل تھوڑی سی ہوئی تھی مگر آج گرمی بدستور ہے ۔ انشاء اللہ میں ۲۹ جولائی کو حاضر ہونے کا قصد رکھتا ہوں۔ موٹر منگوا لیا جائے گا۔ گھر کے سب آدمی اس میں آجائیں گے ۔ ذوالفقار علی خاں کا موٹر مرمت ہو رہا ہے اور امید نہیں کہ اس کی مرمت آخر جولائی تک مکمل ہو۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے ۔ بچوں کو دعا

محمد اقبال لاہور ۱۰ جولائی ۱۹۲۰ء

چچا جان نے یونیورسٹی کے دفتر سے میرے بی۔ اے کے امتحان کے نتیجہ کا پتہ کرا لیا تھا۔ اور مجھے میری کامیابی کی اطلاع دے دی تھی ۔ چونکہ ابھی نتیجہ یونیورسٹی کی طرف سے مشتہر نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے مجھے تاکید کر دی تھی کہ سوائے گھر کے لوگوں کے اور کسی سے اس کا ذکر نہ کیا جائے ۔ خط میں لکھا ہے کہ امید ہے اعجاز نے آپ کو سب حالات بتا دیئے ہوں گے ۔ "سب حالات" سے مراد امتحان میں میری کامیابی کی خبر تھی اور یہی مراد اس فقرہ سے تھی "یہ خدا کا فضل ہے کہ آپ کی زندگی میں یہ خوشی نصیب ہوئی ۔"

جس دن موخر الذکر خط لکھا گیا اُسی شام بی اے کا نتیجہ مشتہر ہو گیا۔ اس پر دوسرے دن میاں جی کو امتحان کے نتیجے کی اطلاع اس خط میں دی جس میں مشورہ دیا کہ مجھے اب لا کالج میں داخلہ لینا چاہیئے ۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

اعجاز کے امتحان کا نتیجہ کل شام نکل گیا ۔ پاس ہو گیا ہے آپ کو اور بھاوجہ صاحبہ کو مبارک ہو۔ اب اس کو یہ سوچنا چاہیئے کہ ایم اے میں داخل ہو یا قانون کے امتحان ایل ایل بی میں داخل ہو ۔ دونوں امتحانوں کے لئے دو سال ہیں ۔ ایل ایل بی کا امتحان پاس کرنے میں

بھی بہت سے فوائد ہیں۔ بھائی صاحب کی خدمت میں بھی میں نے یہی لکھا ہے اعجاز کو بھی اپنی قابلیت کا جائزہ لینا چاہیئے۔ وکیل کا کام اگر بہت نہ بھی چلے تو دو ڈھائی سو روپیہ ماہوار کما لیتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ پہلے چند سال محنت کرنی پڑتی ہے اور انتظار کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اس پر غور کرنے کے بعد مجھے بھی لکھے کہ اس کی طبیعت کا میلان کدھر ہے۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۱۹ر جولائی ۱۹

۲۶

پچھلے خط میں ارشاد تھا کہ میں آئندہ تعلیم کے متعلق اپنی طبیعت کے میلان سے انہیں مطلع کروں۔ چونکہ میری طبیعت ایم اے میں داخلہ لینے کی طرف راغب تھی اس لئے میں نے فی الفور جواب نہ دیا۔ اس پر انہوں نے میاں جی کے نام یہ خط لکھا۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ یہاں پر بھی خدا کے فضل سے ہر طرح خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا تھا وہ بھی خیریت سے ہیں۔ اعجاز کے متعلق جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے اور میرے باقی دوستوں نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا ہے اگر اس نے محنت کر کے یہ امتحان پاس کر لیا تو مجھے یقین ہے آئندہ زندگی میں بہت فائدہ اٹھائے گا۔ اگر پریکٹس نہ بھی کرے تو ملازمت کے حصول میں آسانی ہوگی۔ بھائی صاحب کا خط ابھی اس بارے میں نہیں آیا اور نہ یہ معلوم ہوا ہے کہ اعجاز کی رائے کیا ہے۔

بارش یہاں پر بھی ہوئی ہے۔ ہوا کا سوز کم ہو گیا ہے اور وہ تپش نہیں رہی۔ مگر بارش کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔ مطلع ابر آلود ہے امید ہے کہ اور بھی برسے گا۔ پشاور میں بھی ابھی کچھ بہت بارش نہیں ہوئی۔ بھائی صاحب کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ تھوڑی سی بارش ہو گئی ہے۔ باقی خیریت ہے۔ والسلام محمد اقبال لاہور ۳۰ر جولائی ۱۹ء

۲۷

جس مقدمہ کی پیروی کے لئے چچا جان پٹیالہ گئے تھے اس میں کامیاب ہو کر وہ
۲۶ر جولائی کو لاہور واپس آ گئے اور اُسی دن میاں جی کو یہ خط لکھا جس میں یہ بھی ارشاد
ہوا کہ اُن کا تار ملنے پر میں ۳۰ر جولائی کو موٹر لاہور لے آؤں۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

پٹیالہ کے مقدمہ سے فارغ ہو کر میں آج صبح واپس آ گیا ہوں۔ مقدمہ میں بھی کامیابی
ہوئی۔ یہ وہاں کے ایک پیرزادہ خاندان کا مقدمہ تھا جو تمام ریاست میں مشہور تھا۔
اب ۲۸ر جولائی کو لاہور میں ایک مقدمہ ہے۔ اس سے فارغ ہو کر انشاءاللہ ۳۰ر جولائی
کو حاضر خدمت ہونے کا قصد ہے۔ اعجاز ۳۰ کو یہاں موٹر لے آئے۔ مگر میں تار بھی دوں
گا۔ میرا تار ملنے پر موٹر لائے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۲۶ر جولائی سنہ ۱۹ء

۳۰ر جولائی کو موٹر لاہور لانے کے لئے ان کا تار نہ ملا۔ معلوم ہوتا ہے وہ ریل
کا ڈبہ ریزرو کرانے کی کوشش میں تھے اور ۲ر اگست کی رات کی ایک پسنجر ٹرین سے
ریزرویشن ہو بھی گئی۔ چنانچہ ۲ر اگست کو مجھے تار کے ذریعہ اس امر سے مطلع کیا اور موٹر
لانے سے منع کر دیا۔ جس ٹرین سے ریزرویشن ہوئی وہ وزیر آباد جنکشن پر صبح ۴ یا ۵
بجے پہنچتی تھی۔ جہاں سے سیالکوٹ جانے کے لئے گاڑی بدلنا ہوتی تھی۔ اُن دنوں اس
گاڑی کے لئے وزیر آباد اسٹیشن پر چند گھنٹے انتظار کرنا ہوتا تھا۔ گھر میں طے پایا کہ میں

پھوپھا جی کا موٹر لے کر ۲۲ اگست کی شام کو وزیرآباد چلا جاؤں اور ۲۳ اگست کی صبح کو چچا جان کے قافلہ کو موٹر میں سیالکوٹ لے آؤں۔ اس فیصلے کے مطابق میں اور میرا خالہ زاد بھائی فیض مرحوم جو موٹر چلانا جانتا تھا وزیرآباد پہنچ گئے۔ وزیرآباد جاتے ہیں تو موسم اچھا بھلا تھا لیکن رات کو بارش شروع ہو گئی۔ برسات کا موسم تو تھا ہی بادل ایسا ٹوٹ کے برسا کہ جل تھل ہو گیا۔ رات پلیٹ فارم پر بڑی خواری میں کٹی۔ ٹرین آئی تو دُرِ مقصود غائب۔ جب اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ لاہور سے آنے والا قافلہ کسی وجہ سے اس ٹرین میں سوار نہیں ہو سکا تو واپس سیالکوٹ کا رُخ کیا۔ اُس وقت تک بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ وزیرآباد سے سیالکوٹ جائیں تو راستے میں پہلا بڑا قصبہ "سودھرا" پڑتا ہے۔ اُن دنوں اُس کے قریب ایک برساتی نالہ تھا جو عام طور پر تو خشک رہتا تھا لیکن زیادہ بارش ہو تو اُس کا پانی پختہ سڑک پر آجاتا تھا۔ جس کے گزرنے کے لئے پختہ سڑک میں ایک گیپ (Gap) بنا ہوا تھا۔ ہم اُس کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ برساتی نالے کے پانی سے جو سڑک کے گیپ سے گزر رہا تھا راستہ مسدود تھا۔ رات کی کوفت کی وجہ سے فیض کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ "بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے" پر عمل کرتے ہوئے اپنے آہنی گھوڑے کو نالے کے بہتے پانی میں دوڑا دیا۔ اُس وقت پانی کافی گہرا تھا۔ موٹر نے نالے کو پار تو کر لیا لیکن اس کے بعد زمیں جُنبد نہ جنبد گل محمد۔ فیض نے سب جتن کر دیکھے۔ سودھرے سے کرایہ پر آدمی لاکر دھکم دھکیل بھی کرائی لیکن "یا حفیظ" کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہوا "جب متوقع وقت تک ہم سیالکوٹ نہ پہنچے تو سمجھ لیا گیا کہ ہم پر کوئی اُفتاد پڑی ہے۔ چونکہ خیال تھا کہ لاہور کا قافلہ بھی ساتھ ہے۔ اس لئے وہاں سے دو موٹروں میں ایک ریلیف پارٹی روانہ کی گئی جس میں میرے دو پھوپھی زاد بھائی فضل الٰہی مرحوم اور فضل حق مرحوم۔ میرا منجھلا بھائی امتیاز مرحوم جو ایک ماہر مکینک تھا شامل تھے۔ انہوں نے سودھرے کے قریب ہمیں سڑک پر رُکا ہوا پایا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ موٹر کے انجن میں پانی پہنچ جانے کی وجہ سے نُقص ہو گیا ہے اور بغیر مرمت اسٹارٹ نہیں ہو گا۔ چنانچہ سودھرے سے مضبوط رسّے خرید کر لائے گئے اور خراب

شدہ موٹر کو دوسرے موٹر کے پیچھے رسّوں سے باندھا گیا اور ہم لوگ سیالکوٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ اتنے میں بارش پھر تیز ہوگئی۔ چونکہ جو موٹر خراب شدہ موٹر کو کھینچ کر لے جا رہا تھا۔ اُس کو تیز چلانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے ہم لوگ بارش میں بھیگتے خراماں خراماں شام تک گھر پہنچے۔ اس وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ چچا جان کا قافلہ لاہور سے کیوں روانہ نہ ہو سکا تھا۔ اس کی وجہ میرے نام اِس خط کے آنے سے معلوم ہوئی۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

کل میں نے تمہیں تار دیا تھا کہ موٹر نہ لاؤ وجہ یہ تھی کہ بڑی سعی سفارش سے گاڑی سیالکوٹ تک ریزرو کرائی تھی مگر عین وقت پر جب کہ ہم لوگ سٹیشن پر جا چکے تھے۔ ریل والوں نے جواب دے دیا کہ گاڑی بوجہ ملٹری افسروں کے آجانے کے نہیں دی جا سکتی چنانچہ رات کے ایک بجے میں مع عیال سٹیشن سے واپس آیا اور اس قدر روحانی اور جسمانی تکلیف ہوئی کہ بیان میں نہیں آسکتی۔ یہ تکلیف اس قدر ہمت شکن ہے کہ اب ریلوے سفر کی دوبارہ ہمت مجھ میں باقی نہیں ہے۔ جب بارش تھم جائے اور سڑک وغیرہ ٹھیک ہو جائے تو موٹر لے آنا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ والدہ مکرم کی خدمت میں آداب عرض کرنا۔ بچوں کو دعا۔

محمد اقبال لاہور ۳ اگست ۱۹ ء

ہم پہ جو گزری میں نے اُس کی تفصیل لکھ بھیجی آئندہ تعلیم کے متعلق میں نے لکھا کہ میری طبیعت کا میلان ایم اے یا بی ٹی میں داخلہ لینے کی طرف ہے۔ قانون کی طرف طبیعت راغب نہیں ہوتی کیونکہ میں تقریر کے فن سے نابلد ہوں۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ قانون کے پیشے میں اِس فن میں مہارت ضروری ہے۔ جواب میں ان کا یہ خط موصول ہوا۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ خیریت ہے۔ ایل ایل بی کا جو مشورہ میں نے

تم کو دیا تھا اس میں مندرجہ ذیل امور میرے ذہن میں تھے۔ (۱) ایل ایل بی پاس کر لینے کے بعد اگر تم پریکٹس نہ کرو تو عمدہ ملازمت ملنے میں سہولت ہوتی ہے (۲) اگر پریکٹس کرو تو کام میں تم کو خود سکھا سکتا ہوں اور گھر میں جو کتب خانہ قانونی کتابوں کا جمع ہو رہا ہے اس سے بھی تم فائدہ اٹھا سکو گے۔ یہ کام مذاق کا اس قدر نہیں جس قدر کہ محنت اور تجربے کا ہے۔ پریکٹس سے آدمی اس کے سب پہلو سیکھ جاتا ہے۔ البتہ اعلیٰ درجہ کے قانونی کام کے لئے جس میں بڑی بڑی تقریروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ مذاق اور قابلیت کی ضرورت ہے سو وہ پنجاب میں فی الحال ہیں نہیں۔ (۳) تین سال کی پریکٹس کے بعد (اگر تم پریکٹس کرو) تو ہائی کورٹ کے وکیل ہو جاؤ گے۔ اس وقت اگر حالات مساعدت کریں تو تم کو دو سال کے لئے ولایت بھیج دیا جائے گا جہاں سے با آسانی بیرسٹری کر آسکو گے۔ لیکن اگر تمہاری طبیعت اس سے نفور ہے تو پھر بی۔ ٹی پر میں امتحان ایم اے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد تم کو کالج میں ملازمت مل سکتی ہے بشرطیکہ ایم اے عمدہ طور پہ پاس کرو۔ موجودہ صورت میں عمدہ ملازمت ملنا مشکل ہے۔ ایل ایل بی یا ایم اے مزید qualifications ہیں پریکٹس کا ارادہ نہ بھی ہو تو ان دونوں میں سے کسی qualification کو حاصل کرنا چاہیئے۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔

والد مکرم کی خدمت میں آداب! ان کا کارڈ بھی مل گیا ہے۔ فریقین کو سخت تکلیف ہوئی مگر والد مکرم کی خدمت میں عرض کریں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔ دوسرے روز ایک مقدمہ مل گیا جس میں معقول فیس مل گئی۔ اگر میں گاڑی پر سوار ہو جاتا تو اس سے محروم رہتا۔ والسلام

محمد اقبال لاہور ۷ر اگست ۱۹ء

آموں کی کوئی اور بلٹی آئے تو اسے کھول کر ریل سے آم لے لینا چاہیئے۔

معلوم ہوتا ہے ۱۰ اگست کی رات کو جو کونت انہیں ہوئی اس سے وہ اور چچی سردار دونوں کچھ علیل ہو گئے۔ جس کی اطلاع مجھے اس خط میں دی۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ والد مکرم کا خط بھی ساتھ ملا اور ادھر سے بھائی صاحب کا خط بھی آ گیا۔

غلام نبی کا میرے پاس مبلغ چار سو روپیہ ہے۔ تم ان کو وہاں سے دے دو۔ طاہر دین کے پشاور جانے کی اب ضرورت نہیں رہی کیونکہ بھائی صاحب لکھتے ہیں کہ وہ خود سیالکوٹ آئیں گے۔ پیچش کی وجہ سے صاحب فراش ہوں چونکہ اس موسم کی پیچش کے بڑھ جانے کا امکان ہے۔ اس واسطے آج صبح اس کا ٹیکہ لگوا لیا ہے۔ تمھاری چچی بھی کئی دن سے بیمار تھی اب اس کو آرام ہے۔ باقی خدا کا فضل ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض۔

والسلام

محمد اقبال ۱۱ اگست سنہ ۱۹ء

۳۱

موخر الذکر خط میں وہ کچھ باتیں لکھنا بھول گئے تھے۔ لہذا دوسرے دن مجھے یہ خط لکھا۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

کل میں نے تمہیں خط لکھا تھا مگر ایک دو باتیں بھول گیا۔ (۱) کشمیرے کا سوٹ تم بنا لو فی الحال مجھے ضرورت نہیں (۲) قانون کے متعلق جو مشورہ تم کو دیا گیا اس میں یہ

بات یاد رکھنا چاہیئے کہ اس میں کوئی مجبوری نہیں اگر تمہاری طبیعت خود اس فیصلے پر صاد کرے تو اس پر عمل کرنا چاہیئے ورنہ کوئی ضرورت نہیں بصورت دیگر ایم اے میں داخل ہو سکتے ہو۔

(۳) یہ بات دریافت طلب ہے کہ جب موٹر تم وزیرآباد لائے تھے تو کیا سڑک کی خرابی کی وجہ سے موٹر کو کوئی نقصان پہنچ گیا تھا ؟ اگر ایسا ہوا تو کیا نقصان ہوا ؟ باقی خیریت ہے۔

والدمکرم کی خدمت میں آداب عرض کر دیں۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۱۲ راگست ۱۹

اس خط میں جن تین باتوں کا ذکر ہے ان کی وضاحت کرتا چلوں۔

(۱) اباجی نے پشاور سے چچا جان کے سوٹ کے لئے کشمیرے کا کپڑا بھیجا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ کہہ کر کہ مجھے فی الحال ضرورت نہیں وہ کپڑا مجھے عطا کر دیا۔ غالباً اس لئے کہ مجھے ایم۔اے یا ایل۔ایل۔بی میں داخلہ لینا تھا۔ انہوں نے سوچا ہو گا کہ اس کے پاس ڈھنگ کا ایک سوٹ تو ہونا چاہیئے۔

(۲) چونکہ میں آئندہ تعلیم کے متعلق لکھ چکا تھا کہ قانون کی طرف میری طبیعت راغب نہیں اور ان کا مشورہ ایل ایل بی میں داخلے کا تھا اس لئے انہوں نے یہ وضاحت کر دی کہ اُن کے مشورہ پر عمل کرنے کی کوئی مجبوری نہیں۔

(۳) موٹر کی خرابی کے واقعہ کی تفصیل لکھی جا چکی ہے۔ نقصان کے متعلق استصواب اس لئے کیا گیا تھا کہ اُس کا معاوضہ ادا کیا جائے۔ وہ معاملہ کے بڑے صاف اور لین دین کے کھرے تھے بعد میں جب سیالکوٹ آئے تو معاوضے کی ادائیگی کرنے پر اصرار کرتے رہے۔ اُدھر ہمارے پھوپھا کرم الٰہی بھی بڑی اونچی ناک رکھتے تھے وہ کسی طرح معاوضہ لینے پر رضامند نہ ہوتے تھے۔ آخر میاں جی نے یہ کہہ کر بات ختم کرا دی کہ موٹر کے انجن میں جو خرابی ہو گئی تھی وہ تو امتیاز نے ٹھیک کر دی اور اُس پر کوئی خرچہ نہیں ہوا۔

اگرچہ میرے نام اپنے ۳ اگست والے خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ ۷ اگست والے واقعہ سے جو تکلیف انہیں ہوئی وہ اس قدر ہمت شکن ہے کہ اب دوبارہ ریلوے سفر کی ہمت ان میں باقی نہیں۔ لیکن افغانستان کے ساتھ ۶ ماہ کے لئے عارضی صلح ہو جانے کی وجہ سے ابا جان کو ہفتہ دو ہفتہ کی رخصت ملنے کی امید ہو گئی۔ لہٰذا سیالکوٹ آنے کے لئے چچا جان نے پھر ریل کا ڈبہ ریزرو کرانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس کی اطلاع مجھے اس خط میں دی:-

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

بھائی صاحب نے لکھا تھا کہ کشمیرے کے کوٹ کے لئے استر سیالکوٹ سے خرید نہ کرنا۔ وہیں سے بھیجا جائے گا۔ میں پھر گاڑی ریزرو کرانے کی کوشش کر رہا ہوں امید ہے دو تین روز تک ہو جائے گی۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا تھا وہ بھی خیریت سے ہیں۔ افغانستان کے ساتھ چھ ماہ کے لئے عارضی صلح ہو گئی ہے اب امید ہے ان کو ہفتہ دو ہفتہ کے لئے رخصت مل سکے گی۔ والدعا

محمد اقبال لاہور ۱۳ اگست ۱۹ء

چونکہ ۱۱ اگست والے خط میں انہوں نے اپنی اور چچی سردار کی علالت کا ذکر کیا تھا۔ اس لئے سیالکوٹ میں سب کو تشویش ہوئی اور دریافت حال کے لئے خط لکھے گئے جواب میں انہوں نے مجھے یہ خط لکھا۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ والد مکرم اور بھائی صاحب کے خطوط بھی اس کے ساتھ ہی ملے۔ الحمد اللہ کہ سب طرف خیریت ہے پیچش سے اب بالکل آرام ہے اور تمہاری چچی بھی تندرست ہے اس کی گردن و بازو پر گرمی دانے نکلے تھے جو بڑھ کر پھوڑے بن گئے کہ ان میں پانی پڑ گیا تھا۔ اب اسے بھی بالکل آرام ہے۔ باقی خدا کا فضل ہے۔ والد مکرم کے نام ابھی خط لکھ چکا ہوں۔ ڈاک میں ڈالنے کے بعد تمہارا خط پہنچا۔ والد مکرم کی خدمت میں عرض کریں کہ اب کوئی شکایت نہیں۔ ٹیکا محض احتیاطاً لگوایا گیا تھا کہ پیچش طویل نہ ہو جائے۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۱۶ اگست سنہ ۱۹ء

دلّی چلے کا وقت قریب آ رہا تھا اور میں ابھی آخری فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ کیا کروں۔ ذہن ناپختہ تھا اور مجھ میں کچھ خود رائی کا مادہ بھی تھا۔ آخر میں نے انہیں لکھ دیا کہ میری طبیعت قانون کی طرف بالکل راغب نہیں ہوتی اور میں ہسٹری میں ایم اے کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے جواب میں اُن کا یہ خط آیا۔

لاہور ۲۰ اگست سنہ ۱۹ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

بعد دعا کے واضح ہو تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد اللہ کہ گھر میں ہر طرح خیریت ہے۔ والد مکرم کا کوئی خط تمہارے متعلق ابھی نہیں ملا۔ بہر حال اگر تمہاری طبع کا میلان قانون کی طرف نہیں ہے تو بہتر ہے ایم اے کلاس میں داخل ہو جاؤ۔ یہ سب کچھ میں تم کو پہلے لکھ چکا ہوں۔ حیدر آباد عثمانیہ یونیورسٹی کا اگر تمہیں خیال ہے تو فارسی اور اردو میں اچھی لیاقت پیدا کرنی چاہیے۔ خود ہسٹری کے مطالعہ کیلئے بھی فارسی بلکہ عربی کی بھی ضرورت ہے۔ عربی نہ

سہی تو فارسی کے بغیر کام چلانا مشکل ہے بشرطیکہ اوریجنل کام مقصود ہو۔ میں ابھی سیالکوٹ آنے کے لئے چند روز کا اور انتظار کروں گا۔ اگر گاڑی مل گئی تو ضرور آؤں گا۔ بارش پھر ہو رہی ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔ بچوں کو دعا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے ہر طرح خیریت ہے۔

محمدؐ اقبال

لکھنے کو تو میں نے لکھ دیا کہ ایم اے میں داخلہ لینا چاہتا ہوں لیکن تذبذب کی کیفیت بدستور تھی۔ دو چار احباب سے مشورہ کیا تو وہ بھی "قانون" کے حق میں تھے۔

میاں جی تو شروع سے کہہ رہے تھے کہ اقبال کی رائے صائب ہے تمہیں اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ پھر یہ اندیشہ بھی تھا کہ آبا جان رخصت پر گھر آ رہے ہیں۔ یہ بات اُن تک بھی پہنچے گی اور وہ چچا جان کی طرح آسانی سے میرے اپنے میلانِ طبیعت کے مطابق ایم اے میں داخلہ لینے پر رضامند نہیں ہوں گے بلکہ مُصر ہوں گے کہ چچا جان کی رائے پر عمل کیا جائے۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں نے انہیں لکھا کہ چونکہ اکثریت کی رائے "قانون" کے حق میں ہے لہٰذا میں نے ایل ایل بی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس پر انہوں نے یہ جواب دیا۔

لاہور ۲۰ اگست ۱۹۳۰ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

بعد دعا کے واضح ہو تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ والد مکرم کی علالت کے خبر سے تردد ہے۔ ان کی خیریت سے جلد آگاہ کرنا چاہیئے۔ انشاء اللہ میں بھی دو چار روز تک حاضر ہوں گا۔ گاڑی کے ریزرو کرانے کی بھی کوشش کر رہا ہوں۔ کھانے کے لئے انہیں ساگو دانہ بلکہ بہتر یہ ہے کہ اراروٹ دیا جائے۔

قانون کے متعلق تم نے فیصلہ کر لیا ہے تو بہتر چشم ماروشن دل ماشاد مگر تم تو کہتے تھے کہ طبیعت ہی ادھر راغب نہیں میجارٹی کی رائے طبیعت میں رغبت نہیں پیدا کر سکتی۔ بہر حال اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو بہتر ہے۔ میں مکان کی تبدیلی کے فکر میں ہوں۔ لیکن اب تک کوٹھی نہیں مل سکی۔ جب تک کوٹھی نہ ملے تم لا کالج ہوسٹل میں رہو یا مسلم ہوسٹل میں۔ مرزا یعقوب بیگ صاحب کو اس بارے میں لکھ دوں گا۔ فی الحال تم لا کالج کے پرنسپل کے نام ایک عرضی ایڈمشن کے لئے لکھ دو (لالہ کنور سین ایم اے بیرسٹر ایٹ لا پرنسپل لا کالج لاہور) یہ اس واسطے ہے کہ ایک مقرر تعداد (۲۰۰) سے زیادہ ایڈمٹ نہیں کی جاتی۔ تمہاری عرضی وقت پر پہنچنی چاہیئے۔ بہتر ہو کہ ابھی لکھ دو۔ وقت پر میں بھی ان کو خط لکھ دوں گا۔ امید ہے اس میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ تمہارا بستر ابھی تک نہیں ملا۔ علی بخش یہاں نہیں ہے۔ دوسرے ملازم کو بھیجا تھا مگر جو لڑکا بستر لایا تھا وہ وہاں موجود نہ تھا اور اس کے ساتھیوں نے بستر دینے سے انکار کیا اور کہا کہ اس لڑکے کے آنے پر بستر دے دیں بھجوا دیا جائے گا مگر اب تک انہوں نے بستر نہیں بھیجا آج پھر آدمی ارسال کرونگا۔ والسلام

والد مکرم کی خدمت میں آداب — محمد اقبال لاہور

میرے خط میں میاں جی کی طبیعت ناساز ہونے کا ذکر تھا اس لئے پچھلا خط لکھنے کے دوسرے دن انہوں نے میاں جی کو یہ خط لکھ کر مزاج پرسی کی اور لکھا کہ وہ ریل کے ڈبہ کی ریزرویشن کی کوشش کر رہے ہیں اور جلد سیالکوٹ آئیں گے۔

قبلہ و کعبہ السلام علیکم۔ آپ کا خط مل گیا تھا لیکن آپ کی علالت طبع سے تردد ہے۔ اعجاز کا خط بھی آیا تھا میں نے اسے لکھا ہے کہ آپ کی خیریت سے آگاہ کرے۔ گاڑی کا انتظام ہو جائے گا آج باقاعدہ درخواست کروں گا امید ہے کہ تین دن میں گاڑی ملے گی پھر میں انشاءاللہ حاضر خدمت ہوں گا اور سب کو ہمراہ لاؤں گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت

ہے اپنی خیریت سے آگاہ فرمائیے ۔ بچوں کو دعا ۔ والسلام

محمد اقبال ۲۷/ اگست سنہ ۱۹؁ لاہور

(۳۷)

میں نے میاں جی کی خیریت کی اطلاع دی اور اُن کے اطمینان کے لئے خود میاں جی نے بھی اپنی طرف سے خط لکھوایا ۔ اس خط میں میں نے پھر قانون کی طرف رغبت نہ ہونے کا رونا رویا ۔ جواب میں یہ خط لکھ کر ہلکی سی ڈانٹ پلائی ۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط اور والد مکرم کا کارڈ ابھی ملا ہے ۔ الحمد اللہ کہ گھر میں خیریت ہے ۔ ابھی ایک خط ڈاک میں ڈال چکا ہوں ۔

مجھے اس بات کا تعجب ہے کہ تم ہسٹری کے طالب علم ہو اور تمہیں قانون سے رغبت نہیں کہ ان دونوں علوم کا نہایت گہرا تعلق ہے ۔ بہر حال جب تم قانون پڑھو گے تو مجھے اُمید ہے تم کو اس سے رغبت ہو جائے گی ۔ کتابیں تم کو سب خرید کرنی چاہیئے ۔ کہ مجھے ہر وقت پریکٹس میں ان کی ضرورت رہتی ہے البتہ Dyce اور Allbert دونوں سیالکوٹ کی کتابوں میں دیکھو شاید وہاں سے مل جائیں ممکن ہے کہ RATIGAM "جورس پروڈنس بھی ہو لیکن یقینی نہیں کہہ سکتا ۔ اس کے علاوہ میرے پاس پرانی ایڈیشن ہیں تم کو نئی ایڈیشن پالک وغیرہ کی خرید کرنی چاہئیں لالہ کنور سین کے نام میرے حوالے سے ایک خط لکھ دو فارم بعد میں پُر کر دیا جائے گا ۔ ہر معاملے میں اپنی رائے کو دخل نہ دیا کرو ۔ اس ضمن میں جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ اس واسطے تھا کہ میں نے لالہ کنور سین صاحب سے تمہارا عرصہ ہوا ذکر کر دیا تھا ۔ پھر تم لاہور آؤ گے تو ایک دستی خط ان کے نام دوں گا ۔ امید تو نہیں کہ تین سو سے زائد درخواستیں ہوں تاہم یہ سب کچھ میں نے ازراہ احتیاط کیا تھا ۔ باقی خیریت ہے ۔ والد مکرم کی خدمت میں عرض کر دیں کہ کوٹھی کی تلاش میں ہوں تعویق اس واسطے ہوئی کہ کوٹھی موقع پر نہیں ملتی اور جو کوٹھیاں موقع پر ہیں ان کے مالک ہندو ہیں

جو قدرتی طور پر ہندو کرایہ داروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ کوٹھی نہ ملنے کی اصل وجہ یہ ہے۔ کم بخت..... نے وعدہ کیا اور بعد میں بدعہدی کر کے جو آج کل کے مسلمانوں کا عام شیوہ ہے کوٹھی کسی اور کو دے دی۔

والسلام
محمد اقبال لاہور

اس وقت تو اپنی کم فہمی کی وجہ سے شاید اس ڈانٹ کے جواز کا احساس نہ ہوا ہو لیکن اب تو سمجھتا ہوں کہ اپنی متلون مزاجی پر میں اس سے زیادہ سرزنش، کا سزاوار تھا کیونکہ وہ لا کالج کے پرنسپل سے میرا ذکر کر چکے ہوئے تھے۔

اس خط میں مجھے قانون کی کتابیں خریدنے کے متعلق ہدایت کرتے ہوئے دو کتابوں کی نسبت لکھا ہے کہ سیالکوٹ کی کتابوں میں دیکھو شاید وہاں مل جائیں۔ مراد وہ کتابیں تھیں جو انگلستان جاتے وقت وہ سیالکوٹ چھوڑ گئے تھے۔ چونکہ ۱۸۹۸ء میں انہوں نے خود بھی پنجاب یونیورسٹی کا قانون کا امتحان دیا تھا۔ اس لئے انہیں خیال ہوگا کہ قانون کی وہ دو کتابیں جن کا ذکر خط میں ہے۔ سیالکوٹ والی کتابوں میں ہوں گی لیکن قانون کی کوئی کتاب اُن کتابوں میں نہ تھی۔

اس خط کے آخر میں میاں جی کے نام کوٹھی کے متعلق جو پیغام ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۹ء میں بھی ہندو مالکان اپنی جائیداد کرایہ پر دینے کے لئے ہندو کرایہ داروں کو ترجیح دیتے تھے گویا اس معاملے میں بھی چھوت چھات پر عامل تھے خط میں جس مسلمان مالک مکان کی بدعہدی کا ذکر ہے اس کا نام میں نے دانستہ حذف کر دیا ہے تاکہ ان کی بدعہدی کے اس سارٹیفکیٹ سے ان کی بے قصور آل اولاد کو ناکردہ شرمسار نہ ہونا پڑے۔

جس دن موخر الذکر خط لکھا اسی شام کو یہ خط لکھا۔ امتیاز میرے منجھلے بھائی

کے لئے جو دوائی بھیجنے کا لکھا ہے وہ سیالکوٹ میں دستیاب نہ تھی اور انہیں لاہور
سے بھیجنے کے لئے لکھا گیا تھا۔

Dyce یہاں کتابوں میں نکل آئی ہے البرٹ وہاں تلاش کرو یہاں نہیں ہے۔
صبح خط لکھ چکا ہوں۔ اعجاز کے لئے دوائی کل بذریعہ پارسل روانہ ہوگی۔

محمد اقبال   ۲۹ اگست ۱۹۱۹ء لاہور

۳۹

اباجان کی رخصت منظور ہوگئی اور انہوں نے سیالکوٹ آنے کا پروگرام بنا لیا۔
ادھر چچا جان بھی ریل کا ڈبہ ریزرو کرانے میں کامیاب ہوگئے اور سیالکوٹ کا سفر طے پاگیا۔
اس کی اطلاع مجھے اس خط میں دی۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا تھا۔ وہ
اتوار کے روز وہاں سے چلیں گے۔ غالباً میں بھی اسی روز چلوں گا یا ایک روز بعد پانچ چھ
ستمبر کو لاہور کی نیم شبی گاڑی کا تعلق وزیرآباد سے سیالکوٹ جانے والی گاڑی کے ساتھ
ہوجائے گا۔ میل میں تو آج کل کسی کو جگہ نہیں ملتی رات کی گاڑی میں ہی آنا ہوگا کیونکہ
بھائی صاحب کے کپڑوں کا ٹرنک بھی ساتھ لانا ہے۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔

والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔

بچوں کو دعا   محمد اقبال لاہور   ۳ ستمبر ۱۹ء

ستمبر ۱۹ء کے شروع میں اباجان رخصت پر سیالکوٹ آگئے۔ چچا جان بھی

چچی سردار اور چچی مختار کے ہمراہ تشریف لے آئے ۔ وہ تو ایک ہفتہ کے قریب ٹھہر کر واپس لاہور چلے گئے ۔ دونوں چچیوں کو بھابھی جی نے روک لیا کہ کچھ دن اور ٹھہریں ستمبر کے آخر میں چچا جان نے یہ خط میرے نام لکھا ۔ اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں لیکن ستمبر کے آخری ہفتہ کی کسی تاریخ کا ہے ۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

ملفوفہ خط سٹیشن ماسٹر سیالکوٹ کے نام ہے جس میں یہاں لاہور کے سٹیشن سے تمام حالات دریافت کر کے لکھا ہے ۔ یہاں سے یہ ہدایت ہوئی ہے کہ اس مضمون کا خط سٹیشن ماسٹر سیالکوٹ کے نام لکھا جائے ۔ امید ہے اس عرضی سے گاڑی آپ کے لئے ریزروڈ ہو جائے گی ۔ اور اس میں صرف عورتیں بیٹھ سکیں گی ۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے ۔ صبح ۳۰ ستمبر کو آپ وہاں سے چلیں ۔ والسلام

محمد اقبال لاہور

کرایہ زیادہ نہ دینا پڑے گا ۔ جس قدر ٹکٹ ہوں گے انہیں کا کرایہ دینا ہو گا ۔ دو ٹکٹ تمہاری چچیوں کے ہوں گے تم بھی ان کے پاس بیٹھ جانا اور اگر کوئی لیڈی آ گئی تو تم کو مردوں کے کمرے میں بیٹھنا ہو گا ۔ داری کا ٹکٹ تیسرے درجہ کا ہو گا ۔ بورڈ گاڑی پر لگوا لینا ۔

سٹیشن ماسٹر سیالکوٹ کے نام جو خط ملفوف تھا وہ انہیں پہنچا دیا گیا ۔ اُس کے مطابق ۳۰ ستمبر صبح کی گاڑی سے سیکنڈ کلاس کا ایک ڈبہ خواتین کے لئے مخصوص کر دیا گیا اور میں اُس گاڑی سے دونوں چچیوں کو لے کر لاہور پہنچ گیا ۔

چچا جان کے متعلق ایک عام تاثر یہ ہے کہ اپنے شاعرانہ مزاج اور فلسفیانہ طبیعت کی وجہ سے ان کا عملی پہلو کمزور تھا اور اسی لئے انہوں نے وکالت کے پیشہ کی طرف پوری توجہ نہیں دی ۔ یہ تاثر درست نہیں ۔ ان کے اکثر خطوط اس تاثر کی نفی کرتے ہیں اب اسی خط کو لیجئے ۔ سیالکوٹ سے لاہور کے مختصر سفر کے لئے پہلے تو لاہور سٹیشن سے

تمام حالات دریافت کرکے "سٹیشن ماسٹر سیالکوٹ کے نام خواتین کے لئے ایک ڈبہ مخصوص کرنے کے لئے مجھے خط بھجوایا۔ اس کے ساتھ جزئیات کے متعلق مفصل ہدایات بھیجیں مثلاً "کرایہ زیادہ نہ دینا پڑے گا۔ جس قدر ٹکٹ ہوں گے انہیں کا کرایہ دینا ہوگا" "دو ٹکٹ تمہاری بچیوں کے ٹکٹ ہوں گے۔" "تم بھی ان کے پاس بیٹھ جانا اور اگر کوئی لیڈی آ گئی تو تم کو مردوں کے کمرے میں بیٹھنا ہوگا۔" "دارمی (خادمہ) کا ٹکٹ تیسرے درجے کا ہوگا" "بورڈ (مخصوص برائے خواتین) گاڑی پر لگوا لینا" کیا یہ مفصل ہدایات کسی ایسے شخص کی ہو سکتی ہیں جس کا عملی پہلو کمزور ہو۔ یہ درست ہے کہ وکالت کے پیشے میں وہ مقدمات حاصل کرنے کے لئے مروجہ بھاگ دوڑ نہ کرتے تھے لیکن جو مقدمات لے لیتے ان کی تیاری اور پیروی پوری محنت اور توجہ سے کرتے۔

ہمارے پھوپھا غلام محمد (جن کے ساتھ ہماری منجھلی پھوپھی بیاہی ہوئی تھیں) کا ذکر میاں جی کے ذکر میں کیا جا چکا ہے۔ ہماری یہ پھوپھی میرے لڑکپن میں ہی چار بیٹے چھوڑ کر فوت ہو گئی تھیں۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کو پھوپھا جی نے سینٹرل ماڈل سکول امرتسر میں داخل کرنا چاہا۔ لیکن یہ خیال انہیں اس وقت آیا جب سکول میں داخلہ بند ہو چکا تھا۔ سکول کے پرنسپل ڈاکٹر میر ہدایت اللہ تھے۔ پھوپھا جی کے کہنے پر میاں جی نے چچا جان کو لکھا کہ وہ لڑکے کے داخلے کے لئے پرنسپل کو لکھیں۔ چچا جان نے جواب دیا کہ سکول میں داخلہ بند ہو جانے کے بعد اب کسی طالب علم کا داخل کیا جانا شاید ممکن نہ ہو لیکن تعمیل ارشاد میں ڈاکٹر میر ہدایت اللہ کو خط لکھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کا وہی جواب آیا جس کی توقع تھی۔ اس پر میاں جی کو یہ خط لکھا۔

پھوپھا جی کو عمر بھر یہ شکوہ رہا کہ میرے بیٹے کے داخلے میں مدد نہیں کی۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

کئی دن ہوئے ایک خط غلام محمد کے لڑکے کے بارے میں آپ کی خدمت میں لکھا تھا جس کا مفہوم اعجاز کہتا ہے کہ میں نے لے سمجھا دیا تھا۔ آج میر ہدایت اللہ صاحب کا جواب آیا ہے جو میرا خیال تھا صحیح نکلا۔ ڈاکٹر میر ہدایت اللہ لکھتے ہیں کہ کالج و سکول کا داخلہ بند ہو چکا ہے اب کسی کے اثر و رسوخ سے کوئی لڑکا سکول میں داخل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اطلاعاً عرض ہے۔ اب اس کو یا تو اسلامیہ کالج میں داخل ہو جانا چاہیئے یا ایک برس انتظار کرنا ہوگا اگر وہ میڈیکل سکول میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

محمد اقبال لاہور ۹ اکتوبر ۱۹ء

۴۲

ہماری پھوپھی کریم بی بی نے چچا جان کو خط لکھا جس میں اپنا ایک خواب لکھا اور اس کی جو تعبیر میاں جی نے کی وہ بیان کی۔ جواب میں انہوں نے پھوپھی جی کو یہ خط لکھا

لاہور ۸ دسمبر ۱۹ء

ہمشیرہ عزیزہ السلام علیکم

تمہارا خط مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ گھر میں سب طرح خیریت ہے۔ اس وقت واقعی وہی حالت دنیائے اسلام کی ہے جو تم کو خواب میں دکھائی گئی اور والد مکرم نے جو نتیجہ نکالا وہ بھی خدا کے فضل و کرم سے صحیح ہے اور میرا عقیدہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نئی زندگی عطا فرمائے گا اور جس قوم نے آج تک اس کے دین کی حفاظت کی ہے اس کو ذلیل و رسوا نہ کرے گا۔ مسلمان کی بہترین تلوار دعا ہے سو اسی سے کام لینا چاہیئے۔ ہر وقت دعا کرنا چاہیئے اور نبی کریمؐ پر درود بھیجنا چاہیئے کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس امت کی دعا سن لے اور اس کی غریبی پر رحم فرمائے میں جو اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ وغیرہ پڑھنے میں گنوائی۔ خدا تعالیٰ نے مجھ کو

قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے اگر یہ قوائے دینی علوم کے پڑھنے میں صرف ہوتے تو آج خدا کے رسول کی میں کوئی خدمت کر سکتا اور جب مجھے خیال آتا ہے کہ والد مکرم مجھے علوم دینی ہی پڑھانا چاہتے تھے تو مجھے اور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ صحیح راہ معلوم بھی تھی تو بھی وقت کے حالات نے اس راہ پر چلنے نہ دیا۔ بہرحال جو کچھ خدا کے علم میں تھا ہوا اور مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکا میں نے کیا۔ لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے بڑھ کر ہونا چاہیئے تھا اور زندگی تمام دکمال نبی کریم کی خدمت میں بسر ہونی چاہیئے تھی۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں میری طرف سے بہت بہت آداب عرض کریں۔ بھائی صاحب کی علالت کے متعلق تم نے کچھ نہیں لکھا امید ہے کہ اُن کا مزاج بخیر ہو گا۔ اعجاز کے ہم وسن مرچ تمباکو اور دوائی بھیجی جائے گی۔ ڈاکٹر علی نقی کہتے تھے کہ پھوڑوں پر جونک نہ لگوانی چاہیئے جو دوا وہ ارسال کریں گے وہ خون کے لئے بھی مفید ہو گی۔

والسلام

محمدؐ اقبال لاہور

پھوپھی جی کے خواب کی تفصیل مجھے معلوم نہیں کیونکہ میں ان دنوں لاء کالج میں تعلیم پانے کی وجہ سے لاہور میں رہتا تھا اور چچا جان کے نام پھوپھی جی کا خط میری نظر سے نہیں گزرا۔

ڈاکٹر علی نقی جن کا خط میں ذکر ہے مولانا میر حسن کے بڑے بیٹے اور گورنر ہاؤس لاہور کے عملہ کے ڈاکٹر تھے۔ ابا جان کو پھوڑے نکلے ہوئے تھے۔ ان دنوں کئی امراض میں جونکیں لگوانے کا رواج تھا۔ چچا جان نے ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا ہو گا۔ انہوں نے جونکیں لگوانے سے منع کیا اور دوائی تجویز کی۔ میں دسمبر کی تعطیلات میں سیالکوٹ جانے والا تھا۔ میرے ہاتھ دوائی بھیجنے کا لکھا ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی کر دیا جائے کہ چچا جان کو بچپن میں کسی مرض کے علاج کے طور پر جونکیں لگوائی گئی تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کی داہنی آنکھ کی بینائی قریباً جاتی رہی تھی۔ جب ۱۹۰۱ء میں انہوں نے ایکسٹرا

اسسٹنٹ کمشنر کی ملازمت کے لیۓ امتحان دیا تو اسی نقص کی وجہ سے وہ طبّی معائنہ میں ناکام ہو گئے۔

چچا جان حقّے کے رسیا تھے۔ اُن کے بعض زمیندار دوست مدّاح اور متوکل انہیں تحفتاً اچھا تمباکو بھیجا کرتے تھے۔ چونکہ میاں جی اور ابّا جان بھی حقّے کے شوقین تھے اس لیۓ انہیں بھی تمباکو کا حصہ ملتا تھا۔

۴۳

"روزگار فقیر" کے مصنف کرنل وحید الدین کے والد فقیر نجم الدین سے چچا جان اور ابّا جان دونوں کے دوستانہ مراسم تھے۔ غالباً ان کے کسی ایک بیٹے کی شادی تھی اور بارات لاہور سے باہر گئی تھی۔ فقیر صاحب نے دونوں بھائیوں کو مدعو کیا تھا۔ ابّا جان تو علالت کی وجہ سے نہ جا سکے۔ انہوں نے چچا جان سے دریافت کیا کہ بارات کے ساتھ گئے یا نہیں۔ اس کے جواب میں ابّا جان کو یہ خط لکھا۔

برادرم مکرم۔ السلامُ علیکم

فقیر صاحب کی برات کے ہمراہ میں نہیں گیا۔ اس واسطے کہ اس روز بہت بارش اور سردی تھی۔ اندیشہ تھا کہ اس سے کوئی تکلیف نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ ٹریموں کارش سفر ممکن نہ تھا۔ ریزرو گاڑی شاید ان کو نہ مل سکی۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ امید ہے کہ اعجاز بخیر و عافیت پہنچ گیا ہو گا اور گھر میں سب طرح خیریت ہو گی۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔ امید ہے کہ سردی کم ہونے پر وہ بھی لاہور تشریف لائیں گے۔ باقی خیریت ہے۔

والسلام

محمد اقبال لاہور

۲۵ دسمبر ۱۹ء

دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخر میں کانگرس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہوئے۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ اُن دنوں ہندو مسلمان شیر و شکر ہو کر انگریزی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خلافت کانفرنس کا سالانہ اجلاس بھی انہیں دنوں امرتسر میں ہوا۔ چوٹی کے ہندو مسلم رہنما ان اجلاسوں میں شرکت کے لئے امرتسر میں جمع ہوئے۔ علی برادران بھی جیل سے رہا ہوتے ہی امرتسر پہنچے۔ چچا جان اس سیاسی تحریک میں عملی طور پر تو شامل نہ تھے لیکن کس محبِ وطن کو آزادی کی خواہش نہ تھی۔ یہ اسی خواہش کا اظہار تھا کہ وہ نواب ذوالفقار علی خاں اور مرزا جلال الدین کے ساتھ "رونق دیکھنے" صبح موٹر پر امرتسر جاتے اور شام واپس آجاتے۔ امرتسر جانے کے متعلق میاں جی کو یہ خط لکھا۔

یہ خط دراصل یکم جنوری ۱۹۲۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ جنوری کی بجائے دسمبر بے دھیانی میں لکھ گئے۔

خط میں کسی مرزا صاحب کی کتاب کا ذکر ہے۔ مجھے یاد نہیں آرہا کہ یہ کون صاحب تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مثنوی مولانا روم کی شرح لکھی تھی جس پر چچا جان نے یہ مختصر تبصرہ کیا۔

قبلہ و کعبہ ام۔ السلام علیکم

آپ کا پوسٹ کارڈ مل گیا تھا۔ الحمدللہ کہ سب طرح سے خیریت ہے۔ امرتسر میں خوب رونق رہی۔ میں بھی دو روز جاتا رہا۔ شام کو واپس آجایا کرتا تھا۔ کانگرس کا جلسہ اس زور سے ہوا کہ اس سے پہلے آج تک نہیں ہوا۔ اور نہ امید ہے کہ ایسا جلسہ کبھی پھر ہو۔ غرض کہ خوب رونق کا زمانہ رہا۔

سردی ذرا کم ہو جائے تو آپ ضرور تشریف لادیں۔ مرزا صاحب کی کتاب اچھی

ہے مگر شرح لکھنے والے کا دل ویسا ہی ہونا چاہیئے جیسا کا مصنف کا۔ زیادہ کیا عرض
کروں۔ خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔ امید ہے کہ بھائی صاحب کی طبیعت اب
بالکل اچھی ہوگی۔

والسلام

محمد اقبال لاہور یکم دسمبر سنہ ۲۰ء

۴۵

ابا جی نے چچا جان کے لئے ایک کابلی دُھسہ منگوایا تھا۔ سیالکوٹ میں چمڑے
کے سوٹ کیس نئے نئے بننے لگے تھے۔ ہمارے محلے کا ایک نوجوان بڑے اچھے سوٹ
کیس بناتا تھا۔ اُس سے ابا جی نے چچا جان کے لئے ایک سوٹ کیس بنوایا تھا۔ یہ دونوں
اشیاء کسی کے ہاتھ اُن کو بھیجیں۔ اُن کے ملنے کی اطلاع اس خط میں دی۔

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا پوسٹ کارڈ ملا الحمدللہ کہ گھر میں سب طرح خیریت ہے یہاں پر خدا
کے فضل سے خیریت ہے۔ سردی چند روز خوب زور پر رہی۔ بارش بھی بہت ہوئی مگر
اب آسمان صاف ہے اور سردی بھی بہت کم ہوگئی ہے۔ والدمکرم کی خدمت میں آداب
عرض کریں۔ دھسہ اور سوٹ کیس پہنچ گئے تھے۔ والسلام

بچوں کو دعا

محمد اقبال لاہور ۱۶ر فروری سنہ ۲۰ء

میں نے لاء کالج میں داخلہ لے لیا ہوا تھا اور میرا قیام کالج کے ہوسٹل میں تھا
لیکن جب کبھی چچا جان کو کسی وجہ سے لاہور سے باہر جانا ہوتا تو اُن کی عدم موجودگی میں

مجھے اُن کے ہاں ٹھہرنا ہوتا۔ فروری سنہ ۲۰ کے آخری ہفتے میں وہ کسی کام کے سلسلہ میں دہلی گئے۔ وہاں سے مجھے لاہور واپس آنے کی تاریخ سے مطلع کیا۔ اُس خط کے لکھنے کے فوراً بعد انہیں مرزا جلال الدین بیرسٹر کی طرف سے ایک خط ملنے پر اپنے واپسی کے پروگرام میں تبدیلی کرنا پڑی۔ اُس کی اطلاع مجھے اس خط میں کی۔

خط کے اوپر مٹکاف ہاؤس کے بعد بے دھیانی میں دہلی کی بجائے لاہور لکھ گئے۔ مرزا جلال دین اُن کے جگری دوست تھے۔ اگرچہ خط میں لکھا ہے کہ انہیں دہلی میں ۷ مارچ تک ٹھہرنا ہوگا لیکن جیسا کہ اگلے خط سے ظاہر ہوگا وہ ۶ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء کو لاہور واپس آگئے تھے۔

Meatcalf House,
Lahore.

3rd March, 1920.

My dear Ijaz,

A moment ago I posted a letter to you telling you of the probable date of my arrival in Lahore. I have, however, just received a letter from M. Jalaluddin Barrister-AT-Law, Lahore asking me to stay in Delhi in connection with the Probate case. Please tell your aunt that I have been detained. Mirza Jalaluddin will reach Delhi on the 5th March and we shall have to stay till the 7th. I suppose your aunt knew of this possibility.

Hoping you are well.

Yours affectionately,

(MUHAMMAD IQBAL)

دہلی سے واپس آکر اباجان کو یہ خط لکھا۔ یہ دو صفحوں کا خط ان کی اہلی زندگی کے المیہ کے متعلق ہے۔اس لئے متعلقہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے ۔

برادرم مکرم السلامُ علیکم

میں آج مع الخیر واپس آگیا ہوں۔ امید ہے گھر میں ہر طرح خیریت ہوگی۔آپ کا ۲۰ فروری کا لکھا ہوا خط مل گیا ہے۔ . . . .

. . . .

میرے خیال میں یہ معاملہ کسی تیسرے آدمی کی وساطت سے طے ہونا چاہیئے۔ والدِ مکرم کی خدمت میں آداب ۔

والسلام

محمدؐ اقبال

میرے لئے مناسب رشتہ کی تلاش ہو رہی تھی۔ اُس سلسلہ میں ابّا جان کے خط کے جواب میں انہیں یہ خط لکھا۔

لاہور ۷ را پریل ۲۰ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ میری بھی ذاتی رائے یہی ہے کہ سیالکوٹ میں ہو تو بہتر ہے لیکن اگر سیالکوٹ میں موزوں جگہ نہ ملے تو مجبوراً کسی اور جگہ تلاش تلاش کرنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ سیالکوٹ کو مقدم سمجھنے سے غیر موزوں جگہ پر قناعت کی جائے۔ اس امر کے علاوہ آپ کو اور لڑکوں اور لڑکیوں کے رشتے بھی کرنے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ تعلقات کا دائرہ وسیع ہو۔ میں نے اپنے بعض احباب سے ذکر کیا ہے اور اوروں سے بھی کروں گا۔

ہفتے کے روز شام کو شملہ جاؤں گا۔ وہاں ایک ہفتہ قیام رہے گا۔ اعجاز ایک ہفتہ کے لئے یہاں آجائے گا۔

ایک نوکر کی ضرورت ہے اس کی تلاش رکھیئے۔ میرا پرانا نوکر مہرالٰہی ہشیار پور سے آگیا تھا۔ مگر پھر چلا گیا ہے اور اس کے بھائی اسے آنے نہیں دیتے۔ اگر سیالکوٹ سے کوئی آدمی ایسا مل جائے جس پر اعتبار ہو سکے تو بہت عمدہ بات ہے۔ احموں سے پوچھیئے وہ کہیں نہ کہیں سے پیدا کرے گا۔ کام کچھ نہیں ہے صرف مکان کو صاف رکھنا اور حاضر باشی۔ مہرالٰہی آٹھ روپیہ ماہوار لیتا تھا اور کھانا۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض

والسلام

محمد اقبال

ان دنوں ان کے ہاں دو ملازم تھے۔ علی بخش اور مہرالٰہی دونوں ضلع ہوشیار پور

کے تھے۔ مہر الٰہی اپنے وطن واپس چلا گیا۔ اُس کی بجائے ایک ملازم کی ضرورت تھی۔ احموں جس سے ملازم کے متعلق پوچھنے کو لکھا ہے اُن کے لڑکپن کا ہم جلیس تھا۔ اُس کا نام احمد دین تھا۔ دونوں میں قدر مشترک کبوتر تھے۔ احموں کو میں نے دیکھا ہوا ہے۔ سرخ و سفید رنگ کا کشمیری تھا۔ اس کے ہاں قسم قسم کے اچھی نسل کے بہت سے کبوتر تھے۔ چچا جان سیالکوٹ آتے تو احموں کبھی کبھی ان سے ملنے آیا کرتا تھا۔ سارا وقت کبوتروں کے متعلق گفتگو ہوتی۔ میرے لڑکپن میں احموں کے ہاں سیالکوٹی کاغذ تیار ہوتا تھا جب اس کاغذ کی مانگ نہ رہی تو پھر کوئی اور کاروبار کر لیا تھا۔

اپریل ۱۹۲۰ء میں کشمیر سے ایک پیرزادہ صاحب جن سے چچا جان کی کوئی شناسائی نہ تھی۔ ان سے ملنے آئے۔ پیرزادہ صاحب نے اُن سے اُن کے متعلق اپنا ایک کشف بیان کیا۔ اُسے سُن کر ان کی جو کیفیت ہوئی اس کا ذکر میاں جی کے نام اس خط میں کیا اور اپنی "روح کی نہایت کرب و اضطراب کی حالت" کا علاج دریافت کیا۔ یہ خط چچا جان پر تحقیق کرنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

لاہور ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

قریباً چار ماہ کا عرصہ ہوا کہ مجھے ایک گمنام خط آیا جس کا مضمون یہ تھا کہ نبی کریم کے دربار میں تمہاری ایک خاص جگہ ہے جس کا تم کو کچھ علم نہیں اگر تم فلاں وظیفہ پڑھا کرو تو تم کو بھی اس کا علم ہو جائے گا۔ وہ وظیفہ خط میں درج تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ وہ خط گمنام تھا اس کی طرف کچھ توجہ نہ کی اب وہ خط میرے پاس نہیں ہے معلوم نہیں ردی میں مل ملا کر کہاں چلا گیا۔

پرسوں کا ذکر ہے کہ کشمیر سے ایک پیرزادہ مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ اس کی عمر قریباً

تیس پنتیس سال کی ہو گی۔ شکل سے شرافت کے آثار معلوم ہوتے تھے گفتگو سے ہشیار سمجھدار اور پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ مجھ سے کوئی گفتگو کرے مجھ کو دیکھ کر بے اختیار زار دقطار رونے لگا۔ میں نے سمجھا کہ شاید مصیبت زدہ ہے اور مجھ سے کوئی مدد مانگتا ہے۔ استفسار حال کیا تو کہنے لگا کہ کسی مدد کی ضرورت نہیں مجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔ میرے بزرگوں نے خدا کی ملازمت کی اب میں ان کی پنشن کھا رہا ہوں۔ رونے کی وجہ خوشی ہے نہ غم مفصل کیفیت پوچھنے پر اس نے کہا کہ نوگام میں جو میرا گاؤں سری نگر کے قریب ہے میں نے عالم کشف میں نبی کریمؐ کا دربار دیکھا۔ صف نماز کے لئے کھڑی ہوئی تو حضور سرور کائنات نے پوچھا کہ محمدؐ اقبال آیا ہے یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ محفل میں نہیں تھا۔ اس پر ایک بزرگ کو اقبال کے بلانے کے واسطے بھیجا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک جوان آدمی جس کی داڑھی مُنڈی ہوئی تھی اور رنگ گورا تھا مع اُن بزرگ کے صف نماز میں داخل ہو کر سرور کائنات کے دائیں جانب کھڑا ہو گیا۔

پیرزادہ صاحب کہتے ہیں کہ اس سے پہلے میں آپ کی شکل سے واقف نہ تھا نہ نام معلوم تھا۔ کشمیر میں ایک بزرگ مولوی نجم الدین صاحب ہیں جن کے پاس جا کر میں نے یہ سارا قصہ بیان کیا۔ تو انہوں نے آپ کی بہت تعریف کی وہ آپ کو آپ کی تحریروں کے ذریعہ جانتے ہیں گو انہوں نے آپ کو کبھی دیکھا نہیں۔ اس دن سے میں نے ارادہ کیا کہ لاہور جا کر آپ سے ملوں گا۔ سو محض آپ کی ملاقات کی خاطر میں نے کشمیر سے سفر کیا ہے اور آپ کو دیکھ کر مجھے بے اختیار رونا اس واسطے آیا کہ مجھ پر میرے کشف کی تصدیق ہو گئی کیونکہ جو شکل آپ کی میں نے حالت کشف میں دیکھی اس سے سرمو فرق نہ تھا۔ اس ماجرا کو سن کر مجھ کو معاً وہ گمنام خط یاد آیا جس کا ذکر میں نے اس خط کے ابتدا میں کیا ہے مجھے سخت ندامت ہو رہی ہے اور روح نہایت کرب و اضطراب کی حالت میں ہے کہ میں نے کیوں وہ خط ضائع کر دیا۔ اب مجھ کو وہ وظیفہ یاد نہیں جو اس خط میں لکھا تھا۔ آپ مہربانی کر کے اس مشکل کا کوئی علاج بتائیں کیونکہ پیرزادہ صاحب کہتے تھے کہ آپ کے متعلق میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ آپ کے والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں

کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے بالکل صحیح ہے کیونکہ میرے اعمال تو اس قابل نہیں ہیں۔ ایسا فضل ضرور ہے کہ دعا کا ہی نتیجہ ہو لیکن اگر حقیقت میں پیرزادہ صاحب کا کشف صحیح ہے تو میرے لئے لاعلمی کی حالت سخت تکلیف دہ ہے اس کا یا تو کوئی علاج بتایئے یا مزید دعا فرمایئے کہ خدا تعالےٰ اس گرہ کو کھول دے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط مل گیا تھا۔ کل پرسوں سے امتحانات کے پرچے آئیں گے ان کو ختم کرکے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔

محمد اقبال

میاں جی نے اس خط کے جواب میں اُن کی "سخت تکلیف دہ حالت" کا کیا "علاج" تجویز کیا۔ یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ یوں وہ "یا حیّ و یا قیوم" کا ورد بکثرت کرنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ ان کے ذکر میں بیان کیا جا چکا ہے کہ مجھے بھی ایک دن ان اسماء الٰہی کے ورد کی تاکید کی تھی اور کہا تھا کہ اقبال کو بھی میں نے اس ورد کی تاکید کی ہوئی ہے۔ شاید یہ "علاج" اسی خط کے جواب میں تجویز کیا گیا ہو۔ واللہ اعلم "برلبم یا حیّ و یا قیوم بود" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِن اسماء الٰہی کا ورد کیا کرتے تھے۔

لاہور، ۳ر جون ۲۰ء

قبلہ و کعبہ السلام علیکم

آپ کا والد نامہ ملا۔ الحمد للہ کہ آپ کی صحت اچھی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالےٰ دیر تک آپ کا سایہ ہمارے سر پر رکھے گا۔ بھائی صاحب نے اس سے پہلے کسی خط میں آپ کے انتظام خوراک وغیرہ کے بارے لکھا تھا۔ یہ طریق بہت اچھا ہے اور اسی کو دستور العمل بنانا چاہیئے۔ میں نے یورپ کے ایک مشہور حکیم کی کتاب میں دیکھا ہے کہ جو شخص ہر روز دہی کی لسی پیا کرے اس کی عمر بڑھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے

میں ایسے جراثیم ہیں جو قاطع حیات ہیں اور دہی کی لسی ان جراثیم کے لئے بمنزلہ زہر کے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں کے رہنے والے لوگ شہریوں کی نسبتاً عموماً طویل العمر اور تندرست ہیں۔ علی بخش نے کل مجھے بتایا کہ اس کی چچی کی لمبی عمر ہوئی۔ اور آخر عمر میں اس کا گذران زیادہ تر لسی پر تھی۔ ترش لسی تو شاید آپ کے لئے مفید نہ ہو کہ آپ کا گلا خراب ہے۔ البتہ میٹھے دہی کی لسی اگر صبح پی جائے تو شاید مفید ہو اس کا تجربہ بھی کرنا چاہیئے۔ افسوس ہے کہ کوئی اچھا مکان رہنے کو نہیں ملتا۔ موجودہ مکان میں جوان لوگ تو بآسائش رہ سکتے ہیں بوڑھوں کو تکلیف ہے ورنہ میری خواہش تھی کہ سال کا زیادہ حصّہ آپ میرے پاس بسر کیا کرتے۔ ذرا ریل کا انتظام ٹھیک ہو جائے تو انشاء اللہ آپ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوں گا۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے آپ کے دانت بنائے تھے اگر وہ خراب ہوگئے ہوں تو اُن کو ڈاک میں بھیج دیجئے گا پھر مرمت کرا دیئے جائیں گے اور اگر وہ قابلِ مرمت بھی نہ ہوں تو لکھئے ڈاکٹر عبداللطیف کو سیالکوٹ بھیج دوں گا کہ وہاں جاکر آپ کے دانت بنائے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ گھر سے سب آپ کی خدمت میں آداب لکھواتی ہیں۔

روحانی کیفیات کا سب سے بڑا ممد و معاون یہی کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط ہے۔ نبی کریم کی ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے میں خود اپنی زندگی کم از کم کھانے پینے کے متعلق اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں۔ دنیا کے حالات اور عام لوگوں کے حالات ایسے ہی ہیں ان کی طرف توجہ کرنا چاہیئے۔ عام لوگوں کی نگاہ بہت تنگ ہے ان میں سے بیشتر محض حیوانوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسی واسطے مولانا روم ایک جگہ لکھتے ہیں کہ چراغ لے کے تمام شہر میں پھرا کہ کوئی انسان نظر آئے مگر نظر نہ آیا۔ اور موجودہ زمانہ تو روحانیت کے اعتبار سے بالکل تہی دست ہے اسی واسطے اخلاص محبت و مروت و یکجہتی کا نام و نشان نہیں رہا۔ آدمی آدمی کا خون پینے والا اور قوم قوم کی دشمن ہے۔ یہ زمانہ انتہائے تاریکی کا ہے لیکن تاریکی کا انجام سفید ہے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرے اور بنی نوع انسان کو پھر ایک دفعہ نور محمدی عطا کرے۔ بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس بدنصیب

دنیا کی نجات نظر نہیں آتی ۔ زیادہ کیا عرض کروں ۔ خدا کا فضل ہے۔ غلام رسول بیمار تھا کل میں نے اس کی خیریت دریافت کرنے کے لئے فیروز پور تار دیا تھا مگر تا حال جواب نہیں آیا۔ آج کل تار بھی دیر میں پہنچتے ہیں ۔

والسلام

محمدؐ اقبال لاہور

اس خط سے ایک تو اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ ان کو میاں جی سے کس قدر عقیدت تھی ۔ افسوس ہے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کہ میاں جی "سال کا زیادہ حصہ" اُن کے پاس (لاہور میں) بسر کیا کریں ۔ انار کلی والے مکان کی ساخت واقعی ایسی تھی کہ اُس میں رہنے سے میاں جی کو تکلیف ہوتی ۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انار کلی والے مکان کے زمانۂ قیام میں میاں جی دو یا تین مرتبہ چچا جان کے پاس گئے تھے ۔میکلوڈ روڈ والے مکان کے زمانۂ قیام میں میاں جی کا لاہور جانا مجھے یاد نہیں۔ وہ جب بھی لاہور گئے ہفتہ عشرہ سے زیادہ قیام نہیں کیا ۔ اصل میں خود میاں جی کو سیالکوٹ سے باہر جا کر رہنے میں تامّل ہوتا تھا۔ اس لئے چچا جان ہی جب موقعہ ملتا انہیں ملنے سیالکوٹ آ جاتے۔

عبد اللطیف دندان ساز جس کا خط میں ذکر ہے چچا جان کے معتقدین میں سے تھے ۔ان کی دندان سازی کی دکان انار کلی بازار میں چچا جان کے مکان کے قریب ہی تھی۔ انہوں نے میاں جی کے مصنوعی دانت بنائے تھے۔ ان میں کچھ نقص ہو گیا تھا۔ جب میں گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد لاہور واپس آیا تو وہ دانت مرمت کے لئے ساتھ لے آیا۔ چچا جان کے ارشاد پر میں وہ دانت عبد اللطیف صاحب کی دکان پر دے آیا تھا ۔

ایک اور بات جو اس خط میں قابلِ توجہ اور قابلِ غور ہے وہ ایک تو ان کا بے لاگ اظہار خیال ہے کہ "موجودہ زمانہ روحانیت کے اعتبار سے بالکل تہی دست اور انتہائے تاریکی کا ہے" اور دوسرے اُن کی اُمید کہ "کیا عجب اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرے اور بنی نوع انسان کو پھر ایک دفعہ نور محمدی عطا کرے کہ بغیر کسی بڑی شخصیت کے اِس بدنصیب دُنیا کی نجات نظر نہیں آتی ۔"

غلام رسول صاحب جن کا خط میں ذکر ہے ہمارے چھوٹے پھوپھا تھے۔ کتاب کے شروع میں میاں جی کے ذکر میں اُن کا ذکر آ چکا ہے۔ وہ اُن دنوں محکمۂ ریلوے میں فیروز پور کے مقام پر تعینات تھے۔ چچا جان کے بڑے معتمد علیہ تھے۔ بڑے معاملہ فہم اور شفیق انسان تھے۔ میرے ساتھ تو بڑی شفقت فرماتے تھے۔ میرے نام کا تلفظ اَعجاز کیا کرتے تھے۔ ایک دن چچا جان کے سامنے اَعجاز کہا تو انہوں نے صحت کرتے ہوئے کہا کہ اس کے نام کا صحیح تلفظ اِعجاز ع کے نیچے زیر ہے۔ خود مجھے بھی اپنے نام کا صحیح تلفظ اُسی دن معلوم ہوا۔

۵۱

ابّا جان کے نام اس خط میں صرف ابر کی بخیلی کی شکایت ہے اور چھٹیوں کے بعد میرے لاہور واپس لاہور واپس پہنچ جانے کی اطلاع

برادرم مکرم السلام علیکم

الحمد للہ کہ آپ کے ہاں بارش ہو گئی۔ یہاں ابھی بارش کا انتظار ہے۔ ابر تو آج صبح خوب آیا تھا مگر بخیل ثابت ہوا۔ البتہ گزشتہ رات آرام میں گزری۔ اِعجاز پہنچ گیا ہے۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کر دیں۔ بچوں کو دعا۔

محمد اقبال لاہور ۸ر جولائی ۲۰ء

اکتوبر ۲۰ء میں ابّا جان کی علالت کی خبر ملی تو مجھے سیالکوٹ بھیج دیا۔ وہاں پہنچ کر ان کی حسبِ خواہش میں نے علالت کی کیفیت سے بذریعہ تار مطلع کیا تو مجھے یہ خط لکھا۔ چونکہ ابّا جان کو مرض سے افاقہ ہو رہا تھا میں نے تار دے دیا کہ آپ آنے کی

زحمت نہ کریں۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا تار ابھی ملا ہے۔ آج اتوار ہے کل کے مقدمات کا انتظام نہیں ہو سکتا لہٰذا میں منگل کے روز سیالکوٹ آؤں گا۔ خدا تعالیٰ جلد فضل کرے۔ مجھے سخت تردد ہو رہا ہے۔ اگر یہ کارڈ تم کو سوموار یا منگل کے روز صبح تم کو مل جائے اور بھائی صاحب کی حالت بھی روبترقی ہو تو مجھے بذریعہ تار مطلع کر دینا تاکہ اطمینان ہو جائے۔ باقی خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب۔

محمدؐ اقبال لاہور ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۰ء

ابا جان نے میرے رشتہ کے لئے کسی گھرانے میں تحریک کرنے کی تجویز کی تھی۔ اس کے جواب میں انہیں یہ خط لکھا۔

حاجی شمس الدین جن کا خط میں ذکر ہے کشمیری برادری سے تھے۔ وہ انجمن حمایت اسلام کے جنرل سکریٹری تھے اور چچا جان سے اُن کے اچھے مراسم تھے۔

میاں جی ہمیشہ گھر میں دودھ کے لئے گائے یا بھینس رکھتے تھے۔ اُس کی دیکھ بھال ملازم سے اپنی نگرانی میں کراتے تھے۔ دو ایک مرتبہ چچا جان نے بھی گائے سیالکوٹ بھجوائی تھیں۔

برادر مکرم السلامُ علیکم لاہور ۳ ؍ نومبر ۱۹۲۰ء

والا نامہ مل گیا ہے۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ حاجی شمس الدین کشمیر گئے ہوئے ہیں۔ ۱۰ ؍ نومبر کو آئیں گے اُن سے خط لکھواؤں گا اتنے عرصے میں آپ لڑکی کے متعلق زیادہ تحقیق کر لیں۔ اگر ممکن ہو کیونکہ آپ نے لکھا ہے ہمیں لڑکی اچھی بتائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا علم لڑکی کے متعلق محض شنید ہے۔ اس سے زیادہ تحقیق مطلوب

ہے۔ کیا لڑکی ڈسکے میں ہے یا کامل پور میں ؟ بہر حال اگر حاجی صاحب جلد نہ آئے یا اُن کو خط لکھنے میں عذر ہوا تو اس اثنا میں میں کوئی اور دوست ان کا تلاش کروں گا جو ان کو خط لکھے اگر یہ بھی نہ ہوا تو پھر خود خط لکھوں گا۔

گائے میں آپ کے لئے منٹگمری سے منگواؤں گا اگر نہ آئی تو اپنی گائے بھیج دوں گا۔ ابھی اس کے بچہ دینے میں دو تین ماہ باقی ہیں بچہ دینے کے بعد ارسال کروں گا۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب

والسلام

محمد اقبال

سیالکوٹ میں کانگریس اور خلافت تحریکوں کا بڑا زور تھا۔ ترک موالات کی تحریک چل رہی تھی۔ سکولوں کا الحاق یونیورسٹی سے توڑ کر انہیں قومی سکول بنائے جانے پر زور دیا جا رہا تھا۔ میرا سب سے چھوٹا بھائی مختار احمد سکول میں پڑھتا تھا۔ ابا جان کا خیال تھا کہ اسے لاہور کے کسی سکول میں داخل کرا دیا جائے۔ انہوں نے چچا جان کو لکھا جس پر انہوں نے جواب میں یہ خط لکھا۔

لاہور ۳۰ دسمبر ۱۹۲۰ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ بہتر ہے آپ اپریل تک انتظار کریں۔ بعد میں ضرورت ہوئی تو مختار کو یہاں کے کسی سکول میں داخل کرا دیا جائے گا گو سکول لاہور کے بھی بہت خراب ہیں اور لڑکوں کی آوارگی کے ممد۔

اسلامیہ کالج کی حالت بدستور وہی ہے اور انجمن کی جنرل کونسل کے اکثر ممبروں کی رائے یہی ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو کالج اپنی موجودہ حالت میں رہے اور یہی تعلیم دے ہاں اگر ضرورت ہو تو ایک نیشنل کالج بھی کھول دیا جائے۔ آئندہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ ہشیار پور کا سکول قومی ہو گیا تھا۔ اب سنا ہے کہ انہوں نے یونیورسٹی سے پھر ملحق کر لیا ہے۔ باقی خدا کے فضل و

کرم سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔ سردی کا بڑا زور ہے بارش مطلق نہیں ہوئی۔

والسلام

محمدؐ اقبال لاہور

۵۵

۱۹۲۰ء کے دسمبر کی تعطیلات گزار کر میں واپس لاہور گیا تو میاں جی نے میری زبانی چچا جان کو پیغام بھجوایا کہ ان کی طبیعت اُداس رہتی ہے وہ میاں جی کی اُداسی کی وجہ سمجھ گئے۔ جواب میں یہ طویل خط لکھا۔

لاہور ۳ر جنوری ۱۹۲۱ء

قبلہ و کعبہ ام السلامُ علیکم

اعجاز کی زبانی آپ کا پیغام پہنچا ہے جس سے معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت اداس رہتی ہے۔ کئی سال ہوئے میں نے ایک کتاب یورپ میں خریدی تھی مگر آج تک اس کے پڑھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ان تعطیلوں میں اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کا آغاز اور اختتام یہ فقرہ ہے۔ "میری کوئی چیز نہیں اور میرے لئے تمام اشیاء کا وجود عدم برابر ہے" یہ ساری کتاب اسی جملے کی تشریح ہے اور حقیقت میں بہت خوب ہے۔ حقیقی شخصیت یہی ہے کہ انسان اپنی اصلی حقیقت کا خیال کر کے تمام تعلقات سے آزاد ہو جائے یعنی بالاتر ہو جائے۔ نبی کریمؐ کی زندگی میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ ان سے زیادہ اپنے عزیزوں سے محبت کرنے والا بلکہ ساری دنیا کو اپنا عزیز جاننے والا اور کون ہوگا؟ لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا تھا۔ جب آپ کو نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ عائشہ کون ہے اور ابوبکر کون ہے نہ یہ کہ محمد کون ہے۔ ہمارے صوفیا نے اس کو فنا سے تعبیر کیا ہے لیکن سچ بات یہ ہے کہ یہ شخصیت یا خودی کا کمال ہے اُسے فنا نہیں کہنا چاہیئے اور انسانی حیات کی یہی کیفیت حیات مابعد الموت کی تیاری ہے۔ لیکن آپ اس نکتے کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ ہمارے عزیزوں میں آپس میں جب بگاڑ ہو جاتا ہے تو ہم جو ان کی صلح و آشتی میں خوش ہوتے ہیں

ان کا بگاڑ دیکھ کر رنجیدہ اور پریشان ہوتے ہیں جب اسی قسم کا بگاڑ اور لوگوں میں ہو جو عام معنوں میں ہمارے عزیز یا رشتہ دار نہیں ہیں تو ہم کو کوئی رنج نہیں ہوتا۔ اور کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ جو آدمی انسانی زندگی کی حقیقت سے آگاہ ہے اُسے معلوم ہے کہ تمام بنی نوع انسان آپس میں عزیز و رشتہ دار ہیں کیونکہ حیاتِ انسانی کی جڑ ایک ہے پھر کیا وجہ ہے کہ چند آدمیوں کے بگاڑ سے جن کو ہم خاص طور پر اپنا رشتہ دار کہتے ہیں ہم کو رنج ہوتا ہے اور باقی لوگوں کے بگاڑ سے ہم پر کچھ اثر نہیں ہوتا حالانکہ عزیز تو حقیقت میں وہ بھی ہیں؟ انسان اس فطری میلان سے مجبور ہے کہ جو آدمی خون کے اعتبار سے ہمارے قریب تر ہیں ان کو اپنا رشتہ دار کہتا ہے اور جو دور ہیں ان سے بے تعلق ہو جاتا ہے حالانکہ خون اور زندگی میں قُرب اور بُعد نزدیکی و دوری کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

اس تقریر سے ظاہر ہے کہ تعلقات کی وجہ سے جو پریشانی ہم کو لاحق ہوتی ہے اس کی بنا اصل میں ناانصافی پر ہے۔ ناانصافی یہ کہ بعض افراد کو قرب خونی کی وجہ سے قریب جاننا اور بعض کو بُعد خونی کی وجہ سے بعید جاننا حالانکہ زندگی کے حقیقت قرب و بُعد سے مُعرّا ہے۔ کامل انسان تمام عالم کے لئے رحمت ہے بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ کامل انسان تعلقات سے بالاتر ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں امید کہ آپ بھی خیریت سے ہوں گے۔ بھائی صاحب کی خدمت میں آداب۔

اسرار خودی کا ترجمہ انگریزی میں ہو گیا ہے۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ جب یہ کتاب ہندوستان میں شائع ہوئی تو یہاں کے صوفیا نے اس پر اعتراض کیا کہ کتاب کا مصنف مسلمانوں کو مغربی خیالات سکھاتا ہے اور ان کو فرنگیت کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے مغرب والے مترجم نے دیباچے میں یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب ایک زبردست آواز ہے جو مسلمانوں کو محمدؐ اور قرآن کی طرف بلاتی ہے اور اس آواز میں صداقت کی آگ ایسی ہے کہ ہم اس کی تعریف کے بغیر نہیں رہ سکتے۔

محمد اقبال

تمام تعلقات سے آزاد ہو جانے یعنی بالاتر ہو جانے کا جو فلسفہ اس خط میں بیان کیا گیا ہے وہ "آں سیلِ سبک سیرم ہر بند گسستم من" کی تشریح معلوم ہوتی ہے واللہ اعلم۔

اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ شائع ہو گیا تھا۔ ترجمہ پروفیسر نکلسن نے کیا جن کا شمار بڑے مستشرقین میں ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے اس ترجمہ کی اشاعت کے بعد ایک مرتبہ قیام سیالکوٹ کے دوران اس ترجمہ کا ذکر میاں جی اور ابا جان سے کر رہے تھے فرمایا نکلسن ہے تو بڑا مستشرق لیکن ترجمہ میں دو ایک فاش غلطیاں کر گیا ہے۔ ایک غلطی بیان کر کے دیر تک ہنستے رہے جو مثنوی کے مصرع "صورتِ طفلاں زنے مرکب کنی" کے ترجمہ میں کی گئی ہے۔ اس مصرع میں "نے" بمعنی Reed استعمال کیا گیا ہے نکلسن نے اسے "زنے" پڑھ کر اس کا ترجمہ woman کیا ہے۔

۵۷

چچا جان کا جو کلام کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہوتا میں اسے ایک بیاض میں نقل کر لیتا تھا۔ کبھی کبھی غیر مطبوعہ کلام بھی اُن کی میز پر پڑا ہاتھ لگ جاتا تو وہ بھی نقل کر لیتا تھا۔ اس طرح میری بیاض میں اُن کے کلام کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ جب کبھی شعر کا ذوق رکھنے والے احباب جمع ہوتے تو اس ذخیرے سے لطف اندوز ہوتے۔ دسمبر ۲۰ء کی تعطیلات میں سیالکوٹ گیا تو ہماری ایسی مجالس میں شامل ہونے والے ایک صاحب کے کوئی عزیز میرٹھ سے آئے ہوئے تھے۔ نام غالباً مشتاق احمد تھا۔ شعر سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لئے ہماری دو ایک مجلسوں میں شریک ہوئے۔ ایک دن مجھے کہا کہ آپ کے چچا اپنے کلام کا مجموعہ شائع کیوں نہیں کرتے۔ بڑے اصرار کے ساتھ مجھ سے خط لکھوایا کہ اگر انہیں اجازت دی جائے تو وہ مجموعہ شائع کرنے پر تیار ہیں۔ تعطیلات کے بعد لاہور گیا تو میرے خط کا یہ جواب لاء کالج کے جانسٹن ہال کے پتہ پر جہاں میری سکونت تھی ملا۔

جواب انگریزی زبان میں دینا اور وہ بھی دوٹوک لہجہ میں ایک طرح سے سرزنش تھی جس کا میں اپنی احمقانہ تحریر کی وجہ سے ہر طرح سزاوار تھا۔ اب مجھے اپنی حماقت پر حیرت ہوتی ہے کہ میں نے بے سوچے سمجھے ایسی درخواست کرنے کی جرأت کیسے کی۔ مشتاق صاحب کی خواہش دل کی دل میں رہ گئی ۔

Lahore

10th Jan. 1921.

My dear Ijaz,

I am afraid I cannot accede to your friend's request for reasons -which it is unnecessary to detail here.

The most important of these reasons is that I am already preparing a collection of poems for publication.

Yours affectionately,

(MUHAMMAD IQBAL)

چچا جان کے اُستاد مولانا میر حسن علیل تھے۔ ابّا جان کو اس خط میں تاکید فرمائی کہ "میری طرف سے شاہ صاحب کی خیریت آپ خود جاکر پوچھیے"۔ شاہ صاحب پنجاب یونیورسٹی کے ممتحنوں میں سے تھے۔ اُن کی رقم یونیورسٹی سے واجب ہوگی جس کے بھجوانے کا خط میں ذکر ہے۔ ذکی شاہ صاحب، جن کا خط میں ذکر ہے۔ شاہ صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ڈاکخانہ میں ملازم تھے۔ تنخواہ تھوڑی تھی اور بچے زیادہ۔ شاہ صاحب اپنی تنخواہ کا ایک حصہ انہیں دے دیتے تھے۔ میں ریاضی کے مضمون میں کمزور تھا۔ سکول کے زمانہ میں مَیں اُن سے ریاضی پڑھا کرتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ میرے استاد کا درجہ رکھتے تھے۔

برادرم مکرم السلامُ علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا الحمدللہ کہ اب آپ کو بالکل آرام ہے۔ مجھے بھی تین چار روز زکام رہا اور ایک شب ہلکا سا بخار بھی ہوگیا۔ اب خدا کے فضل و کرم سے آرام ہے۔ امید ہے کہ جناب قبلہ شاہ صاحب کو بھی اب بالکل آرام ہوگیا ہوگا۔ ان کے روپیہ یونیورسٹی دفتر سے بھیج دیئے گئے ہیں ذکی شاہ صاحب سے کہہ دیجیے گا اور میری طرف سے شاہ صاحب کی خیریت آپ خود جاکر پوچھیے۔ اگر احمد شاہ کا خط محفوظ تو نہیں رہا تو کچھ مضائقہ نہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ بارش بالکل نہیں ہوئی۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کیجیے گا۔

محمدؐ اقبال لاہور ۱۷ جولائی ۲۱ء

لاء کالج کے اخراجات کے لئے مجھے چچاجان سے ۳۰ روپیہ ماہوار ملتے تھے۔اُن دنوں وہ ایک سو روپیہ ماہوار سیالکوٹ بھی بھیجتے تھے۔ایل ایل بی کے امتحان کے لئے داخلہ فیس ادا کرنی تھی جس کے لئے میں نے ابّا جان کو لکھا۔انہوں نے چچاجان کو لکھا تو اس کے جواب میں انہوں نے یہ خط ابّا جان کو لکھا۔شاہ صاحب سے مراد مولانا میر حسن صاحب ہیں۔

برادر مکرم السلامُ علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے الحمدللہ کہ خیریت ہے۔شاہ صاحب کا خط بھی آیا تھا وہ بھی خیریت سے ہیں۔بہت بہتر ہے اعجاز کو روپیہ دے دیا جائے گا اطمینان فرمائیں سردی یہاں بھی کل پرسوں سے کچھ زیادہ ہے۔بارش بالکل نہیں ہوئی البتہ آج مطلع ابر آلود ہے۔

والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔یہ خدا کا خاص فضل ہے کہ ان کی صحت اچھی ہے۔اسرارِ خودی پر انگلستان اور امریکہ کے اخباروں میں ریویو عجیب و غریب شائع ہو رہے ہیں۔دیکھیں جرمنی اور دیگر ممالک اس کی نسبت کیا خیال کرتے ہیں

والسلام

محمدؐ اقبال لاہور ۱۲ جولائی ۲۱ء

ابّاجی پھر ملازمت کی فکر میں تھے۔جھنگ ڈسٹرکٹ بورڈ میں انجینئر کی جگہ کے لئے انہوں نے درخواست دی۔انٹرویو کے لئے وہاں جاتے پر معلوم ہوا کہ انہیں زیادہ

تو ضلع میں دورہ پر رہنا ہو گا اس لئے واپس چلے آئے کہ ضلع گردی اب ان کے بس کی بات نہ تھی چچا جان کو اطلاع دی تو انہوں نے یہ خط لکھا۔

اس میں دو باتیں نوٹ کرنے کے قابل ہیں۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ان کا بھروسہ۔ دوسرے "اسرار خودی" کے متعلق انگلستان کے علمی حلقوں کے تبصرے

لاہور ۲۸ جنوری ۲۱ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط ملا الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ افسوس ہے آپ کو جھنگ جانے آنے کی ناحق تکلیف ہوئی۔ آپ کو اب اگر ملازمت کا خیال ہو بھی تو سوائے سیالکوٹ کے اور جگہ کا خیال دل سے نکال دینا چاہیئے۔ سیالکوٹ میں اگر مل جائے تو غنیمت ہے۔ ضرورتوں کا احساس بعض اوقات آپ کے دل کو ملازمت پر برانگیختہ کرتا ہے مگر خدا پر بھروسہ کرنا چاہیئے انشاء اللہ خود بخود سامان ان کے پورا ہونے کے نکل آئیں گے۔ آپ اطمینان فرمائیں۔ مجھے تو اس کی ذات پر بھروسہ ہے اس واسطے اگرچہ مجھ کو بھی ویسا ہی احساس ہے جیسا کہ آپ کو تاہم طبیعت فکر مند نہیں ہوتی۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔ اسرار خودی کے ریویو انگریزی زبان میں ہیں جو کچھ ہندوستان میں ہوا وہاں بھی ہو رہا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ مگر بحیثیت مجموعی وہاں کے لوگ اس کے خیالات کو بہت اچھا جانتے ہیں۔ مترجم کا خط آیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ کتاب کا استقبال اس ملک میں بہت اچھی طرح ہوا۔ گو بعض خیالات کے متعلق بعض ریویو لکھنے والوں کو غلط فہمی ہوئی۔ ایسا ہونا یقینی ہوتا ہے کیونکہ طبائع میں اختلاف ہے خصوصاً جب کہ زندگی پر ایک نئے نقطہ خیال سے نگاہ ڈالی جائے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں مصنف نے ایشیا والوں کو اور خصوصاً مسلمانوں کو جنگ کی تعلیم دی ہے اور اس کتاب کا ایک سیاسی مفہوم ہے اور اس کے ہر لفظ میں ایک سیاسی قوت مضمر ہے۔ ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ جب ہم اس کتاب کو پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک بڑی زبردست ہستی کی صحبت میں بیٹھے ہیں غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ امریکہ کے اخبارات یہاں نہیں آئے ان میں بھی اسی قسم کے خیالات ہوں گے۔ اس

کتاب کا انگریزی ترجمہ ہو جانے میں خدا کی حکمت معلوم ہوتی ہے مجھے یقین ہے کہ اس سے اس کتاب کے مقاصد کے پورا ہونے میں بڑی مدد ملے گی۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

گائے نے بچہ دیا ہے مگر کچھ بیمار ہو گئی ہے امید ہے دو چار روز تک اچھی ہو جائے گی۔ ڈاکٹر علاج کر رہے ہیں۔ بچوں کو دعا

محمد اقبال

لاہور کے ہندو کالجوں میں عدم تعاون کا زور ہو رہا ہے۔

اس خط کا پہلا پیراگراف حذف کر دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ پہلے بیان کر دی گئی ہے۔

دوسرے پیراگراف میں جس مقدمہ کا ذکر ہے اس کی پیروی کے لئے وہ کشمیر نہ جا سکے تھے اور مقدمہ واپس کر دیا تھا۔

تیسرے پیراگراف میں ایک "معاملہ معلومہ" کا ذکر ہے۔ ان دنوں ریاست کشمیر میں کچھ اصلاحات نافذ کئے جانے کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کی تالیف قلوب کے لئے تجویز تھی کہ چچاجان کو ریاست کی چیف جج کا عہدہ پیش کیا جائے اور سردار جگبندر سنگھ کے چیف منسٹر ہونے کی توقع تھی۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔

لاہور ۱۰ مارچ سنہ ۲۱ء

برادرم مکرم السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔

. . . .

(خط کا یہ حصہ حذف کیا گیا ہے)

جموں کے مقدمے میں تاریخ ۱۰ مارچ ملی تھی مگر میں اس تاریخ پر نہ جا سکتا تھا وسط اپریل کی تاریخ طلب کی جو نہ ملی ۔ اس اثنا میں ایک مقدمہ شملہ کا مل گیا ایک ہفتہ وہاں رہنا ہو گا۔ یہ مقدمہ وسط اپریل میں ہو گا ۔ اس کے بعد ریاست کی طرف سے مجھے تار ملا کہ آپ کی خواہش کے مطابق وسط اپریل ہی کی تاریخ مقرر ہو گی ۔ اب مشکل ہے کہ شملہ کا مقدمہ قبول کر چکا ہوں ۔ آج کشمیر سے ملزموں کی طرف سے خط ملا ہے کہ ریاست سے استدعا کیجیے کہ مقدمہ سری نگر میں ہو آنے جانے کا خرچ موکل ادا کر دیں گے ۔ بہر حال دیکھیں کس طرح ہو سکتا ہے ۔

معاملہ معلومہ کے متعلق سلسلہ چل رہا ہے مگر چیف منسٹر صاحب جموں سے جا رہے ہیں ۔ مہاراجہ اپنی ریاست میں بھی اصلاحات جاری کرنے والے ہیں جن کا اعلان عنقریب ہو گا ۔ اگر چیف منسٹر کی جگہ سردار جوگندر سنگھ چلے گئے تو خوب ہو گا ۔ معاملات پر بہت غور و فکر کرنے کے بعد بھی آخر انہیں تقدیر کے ہی سپرد کرنا پڑتا ہے ۔ انسانی علم و عقل ذرا ذرا سی بات میں اپنی کمزوری اور عجز کا معترف ہے ۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کیجیے ۔ مولوی گرامی صاحب آئے ہوئے ہیں وہ ان کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہیں ۔ دنیا میں پھر بے چینی کے آثار پیدا ہیں ۔ خدا تعالیٰ رحم فرمائے ۔ اعجاز کی منگنی کے متعلق آپ نے کچھ نہیں لکھا ۔ اس کے کپڑوں کے لئے روپیہ بھیج دوں گا ۔

والسلام

محمد اقبال

مرحوم امتیاز میرا منجھلا بھائی اپنا ورکشاپ کھولنے کے لئے سامان خریدنے لاہور گیا تھا ۔ اُس کے لاہور پہنچنے کی اطلاع اس خط میں دی ۔

برادر مکرم   السلام علیکم

آپ کا کارڈ ابھی ملا ہے الحمد اللہ کہ ہر طرح خیریت ہے اس سے پہلے بھی آپ کا کارڈ مل گیا تھا۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔ امتیاز بھی آگیا تھا ابھی اپنے دکان کی چیزیں خریدنے میں مصروف ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے،

والسلام

محمد اقبال لاہور ۲۷ مارچ ۲۱ء

ریاست جموں والے مقدمہ کی جو تاریخ ریاست کے حکام نے مقرر کی اس دن اُن کے ایک اور مقدمے کی پیشی شملہ میں مقرر تھی اس لئے جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہے یہ مقدمہ واپس کر دیا۔

برادر مکرم السلامُ علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ اعجاز امتحان کی تیاری میں مصروف ہے اور مجھے بھی غیر معمولی مصروفیت گزشتہ دنوں میں رہی اس واسطے خط نہ لکھ سکا گو اس سے پہلے ایک کارڈ لکھا تھا جو اُمید ہے پہنچ گیا ہوگا۔ جموں کے مقدمہ کی تاریخ کشمیر میں مانگی تھی مگر ریاست نے نہیں دی۔ ۱۸ اپریل مقرر کی ہے مگر اس تاریخ کو مجھے شملہ جانا ہوگا اس واسطے یہ مقدمہ واپس ہی کرنا پڑے گا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ آج بیمہ مبلغ ایک سو روپیہ کا آپ کی خدمت میں مرسل ہے۔ اعجاز کو ساٹھ روپے کپڑوں کے واسطے دے دیئے تھے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض۔ گھر میں سب کو سلام۔ بچوں کو دعا

محمد اقبال لاہور ۳۰ مارچ ۲۱ء

ابا جان کو میرا رشتہ طے کرنے کی جلدی تھی۔ انہوں نے سیالکوٹ کے ایک گھرانے کا ذکر کرتے ہوئے چچا جان سے مشورہ طلب کیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے یہ خط لکھ کر ایسے معاملے طے کرنے میں عجلت نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ یوں بھی میں ابھی تعلیم پا رہا تھا اس لئے شادی کی کوئی جلدی نہ تھی۔ تلاش رشتہ کے سلسلہ میں یہاں یہ بات بھی بیان کر دی جائے کہ دراصل چچا جان سیالکوٹ سے باہر رشتہ کرنا چاہتے تھے۔ مزید برآں ان کی بڑی خواہش تھی کہ رشتہ کسی سپرد خاندان میں ہو سکے لیکن باوجود تلاش انہیں پنجاب میں کسی مسلمان سپرد خاندان کا سراغ نہ مل سکا۔

لاہور ۳ راپریل ۱۹۳۱ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط پہنچا الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ اعجاز کے متعلق عرض یہ ہے کہ اگر آپ یہ ارادہ مصمم کر چکے ہیں کہ سیالکوٹ کے باہر جانا نہ چاہیئے تو یہ معاملہ جس کے متعلق آپ نے لکھا ہے قابلِ غور ہے اور اگر آپ کا یہ ارادہ مصمم نہ ہو تو سیالکوٹ سے باہر بھی تلاش کرنی ضروری ہے مثلاً امرتسر، لاہور وغیرہ میں۔ چراغ دین کو میں جانتا ہوں وہ بھلا مانس آدمی ہے مگر اس کی اوقات کا انداز موزوں نہ تھا۔ ہاں لڑکیاں اس کی ضرور اچھی ہوں گی شاید اب اس نے افغانستان جانا چھوڑ دیا ہے اور کپڑے کا روزگار شروع کر دیا ہے۔ بہر حال بہت جلد ایسے معاملے کا طے کرنا درست نہیں جب تک تلاش و تجسس پورے طور پر نہ کر لیا جائے۔ خدانخواستہ آپ میں یا آپ کے لڑکے میں کوئی نقص نہیں۔ اچھی جگہ مل سکنے کی توقع ہے بشرطیکہ سیالکوٹ سے باہر بھی آپ کو خیال ہو۔ موجودہ حالات میں میری تو یہی رائے ہے کہ ابھی تلاش کو چھوڑنا نہ چاہیئے اور کم از کم دو تین ماہ تو تلاش کرنی چاہیئے۔ اگر آپ لکھیں تو میں امرتسر و لاہور میں بعض احباب کو لکھوں۔ یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ سیالکوٹ سے باہر بھی خیال رکھنے

ہوں۔ سیالکوٹ میں تو آپ کے مطلب کا کوئی آدمی نہیں۔ مہراں کی لڑکی سے ہو جاتا تو
وہ اور بات تھی۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب
عرض کریں۔ بچوں کو دعا۔

محمد اقبال

جس مقدمہ کی پیروی کے لئے شملہ گئے تھے۔ اس سے واپس آکر ابا جان کو یہ
خط لکھا۔

سیالکوٹ کے میونسپل انتخاب میں ابا جی خلافت کمیٹی کے امیدوار کے طور پر کھڑے
ہوئے لیکن کامیاب نہ ہوئے۔

برادر مکرم السلام علیکم

میں شملہ سے بخیریت واپس آگیا۔ وہاں کام خدا کے فضل سے اچھا ہو گیا اب
۴، ۵ اور ۷ مئی کو ان مقدمات پر بحث ہو گی۔ انشاء اللہ امید کامیابی کی ہے۔ والد
مکرم کی خدمت میں آداب عرض۔ بچوں کو دعا۔ اعجاز سے معلوم ہوا کہ آپ میونسپل انتخاب
میں نہیں آئے۔ لاہور میں خلافت کمیٹی کے نامزد کردہ ممبروں کو بہت کامیابی ہوئی۔

والسلام
محمد اقبال ۲۴ اپریل ۲۱ء

ان دنوں چچا جان کو پھر ایک ملازم کی ضرورت تھی۔ ابا جان کو اس خط میں کوئی
معتبر آدمی تلاش کرنے کے لئے لکھا۔

بیرسٹری کے ابتدائی سالوں میں چچا جان کے ہاں سواری کے لئے ایک گگ گاڑی اور ایک گھوڑا تھا۔ "پرانا نوکر خدا داد" جس کا ذکر خط میں ہے۔ بطور سائیس ملازم تھا۔ یہ نوجوان راولپنڈی کی طرف کا رہنے والا تھا۔ انارکلی والے مکان کے نچلے حصّہ میں اُس کی رہائش تھی۔ گھوڑا گاڑی بھی نچلے حصہ مکان میں رکھے جاتے تھے۔

خط میں جس امتحان کے لئے میرے محنت کرنے کا ذکر ہے وہ ایل ایل کا امتحان تھا

برادر مکرم السلامُ علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے الحمد اللہ کہ سب طرح خیریت ہے۔ یہاں بھی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ اعجاز محنت کر رہا ہے امید ہے کام یاب ہو جائے گا۔ اس کے رشتہ کے متعلق میں نے ایک دو جگہ لکھ رکھا ہے ابھی کوئی جواب نہیں آیا۔ کیا آپ نے بھی کوئی مزید جستجو کی ؟

کچھ عرصہ ہوا میں نے آپ کی خدمت میں لکھا تھا کہ ایک ملازم کی ضرورت ہے اس کی تلاش کیجئے شاید سیالکوٹ سے کوئی معتبر آدمی مل جائے۔ انھوں نے ایک دفعہ ایک آدمی کا پتہ تبلایا تھا۔ میں نے اپنے پرانے نوکر خدا داد کو بھی لکھا ہے وہ راولپنڈی میں ہے ممکن ہے آجائے گو قوی اُمید نہیں ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ کل پٹیالے جاؤں گا ۳۰ر کو واپس پہنچوں گا۔

والسلام

محمّد اقبال لاہور ۲۷ر اپریل ۲۱ء

ایک مقدمہ کی پیروی کے لیے پٹیالے گئے تھے۔ واپس آنے کی اطلاع ابّا جی کو اس خط میں دی۔ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اُن دنوں وہ ایک سو روپیہ ماہوار سیالکوٹ بھیجا کرتے تھے۔ اس میں سے پندرہ روپیہ ہماری منجھلی پھوپھی کریم بی بی کو دینے کی ہدایت

کی۔ وہ اُن دنوں ہمارے ہاں رہتی تھیں۔ وہ ہر ایک کا خیال رکھتے تھے۔

برادرِ مکرم السلامُ علیکم

آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے۔ میں مع الخیر پٹیالے سے واپس آ گیا ہوں۔ طاہر دین آج آپ کی خدمت میں روپیہ ارسال کرے گا۔ اس میں سے پندرہ روپیہ ہمشیرہ کو دے دیجئے والدِ مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔

محمد اقبال لاہور ۲ مئی ۲۱ء

۶۷

میرے رشتہ کے متعلق میاں جی کی رائے تھی کہ جہاں تک ہو سکے سیالکوٹ میں ہی کیا جائے۔ چچا جان نے ابا جان کو جو لکھا کہ سیالکوٹ میں تو آپ کے مطلب کا کوئی آدمی نہیں تو اس سے میاں جی نے یہ سمجھ کر کہ چچا جان سیالکوٹ سے باہر رشتہ کرنا چاہتے ہیں انہیں اپنی رائے سے مطلع کیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے میاں جی کو یہ خط لکھا۔

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ میاں جی کی علالت کی اطلاع ملنے پر وہ بڑے پریشان ہو جاتے تھے۔

میرا ایل۔ ایل بی کا امتحان ہو رہا تھا۔ میاں جی کو میری کامیابی کے لئے دعا کرنے کی بھی تاکید کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دُعا پر بڑا یقین تھا۔

لاہور ۵ مئی ۲۱ء

قبلہ و کعبہ السلامُ علیکم

آپ کا خط (ملا) الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ آپ کی علالت کی خبر معلوم کر کے تردّد (ہوا) بھائی صاحب کا خط بھی آیا تھا اس سے بھی یہ خبر معلوم ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم کرے۔ باداموں کی کھیر آپ کے لئے بڑی مفید ہے پھر آپ نے اُسے کیوں ترک کر دیا اس پر مداومت کرنی چاہیئے۔ گرمی ابھی سے بہت شروع ہو گئی ہے۔ آج کل امتحان کے

بہ رچوں کا بھی زور ہے اور کچہری کا کام بھی اعجاز امتحان دے رہا ہے امید ہے کام یاب ہو جائے گا آپ اس کے لئے دعا کیا کریں رشتہ کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے بالکل مناسب ہے اگر سیالکوٹ میں موزوں رشتہ نہ ملے تو باہر جانا چاہیئے ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

والسلام

محمدؐ اقبال

۶۸

اباجی نے میاں جی کی صحت یابی کی اطلاع دی تو اُن کا تردّد رفع ہوا اور آپ نے اباجان کو یہ خط لکھا۔

برادر مکرم السلامُ علیکم

آپ کا کارڈ ملا جس سے تردد رفع ہوا خدا کا فضل ہے کہ والد مکرم کو بالکل صحت ہوگئی۔ اعجاز کا امتحان ابھی تین چار روز میں ختم ہوگا اس کے بدست تمام چیزیں ارسال خدمت ہوں گی۔ ایک گھی کا کنستر بھی اس کے ہاتھ مرسل ہوگا اس کے پاس اسباب بہت ہے اگر امتیاز پھر آیا تو اُس کے ہاتھ بھیج دیا جائے گا۔ مگر معلوم ہوتا ہے وہ چلا گیا ہے مجھے اس کے آنے کی اطلاع نہیں ہوئی مگر کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ سنا ہے بھائی کرم الٰہی اور فضل حق نے آپ کے الیکشن کے معاملے میں بڑی مدد کی ہے۔

باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔

والسلام

محمدؐ اقبال لاہور ۹ مئی ۲۱ئ

ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان سے فارغ ہو کر میں سیالکوٹ چلا گیا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ انشاء اللہ ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں نے خط لکھ کر دریافت کیا کہ کامیابی کی صورت میں مجھے کہاں پریکٹس کرنی چاہیئے۔ جواب میں ان کا یہ خط ملا۔

لاہور ۱۰ جون ۱۹۲۱ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے۔ نتیجہ جون کے آخر میں غالباً نکل جائے گا تم اس وقت تک انتظار کرو اور دیوانی اور فوجداری ضابطہ کا خوب مطالعہ کرو۔ جولائی اور اگست لاہور رہ کر تھوڑا بہت کام سیکھ لو بعد میں تم کو کسی جگہ بھیجا جائے گا۔ مجھے پہلے سے اس بات کی فکر ہے خیال ہے کہ شاید تمہارے لئے چکوال (ضلع جہلم) کی سب ڈویژن اچھی ہو۔ اتفاق سے وہاں کے سب ڈویژن افسر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس اور منصف تینوں مسلمان ہیں اور تینوں میرے احباب میں سے ہیں۔ علاوہ اس کے جہلم کے ضلع کا کام میں نے خصوصیت سے اچھا کیا ہے۔ میرے جاننے والے لوگ بھی وہاں ہوں گے یعنی مقدمہ باز جماعت میں۔ مگر یہ فیصلہ آخری نہیں ابھی دیگر احباب سے مشورہ کرنا باقی ہے جن کی اس معاملے میں مجھ سے زیادہ صائب رائے ہے۔ چکوال بھی خطوط لکھ کر دریافت کروں گا۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا تھا مضمون واحد ہے۔

والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

محمد اقبال

ایل ایل بی کے امتحان کا نتیجہ جون کے آخر میں نکلا اور میں اللہ تعالےٰ کے فضل سے اس میں کامیاب ہوگیا۔ پہلے تو چچا جان کا خیال تھا کہ مجھے چکوال ضلع جہلم میں پریکٹس کرنی چاہیئے۔ بعد میں اپنے احباب سے مشورے کے بعد انہوں نے طے کیا کہ دو تین ہفتے شیخ گلاب دین وکیل کے ساتھ لاہور کی ضلعی عدالتوں میں کام دیکھنے کے بعد فی الحال سیالکوٹ میں پریکٹس کرنا بہتر ہوگا۔ چنانچہ میں نے سیالکوٹ میں پریکٹس شروع کر دی تھی۔ سیالکوٹ میں اُن دنوں سیاسی تحریکوں کانگرس اور خلافت کی گرم بازاری تھی۔ شہر کے اکثر وُکلاء ان تحریکوں میں شامل تھے اور نوجوان وکلا کا گروپ تو پیش پیش تھا۔ چنانچہ میں نے بھی خلافت تحریک میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔ ابا جان نے اس کے متعلق چچا جان کو لکھا تو اُن کی طرف سے یہ جواب آیا۔

لاہور ۱۴ دسمبر ۲۱ء

برادر مکرم السلامُ علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ امرتسر سے بھی جواب آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ چار پانچ روز کے بعد مفصل حالات لکھے جائیں گے۔ سو مفصل جواب آنے پر آپ کی خدمت میں عرض کروں گا۔ اگر اعجاز آپ کی رائے سے اتفاق کر گیا تو بہتر ورنہ امرتسر میں سلسلہ جنبانی جاری رکھی جائے گی۔ ملک محمد دین صاحب نے ابھی تک خط کا جواب نہیں دیا معلوم ہوتا ہے وہ کرنال میں نہیں ہیں آج میں نے ان کو بھی خط لکھا ہے۔

اعجاز کو چاہیئے کہ وہ پہلے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے پھر ملک کی تحریکوں میں شامل ہو خلافت کا کام کرنے سے میں اُسے روکتا نہیں کیونکہ یہ بات قلب کی حالت پر منحصر ہے البتہ پہلے اپنے کام میں پختہ ہو جانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ خلافت کمیٹیوں کے بعض ممبر ہر جگہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتے وہ بظاہر جوشیلے مسلمان معلوم ہوتے ہیں لیکن در باطن اخوان

الشیاطین ہیں اسی وجہ سے میں نے خلافت کمیٹی کے سکرٹری شپ سے استعفا دے دیا تھا۔ اس استعفے کے وجوہ اس قابل نہ تھے کہ پبلک کے سامنے پیش کئے جاتے لیکن اگر پیش کئے جا سکتے تو لوگوں کو سخت حیرت ہوتی۔ بہرحال اعجاز خود سمجھدار ہے۔ گزشتہ رات لاہور میں بھی بہت سی گرفتاریاں ہوئیں اور کلکتہ میں تو معلوم ہوتا ہے قیامت برپا ہے۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض۔

اُن کے لئے کستوری کا نافہ منگوایا ہے۔ ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیئے کہ کستوری افیون میں کس طرح ملائی جائے

والسلام

محمد اقبال

خط کا پہلا حصہ تو میرے رشتہ کے متعلق ہے۔ انہوں نے امرتسر کے کسی گھرانے کے حالات معلوم کرنے کے لئے اپنے کسی ملنے والے کو لکھا ہوا تھا۔ اسی طرح ملک محمد دین صاحب (کرنل مجید ملک مرحوم کے والد) کو جو اُن کے احباب میں سے تھے اور اُن دنوں شاید نواب کرنال سے متعلق تھے اچھا رشتہ تلاش کرنے کے لئے لکھا ہوا تھا۔ ابا جان نے سیالکوٹ کے کسی گھرانے کا ذکر کیا ہوگا۔ یہ بات نوٹ کرنے والی ہے کہ رشتہ کے سلسلہ میں اس خط میں انہوں نے میری رائے کو مقدم قرار دیا ہے۔

سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کے متعلق اُن کے خیالات خط کے دوسرے پیراگراف میں لکھے گئے ہیں۔ خلافت کمیٹیوں کے بعض اراکین کے متعلق انہوں نے جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ نوٹ کرنے کے قابل ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ رائے اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر قائم کی ہوگی۔

میاں جی کو ڈاکٹر نے دوائی کے طور پر کستوری میں تھوڑی سی افیون ملا کر گولیاں استعمال کرنے کو کہا تھا۔ ان کے لئے کستوری کا نافہ منگوانے کی اطلاع دی ہے۔

سیالکوٹ میں پریکٹس کرتے مجھے چار پانچ مہینے ہو گئے۔ اوّل تو یہ مختصر عرصہ ایک نووارد کے لئے وکالت کے میدان میں قدم جمانے کے لئے کافی نہ تھا۔ دوسرے سیاسی تحریکوں کی وجہ سے وکالت کے کاروبار میں اُن دنوں مندا تھا۔ اس لئے اس پیشہ میں میرا دل نہ لگا۔ اُنہیں دنوں میرے مرحوم دوست سیّد میر افضل علی نے جو انکم ٹیکس کلکٹر تھے مجھے اطلاع دی کہ اُن کے محکمہ میں انکم ٹیکس کلکٹر کی دو ایک آسامیاں نکلنے والی ہیں۔ اُن دنوں مسٹر ڈارلنگ انکم ٹیکس کمشنر تھے جو چچا جان کے دوست تھے۔ میں نے یہ اطلاع اُن کو دی اور لکھا کہ میں اس جگہ کے لئے کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ جواب میں اُن کا یہ خط ملا۔

خط میں "نواب صاحب" سے مُراد نواب ذوالفقار علی خاں صاحب ہیں۔ چودھری محمد حسین جو بعد میں چچا جان کے قریبی دوست بن گئے اُن دنوں نواب صاحب کے صاحبزادگان کے اتالیق تھے اور نواب صاحب ان کو سرکاری ملازمت دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

لاہور ۱۷ جنوری ۲۲ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے۔ بہتر ہے تم کوشش کرو اور عرضی کی ضرورت ہے تو عرضی دے دو میں بھی جہاں تک ممکن ہوگا کوشش کروں گا۔ انگریز ان دنوں میں صرف انہیں لوگوں کو ملازمت دیتے ہیں جنہوں نے زمانہ جنگ میں کوئی خدمات کی ہوں۔ بہرحال کوشش کرنا ضروری ہے۔ تھوڑا عرصہ ہوا ہے۔ نواب صاحب چودھری محمد حسین کے لئے کوشش کر رہے تھے مگر ان کو ناکامی ہوئی تم تحقیق کر لو کہ جو آگاہی تمہیں ملی ہے درست ہے۔ میں ڈارلنگ صاحب سے خود بھی کہوں گا اور نواب صاحب سے بھی کہلواؤں گا۔ وہ پرسوں دہلی گئے ہیں آٹھ دس روز کے بعد آئیں گے پھر ان سے مشورہ کرنے کے بعد تم کو لکھوں گا۔

تم مجھے پھر یاد دلانا۔ باقی رہا پیشہ وکالت سو موجودہ صورت میں تو جو تم کہتے ہو ٹھیک ہے۔ علاوہ اس کے اس پیشے میں ابتدا میں بہت سی دقتوں کا سامنا ہوتا ہے مگر آئندہ زمانے میں اس پیشے کے بہت سے امکانات ہیں بشرطیکہ مزید اصلاحات گورنمنٹ نے منظور کرلیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے

والسلام

محمد اقبال

چچا جان نے مجھے تحقیق کرنے کو لکھا تھا کہ نئی آسامیاں نکلنے کی خبر درست بھی ہے یا نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ خبر کے درست ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس پر ان کا یہ خط ملا۔

خط میں مسٹر مارٹن اور مسٹر وُلنر سے سندات حاصل کرنے کو لکھا ہے۔ اوّل الذکر مسٹر ہنری مارٹن اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ اس کالج میں تعلیم پانے کے زمانہ میں میں مارٹن ہسٹاریکل سوسائٹی کا سکریٹری تھا۔ دو ایک اور طلباء کی سوسائیٹیوں کا عہدہ دار بھی تھا۔ مارٹن صاحب مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے اور میرے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے۔ مسٹر وُلنر پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ وہ بھی مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے کیونکہ میں یونیورسٹی ڈبل کمپنی کا ممبر تھا جس کے وہ کمانڈنگ افسر تھے۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے۔ تم بے شک کوشش کرو۔ مسٹر مارٹن اور ولنر صاحب سے بھی سندات حاصل کرلو اور جب وقت آئے تو ایک تحریری عرضی دینا جس میں تمہارے ابا جان کی خدمات کا بھی ذکر ہو۔ وہ عرضی تم میرے پاس بھیج دینا میں اپنے سفارشی خط کے ساتھ ڈارلنگ صاحب کے پاس بھیجوں گا۔ وہ میرے انگلستان کے زمانہ کے واقف ہیں اور

میری بہت عزت کرتے ہیں مگر ملازمت وغیرہ کے معاملے میں انگریزوں کی واقفیت وغیرہ پر اعتماد کرنا ٹھیک نہیں۔ سعی پورے طور پر کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کو آج کل کسی قدر شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب اس شک میں ہمارے ہم وطن بھی انگریزوں کے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ اس وقت تو بالعموم انہیں مسلمانوں کو ملازمت کے لئے پسند کیا جاتا ہے (خاص کر اعلیٰ ملازمتوں کے لئے) جن کی اسلامیت حکومت کے خیال میں کمزور ہو اور اس کمزوری کا نام وسعت خیال یا لبرلزم رکھا جاتا ہے۔

باقی رہی وکالت سو یہ اللہ پر توکل رکھنے والوں کا پیشہ ہے اگر کسی مہینے میں آمدنی نہ ہو تو ابتدا میں سخت گھبراہٹ ہوتی ہے مگر رفتہ رفتہ اس کی عادت ہو جاتی ہے بڑے بڑے پرانے اور مشہور کام کرنے والوں کو بھی گاہے ماہے یہ تجربہ ہو جایا کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ رازق ہے ایک دو ماہ کام نہ آئے تو تیسرے مہینے کسر نکال دیا کرتا ہے۔ تم محنت کرتے جاؤ خواہ کام آئے نہ آئے کتابیں قانون کی پڑھتے رہو۔ خاص کر پنجاب ریکارڈ جب کام آنا شروع ہو گا تو پڑھنے کی فرصت نہ ہو گی۔ مگر گھبراؤ نہیں کام ضرور آئے گا۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کرنا۔ مولوی گرامی صاحب ان کو سلام کہتے ہیں۔

محمدؐ اقبال لاہور ۱۹ جنوری ۲۳ء

خبر کی مزید تصدیق کے لئے میں نے میر افضل علی صاحب کو بھی خط لکھا تھا۔ اُن کا جواب آیا تو میں نے چچا جان کو بھیج دیا۔ اس خط کے جواب میں ان کا یہ خط موصول ہوا

لاہور ۲۸ جنوری ۲۳ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ گھر میں سب طرح سے خیریت ہے۔ گزشتہ رات تمہاری پھوپھی کا انتظار رہا اب تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ ان کا ارادہ بدل گیا۔ میر افضل علی

کا خط میں نے دیکھ لیا ہے جو اس خط میں بند کرکے واپس کرتا ہوں تمہیں شاید اس کی ضرورت پڑے۔

ڈارلنگ صاحب کی بیوی کا خط کل مجھے آیا تھا انہوں نے ۱۷ فروری (اتوار) کو مجھے لنچ پر بلایا ہے۔ معلوم نہیں ڈارلنگ صاحب خود بھی اس روز لاہور میں ہوں گے یا باہر بہر حال اگر اس روز اور لوگ وہاں نہ ہوئے تو میں ڈارلنگ صاحب سے زبانی کہوں گا ورنہ بعد میں تمہارے لئے ان کو خط لکھوں گا۔ نواب صاحب سے اس موقع پر کہلوانا مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ وہ پہلے چودھری محمد حسین کے لئے کہہ چکے ہیں لیکن میں خود تمہارے لئے جہاں تک ممکن ہوگا کوشش کروں گا۔ ولز صاحب کو خط لکھ کر سارٹیفیکیٹ لے لو یا ایک روز آکر ان سے مل لو۔ میں اپنا خط تمہاری عرضی کے ہمراہ بھیجوں گا جس میں سب حالات لکھ دوں گا اور یہ بھی دریافت کرلوں گا کہ اگر وہ تم کو دیکھنا چاہیں تو اطلاع دیں۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔ اپنے ابا جان سے میرا السلام کہنا۔ والسلام

محمد اقبال

تعمیل ارشاد میں میں لاہور گیا۔ مسٹر مارٹن اور مسٹر ڈولز سے ملا۔ اُن سے اپنی درخواست کی تائید میں خطوط حاصل کئے اور درخواست دے دی۔ اُن خطوط کا تو کیا اثر ہونا تھا چچا جان کی وجہ سے ڈارلنگ صاحب نے مجھے منتخب کرلیا اور زمین بیٹھنے کی ٹریننگ کے لئے پشاور تعینات کر دیا۔

ملازمت تو آسانی سے مل گئی لیکن پشاور میں ٹریننگ کئی وجوہات سے ٹیڑھی کھیر ثابت ہوئی۔ ایک تو پشاور شہر میں رہائش کا مناسب انتظام نہ ہو سکا۔ میرے ماموں غلام نبی صاحب اُن دنوں ملٹری ورکس میں سب ڈویژنل افسر تھے اور جمرود چھاؤنی میں

تعینات تھے جو پشاور سے کئی میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مجبوراً ان کے ہاں قیام کیا۔ صبح ان کے سائیکل پر پشاور میں واقع انکم ٹیکس کے دفتر جاتا اور دفتر بند ہونے کے بعد سائیکل پر ہی جمرود واپس آتا۔ جمرود اور پشاور کے درمیان سڑک تو اچھی تھی۔ لیکن سائیکل پر اتنے میل آنے جانے کی مشقت بڑی کٹھن تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ مہینہ رمضان کا تھا۔ اُن دنوں شعائر اسلام سے اتنی بیگانگی نہ تھی جتنی اب ہے۔ صوبہ سرحد میں تو خاص طور پر ماہِ صیام کا احترام کیا جاتا تھا۔ دن کے اوقات میں پشاور میں کھانے پینے کے لئے کچھ ملنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ اِدھر میرے ماموں جان کٹر قسم کے مذہبی آدمی تھے۔ اِن حالات میں مَیں اگر روزہ نہ رکھتا تو فاقہ کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روزے سے روزانہ اتنے میل سائیکل سواری سے ہفتہ میں دو تین دفعہ مجھے اختلاجِ قلب کی شکایت ہوئی۔ ماموں جان نے سائیکل سواری کی ممانعت کر دی۔ اس کی بجائے کرایہ کے تانگہ کا انتظام کیا گیا جو صبح مجھے پشاور لے جاتا اور دفتر بند ہونے کے بعد واپس جمرود لے آتا۔ پشاور کے تانگے تو مشہور ہیں۔ آرام دہ اور تیز رفتار۔ ملٹری ایریا ہونے کی وجہ سے سڑک بڑی اچھی حالت میں تھی۔ اُس پر تانگہ میں سواری کا بڑا لطف آتا۔ لیکن جب یہ یاد آتا کہ تانگے کا روز کا کرایہ میرے ٹریننگ الاؤنس (۲۵۰ روپیہ ماہوار) سے زیادہ ہے تو سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ میں نے تو اختلاج کی شکایت کا ذکر ابا جان کے خط میں نہ کیا لیکن ماموں جان نے کیا ہوگا۔ وہاں سے یہ خبر لاہور پہنچی تو چچا جان نے مجھے یہ خط لکھا۔

برخوردار اعجاز احمد طال عمرہٗ

بھائی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو ۱۱ روز میں دو دفعہ اختلاجِ قلب کی شکایت ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید اس کا باعث بائی سیکل کی متواتر سواری ہے تم کو چاہیئے کہ بائی سیکل کی سواری کچھ دنوں کے لئے بالکل ترک کر دو اور اب تو تمہیں شاید اس کی ضرورت بھی نہ پڑے۔ اس کے علاوہ تم اپنا مفصل حال لکھو تو میں تمہارے لئے یہاں سے کوئی نسخہ تجویز کرا دُوں۔ کسی عمدہ ٹانک کا استعمال ضروری ہوگا۔ اس قسم

کی شکایت مجھے بھی زمانہ طالب علمی میں تھی ۔ گھبرانا نہیں چاہیئے ۔ اللہ تعالیٰ شفا دے گا ۔

محمد اقبال لاہور ۱۲ر مئی ۲۲ء

اُن کے خط کے جواب میں میں نے لکھا کہ سائیکل سواری تو بند کر دی ہے اور صحت کے لحاظ سے اب کوئی خاص شکایت نہیں ۔ پشاور میں ایک اور تکلیف یہ تھی کہ وہاں کے انکم ٹیکس کلکٹر جن سے ٹریننگ لینی تھی عیسائی تھے ۔ وہ ہندو مذہب ترک کر کے عیسائی ہوئے تھے ۔ شاید اس لئے مسلمانوں سے ان کا تعصب دو آتشہ تھا ۔ ان دنوں میرے علاوہ ایک اور انکم ٹیکس کلکٹر بھی پشاور میں زیرِ ٹریننگ تھے ۔ اگرچہ ہم دونوں انہیں کی طرح انکم ٹیکس کلکٹر تھے لیکن ہمارے ساتھ اُن کا رویہ غیر ہمدردانہ ہی نہیں آمرانہ تھا ۔ اُن کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہماری تقرری کو ناپسند کرتے ہیں ۔ میں نے اپنے خط میں اس تکلیف کا بھی ذکر کیا تو اُن کی طرف سے یہ بڑا مشفقانہ جواب ملا ۔

لاہور ۱۳ر مئی ۲۲ء

عزیزم اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط ملا الحمد للہ کہ کوئی خاص شکایت تم کو نہیں مجھے اس کا بڑا تردد ہو رہا تھا ۔ کوئی فکر نہ کرنا اگر تم کام کر سکتے ہو تو کرو ورنہ کچھ پروا نہیں آخر تمہارے ہاتھ میں ایک مفید پیشہ ہے جس سے تم فائدہ اٹھا سکتے ہو ۔ رزقِ انسان کا عمر و زید کے ہاتھوں میں نہیں کے خدا کے ہاتھ میں ہے ۔

رزق از وے جو مجو از زید و عمر
مستی از وے جو مجو از بنگ و خمر

تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کرنا چاہیئے اور ہر قسم کا فکر دل سے نکال دینا

چاہیئے۔ خدا تعالیٰ کارساز ہے اور انسان کا فکر ہی اس کے لئے باعث آزار ہے۔ بالفرض اگر تم کو اپنی موجودہ مہم میں کامیابی نہ ہوئی تو بھی کیا۔ خدا تعالےٰ رزق کا کوئی اور سامان پیدا کر دے گا۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ غرض یہ ہے کہ انسان کو اپنی صحت کی حالت کے مطابق اپنے فرائض کی ادائیں کوتاہی نہ کرنا چاہیئے اور نتائج خدا کے سپرد کر دینے چاہیئے۔

ڈارلنگ صاحب نے حال میں بیچارے منور کو موقوف کر دیا ہے اس کو انکم ٹیکس کلکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔

محمد اقبال

منور صاحب جن کا اس خط میں ذکر ہے لاہور کے ایک سرکردہ مسلم خاندان کے نوجوان تھے۔ وہ مجھ سے پہلے انکم ٹیکس کلکٹر مقرر ہوئے تھے۔ بعد میں سُنا کہ وہ بھی ہمارے "استاذ" کے کشتۂ ستم ہوئے تھے۔ واللہ اعلم

۷۶

لکھنے کو تو میں نے چچا جان کو لکھ دیا کہ صحت کے لحاظ سے مجھے اب کوئی خاص شکایت نہیں لیکن روزانہ روزے سے جمرود سے پشاور آنے جانے کی جسمانی کوفت اور دفتر کے اوقات کی ذہنی کوفت مل جُل کر میرے اعصاب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ جسمانی کوفت تو شاید میں جھیل بھی جاتا لیکن ذہنی کوفت ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ رمضان کے آخری عشرے میں مجھے پھر تین چار مرتبہ اختلاج کی شکایت ہوئی۔ اور اس عشرے کے آخری دنوں میں انگریزی[1] محاورے کا وہ روائتی آخری تنکا اونٹ پر لادا گیا جس نے اُس کی کمر توڑ کے رکھ دی۔ ہوا یوں کہ ماہِ رمضان کے اختتام پر عید کی چھٹیاں جو اُس سال غالباً تین تھیں قریب آگئیں۔ جن حالات میں سے میں گزر رہا تھا۔ اُن حالات میں عید کے موقع پر گھر جانے کی خواہش قدرتی بات تھی۔ میں نے کلکٹر صاحب بہادر سے

[1] The last straw to break the camels back

اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے اُن چھٹیوں میں سیالکوٹ جانے کی اجازت طلب کی۔
انہوں نے نہایت متکبرانہ انداز میں فرمایا

There are no holidays in the income tax department. You proceed to Mardans and in these days check the accounts of some assessees

(انکم ٹیکس کے محکمہ میں کوئی چھٹیاں نہیں ہوتی۔ تم مردان چلے جاؤ۔ اور کچھ ٹیکس دہندگان کے حسابات کی پڑتال کر آؤ)۔ ان کا یہ حکم میری درخواست منظور نہ کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ ورنہ عید کی چھٹیوں میں مردان کے ٹیکس دہندگان کے دفاتر کیسے کھلے ہوتے؟ دوسرے اُن کا اندازِ تخاطب ایسا تھا جیسے اپنے چپڑاسی کو حکم دے رہے ہوں مجھے چچا جان کی بات یاد آئی۔ مجھے قانون کے پیشے کی طرف راغب کرنے کے لئے ایک مرتبہ فرمایا۔
"جن دنوں میں گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔ ایک دن پرنسپل نے طالبعلموں کی حاضری کے سلسلہ میں میرے ساتھ اس انداز میں بات کی جیسے اپنے کلرک سے کر رہا ہو۔ اسلئے اُسی دن سے میری طبیعت ملازمت سے متنفر ہوگئی اور میں نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہوسکے گا میں ملازمت سے احتراز کروں گا۔" کلکٹر صاحب تو مجھے حکم دے کر دفتر سے چلے گئے۔ میں نے ملازمت سے اپنا استعفیٰ لکھا اور اُن کے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کے حوالے کر کے عید سے پہلے واپس سیالکوٹ پہنچ گیا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ چچا جان کو خبر ملی تو اُن کی بے پایاں شفقت کا ثبوت اس تسلی نامے میں ملا۔

لاہور ۸ جون ۲۳ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

بعد دعائے واضح ہو مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ زندگی کی دوڑ میں داخل ہوتے ہی تمہیں خرابیٔ صحت کا سامنا ہوا جس کی وجہ تم کو اپنے پروگرام میں تبدیلی کرنی پڑی۔ مگر گھبرانا نہ چاہیئے۔ انشاءاللہ تمہاری صحت جلد اچھی ہو جائے گی۔ زندگی

کو باقاعدہ بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے اور جوانی کی قوت سے یہ فائدہ اٹھانا چاہیئے
کہ صحت دیر تک قائم رہے ۔ میرے نزدیک صحت جسمانی و روحانی کی سب سے بڑی ضامن
مذہبی زندگی ہے میں نے تم کو لکھا بھی تھا کہ قرآن پڑھا کرو اور جہاں تک ممکن ہو نماز
میں بھی باقاعدہ ہو جاؤ تو سبحان اللہ مگر قرآن پڑھنے پر میں زیادہ اصرار کرتا ہوں کہ اس
کے پڑھنے کے فوائد میرے تجربے میں آچکے ہیں ۔ اس کے علاوہ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنا
اکسیر ہے سیالکوٹ میں تو صرف دو آدمی ہیں جن کی زندگی اور صحبت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے
یعنی تمہارے دادا اور شاہ صاحب ۔ کبھی کبھی شاہ صاحب کی خدمت میں چلے جایا کرو ۔ کیا
اچھا ہو کہ صبح ہر روز ان کے ساتھ پھرنے کے لئے چلے جایا کرو ۔ یہ باتیں بظاہر معمولی
ہیں مگر کچھ عرصے کے بعد ان کے فوائد تم کو خود بخود معلوم ہو جائیں گے ۔ باقی جہاں تک
ممکن ہو زندگی کو سادہ بنانے کی کوشش کرو ۔ تم نے مجھ سے مسواک کے متعلق سوال کیا
تھا ۔ میری مراد اس سے دیسی مسواک تھی نہ انگریزی طرز کے منجن ۔ یورپ کی بنی ہوئی چیز
خوب صورت ضرور ہوتی ہے مگر اس میں ایک اخلاقی زہر ہوتا ہے جس کا اثر آج کل کے
مادی طبیعت رکھنے والے انسان فوراً محسوس نہیں کر سکتے ۔ میں نے بھائی صاحب کو لکھا
تھا کہ اگر اعجاز چاہے تو سیالکوٹ سے چند روز کے لئے لاہور آجائے یہاں کسی ڈاکٹر
سے مشورہ کیا جائے ۔ تم تسلی رکھو مجھے یقین ہے کہ زندگی میں ذرا سی باقاعدگی تمہاری صحت
کو اچھا کر دے گی ۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے ۔

والسلام

محمد اقبال

اس خط میں ارشاد ہوا کہ " بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنا اکسیر ہے لہٰذا میاں جی
اور شاہ صاحب (مراد مولانا میر حسن صاحب) کی صحبت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے "۔ میاں جی
تو گھر میں ہی تھے ۔ تعمیل ارشاد میں میں نے اُن کے پاس التزام کے ساتھ بیٹھنا شروع
کر دیا خصوصاً اُس وقت جب وہ اسرار خودی یا رموز بیخودی جو اکثر ان کے زیر مطالعہ رہتیں
پڑھ رہے ہوتے ۔ میاں جی مثنویوں کو اُونچی آواز میں رک رک کر پڑھتے تھے اور اکثر ساتھ

سانحہ روتے جاتے تھے۔ میں پاس جاکر بیٹھ جاتا۔ تھوڑی دیر بعد فرماتے اب تم سناؤ تو میں پڑھ کر سناتا مجھے یاد ہے ایک دن میں انہیں رموزِ بیخودی سے "سلسلے مثلِ قضائے مبرمے" والے اشعار پڑھ کر سنا رہا تھا۔ میاں جی بڑے رقیق القلب تھے۔ جب میں نے "اے صراطت مشکل از بے مرکبی۔ من چہ گویم چوں مرا پرسد نبی" پڑھا تو میاں جی کے آنسو بہنے لگے اور "بر پدر این جورِ نازیبا مکن۔ پیشِ خواجہ بندہ را رسوا مکن" والے شعر پر تو روتے روتے اُن کی حالت غیر ہو گئی۔ اس پر بھابھی جی" (میری والدہ محترمہ) نے سختی سے مجھے "میاں جی کو رُلانے" سے منع کر دیا۔ اُن کی صحبت سے مستفید ہونے کا ایک موقع رات کو سوتے وقت اُن کے پاؤں دابنے کے وقت ملتا۔ اس وقت کی گفتگو مختلف موضوعات پر سادہ اور دل نشین انداز میں ہوتی۔ باتوں باتوں میں پتے کی بات کہہ جاتے بالخصوص جب میری کسی فروگذاشت پر تنبیہ مقصود ہوتی۔

جب میں سیالکوٹ میں تعلیم پاتا تھا بالخصوص مرے کالج میں تعلیم کے دو سالوں میں شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا اکثر موقعہ ملتا تھا۔ کیونکہ اُن کے مکان پر میں اُن سے فارسی پڑھنے جاتا تھا۔ تعلیم کے لئے لاہور چلا گیا تو پھر کبھی چھٹیوں میں سیالکوٹ آتا ہوتا تو سلام کے لئے یا چچا جان کا پیغام یا کوئی تحفہ پہنچانے کے لئے دو ایک بار ان کی خدمت میں جانا ہوتا۔ اس خط میں چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ "کبھی کبھی شاہ صاحب کی خدمت میں چلے جایا کرو۔ کیا اچھا ہو کہ صبح ہر روز اُن کے ساتھ پھرنے کے لئے جایا کرو۔" شاہ صاحب بلا ناغہ صبح پیدل اپنی ہمشیرہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے قبرستان جایا کرتے تھے جو شہر سے خاصے فاصلہ پر تھا۔ میں پیدل چلنے سے ہمیشہ جی چراتا رہا ہوں۔ اس لئے اپنی اس کم ہمتی کی وجہ سے "صبح ہر روز اُن کے ساتھ پھرنے کے لئے جایا کرو" کی تعمیل نہ کر سکا۔ اس خط کے ایک ہفتہ بعد اُن کا ایک اور خط میرے نام آیا (اس کا ذکر آگے آئے گا) جس میں شاہ صاحب کو چچا جان کا ایک پیغام پہنچانے کا ارشاد تھا۔ پیغام پہنچانے کے بعد میں نے کبھی کبھی حاضرِ خدمت ہونے کی اجازت

طلب کی تو فرمایا آپ نے دروازے پر کوئی دربان بیٹھا دیکھا ہے ۔ یہ شاہ صاحب کے بات کرنے کا انداز تھا۔ مطلب یہ تھا بیشک آیا کرو تمہیں منع کس نے کیا ہے ۔ اس کے بعد میں ہفتہ عشرہ میں دو ایک بار حاضر ہوتا ۔ اکیلے کتاب خوانی میں مصروف ہوتے تو زیادہ گفتگو نہ ہوتی۔ میاں جی اور چچا جان کی خیر خیریت پوچھ لینے یا کوئی اِدھر اُدھر کی بات ہو جاتی اُن سے علمی گفتگو کرنے کی تو مجھ میں قابلیت تھی نہ جرأت ۔ ہاں اگر کبھی کسی کو فارسی یا عربی نظم پڑھا رہے ہوتے تو مختلف اساتذہ کے بیسیوں اشعار سناتے ۔ وہ علم کا ایک بحرِ زخار تھے ۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائیں ۔

اس خط میں یہ بھی فرمایا کہ " میں نے تم کو لکھا بھی تھا کہ قرآن پڑھا کرو اور جہاں تک ممکن ہو نماز میں بھی باقاعدہ ہو جاؤ تو سبحان اللہ مگر قرآن پڑھنے پر میں زیادہ اصرار کرتا ہوں کہ اس کے پڑھنے کے فوائد میرے تجربہ میں آ چکے ہیں ۔" قرآن کریم ناظرہ تو مدرسے میں داخل ہونے سے پہلے گھر پر میں نے ختم کر لیا ہوا تھا لیکن پھر سکول اور کالج میں تعلیم کے دوران قرآن کریم دہرانے کی توفیق ہی نہ ہوئی اس لئے روانی سے تلاوت نہ کر سکتا تھا اور زیر زبر کی غلطیوں کا بھی احتمال تھا ۔ چچا جان کے قرآن پڑھنے کی تاکید فرمانے پر میں نے ارادہ کیا کہ کسی حافظ قرآن سے قرآن کریم دو ایک بار دہرا لیا جائے ۔ میری خوش قسمتی سے اُن دنوں سیالکوٹ کی ایک مسجد کے امام ایک نوجوان نابینا حافظ محمد رمضان صاحب تھے۔ انہیں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قرآن پڑھانے کا شوق ہی نہیں جنون تھا۔ جس نوجوان کو قرآن پڑھانا شروع کرتے اُس کا نام اپنی پاکٹ بک میں جو ہمیشہ اُن کی جیب میں ہوتی لکھوا لیتے ۔ اُن کی کوشش رہتی کہ اُن کی اس فہرست میں اضافہ ہوتا رہے۔ جب اپنے ایک شاگرد (میرے دوست شیخ محمد عبداللہ علیگ مرحوم وکیل) سے میری خواہش کا علم ہوا تو خود میرے ہاں تشریف لائے اور مجھے بھی اس فہرست میں شامل کر لیا وہ قرآن پڑھانے کا معاوضہ تو ایک طرف کسی شاگرد کے ہاں سے چائے یا شربت کا گھونٹ تک نہ پیتے تھے۔

حافظ صاحب کو چچا جان کا کلام سننے کا بڑا شوق تھا اور اکثر مجھ سے سُنا

کرتے تھے۔ ایک بار چچا جان سیالکوٹ تشریف لائے ہوئے تھے۔ حافظ صاحب قرآن پڑھانے آئے تو انہیں اُن کی تشریف آوری کا علم ہوا۔ بڑے پُرشوق لہجے میں مجھے کہا کہ "کدی سانوں وی بزرگاں دیاں زیارتاں کراؤ ناں" (کبھی ہمیں بھی بزرگوں کی زیارت کرائیے نا)۔ چچا جان اُس وقت ابّا جان کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں نے وہاں جاکر عرض کیا کہ میرے استاد حافظ صاحب جو نابینا ہیں آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق رکھتے ہیں۔ اجازت ہو تو انہیں یہاں لے آؤں۔ جواب میں فرمایا وہ تمہارے استاد ہیں اور وہ بھی قرآن کریم کے۔ اُن کی عزّت ہم پر لازم ہے۔ میں اُن سے ملنے وہیں آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر والی مردانہ بیٹھک میں تشریف لے آئے۔ حافظ صاحب سے مصافحہ کیا۔ حافظ صاحب کی عادت تھی کہ نئے آدمی سے ملتے تو اُس کے چہرے۔ ہاتھوں اور بازوؤں پر اپنے ہاتھ پھیر کر اُن کی "شناخت" اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتے۔ یہی عمل انہوں نے چچا جان کی "شناخت" ذہن میں محفوظ کرنے کے لئے کیا۔ چچا جان نے اُن سے کہا کہ آپ کا بڑا احسان ہے جو اعجاز کو قرآن پڑھا رہے ہیں۔ جواب میں کہا "احسان اینہاں دا اے سانوں ثواب کمان دا موقعہ دیندے نے" (احسان ان کا ہے کہ مجھے ثواب کمانے کا موقعہ دیتے ہیں)۔ جس طرح معصوم بچہ اپنا کھلونا ہر ایک کو دکھا کر خوش ہوتا ہے۔ اسی بھولپن اور سادگی کے ساتھ حافظ صاحب نے اپنی پاکٹ بک جھٹ سے نکال کر چچا جان کے ہاتھ میں دے دی کہ دیکھئے کتنے انگریزی خواں نوجوان قرآن کریم پڑھ رہے ہیں۔ فہرست دیکھ کر چچا جان بہت خوش ہوئے اور فرمایا "حافظ صاحب آپ بڑا نیک کام کر رہے ہیں۔ اس کا اجر آپ کو اللہ تعالیٰ دے گا۔" حافظ صاحب نے اس پر خوش ہوکر کہا "اسی تے چھلڑاں ای دیندے آں۔ گریاں تے تُسی دیندے او ناں" (ہم تو چھلکے ہی دیتے ہیں۔ مغز تو آپ ہی دیتے ہیں) حافظ صاحب بڑے بے نفس انسان تھے۔ فرشتہ کی طرح معصوم۔ حق تعالیٰ نے ضرور اُن سے رحمت کا سلوک فرمایا ہوگا۔

اّبا جان کے نام ان کا ۱۳ر جون سنہ ۲۲ کا خط سارے کا سارا اُن کی اہلی زندگی کے متعلق ہے۔ اس لئے اُسے حذف کیا جا رہا ہے۔

لاہور ۱۳ر جون سنہ ۲۳

برادر مکرم السلام علیکم

کل ایک خط خدمت شریف میں روانہ کر چکا ہوں ....

....

....

والد مکرم کو بھی یہ خط سُنا دیں۔ باقی خیریت ہے۔ آج امتیاز بھی آگیا ہے۔

والسلام

محمد اقبال
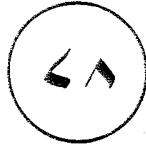
چچا جان کے ۸ر جون والے شفقت نامے کے جواب میں مَیں نے ملازمت کے تلخ تجربے کا رونا رویا تو جواب میں یہ تسلّی نامہ موصول ہوا۔ سنہ ۲۲ کے اس خط میں اُس زمانہ کے مسلمان نوجوانوں کے نام اپنے جس پیغام کا ذکر فرمایا ہے وہ آج کل کے مسلمان نوجوانوں کے لئے بھی مفید ہو سکتا ہے۔ یعنی اپنے ذہنی اضطراب و بے چینی سے نجات پانے کے لئے مذہب میں پناہ لو۔ لیکن ان کا مطلب "نبیوں میں رحمت لقب پانے والے" کے لائے ہوئے مذہب سے ہوگا جو "مس خام کو کندن" بنا دینے کی تاثیر رکھتا ہے نہ کہ کٹھ مُلاؤں کے خود ساختہ مذہب سے کیونکہ بقول اُن کے "دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد" ہے

اِس خط کے ایک حصّہ کا مضمون، آبّا جان کے نام تھا۔ حسبِ ارشاد خط اُن کو دکھا دیا۔ اِس کا موضوع اُن کا وہی اہلی معاملہ تھا جو ۱۳ جون والے خط میں درج تھا۔ لہٰذا اس حصّے کو حذف کر دیا ہے۔

مولانا میر حسن صاحب کے نام اِس خط میں جو پیغام تھا وہ میں نے انہیں پہنچا دیا۔

لاہور ۱۵ جون ۳۲ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے۔ امید ہے تمہاری صحت جلد اچھی ہو جائے گی اور جو تکلیف تم کو پشاور جانے آنے میں ہوئی ہے وہ بعد کی کامیابی سے نسیاً منسیا ہو جائے گی۔ تلخ تجربات سے گھبرانا نہ چاہیئے زندگی پر اُن کا بھی Restraining Influence ہوتا ہے۔ اگرچہ پہلے ان کی تلخی کا احساس ہوتا ہے اور روح کو ایذا پہنچتی ہے تاہم بعد میں ان کا فائدہ معلوم ہو جاتا ہے اور انسان اس بات کے لئے شکر گزار ہوتا ہے کہ اس کو اس قسم کے تجربات ہوئے۔ جرمنی کے مشہور پیغمبری شاعر گوئٹے نے اپنے معاصر جوانوں کے روحانی اضطراب و بے چینی کا مشاہدہ کر کے ان کو یہ پیغام دیا تھا۔

Art still has truth

Take refuge there

اس وقت اسلامی دنیا کی وہی حالت ہے جو نپولین کے وقت میں جرمنی کی تھی اور میرا پیغام بھی مسلمان نوجوانوں کے نام وہی ہے جو اس نے دیا تھا صرف اس قدر فرق ہے کہ میں نے art کی جگہ لفظ Religion رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ آرٹ میں اطمینان ضرور ہے مگر قوت نہیں ہے۔ مذہب میں اطمینان اور قوت دونوں چیزیں ہیں

. . . .

. . . .

والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کر دیں۔ حضرت قبلہ مولوی میر حسن صاحب

سے کہہ دیں کہ میں نے ان کو کارڈ در بارہ کاغذات امتحانات ایم اے ایل لکھا تھا معلوم ہوتا ہے وہ کارڈ ان تک نہیں پونچا۔ یہاں مولوی محمد حسین صاحب ان کے پرچوں کا انتظار کرتے رہے۔ آخر میں نے اُن سے کہا کہ وہ خود سیالکوٹ تشریف لے جائیں اور نمبروں کا مقابلہ کرلیں امید ہے کہ مولوی محمد حسین صاحب وہاں گئے ہوں گے اور پرچوں کے متعلق تمام امور طے ہو گئے ہوں گے۔

محمد اقبال

۷۹

ملازمت کے بہت مختصر لیکن بہت ہی تلخ تجربے کے بعد میں نے تہیہ کر لیا کہ اب دلجمعی سے وکالت کا کام کروں گا۔ حُسنِ اتفاق سے پریکٹس چل نکلنے کی ایک صورت بھی نکل آئی۔ سیالکوٹ کے ایک با اثر بزرگ سیّد فقیر علی شاہ آبا جان کے احباب میں سے تھے۔ وہ ڈسٹرکٹ اور سیشن کورٹ میں سررشتہ دار تھے۔ اُن کے بیٹے سیّد مظہر حسین مرحوم میرے دوست تھے۔ اُنھوں نے بھی میرے بعد قانون کا امتحان پاس کیا اور سیالکوٹ میں وکالت شروع کی۔ اُن دنوں پنجاب میں وُکلاء کے مل کر مشترکہ کام کرنے کا ابھی رواج نہ ہوا تھا۔ مظہر حسین کی تجویز پر ہم نے مشترکہ کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے پنجاب میں غالباً اور سیالکوٹ میں یقیناً وکلاء کے کام میں اشتراک کی یہ پہلی مثال تھی۔ فقیر علی شاہ صاحب پرانے عدالتی اہلکار تھے اور ضلع کے مقدمہ باز حلقوں میں ان کی کافی واقفیت تھی۔ شہر میں بھی اُن کا بڑا رسوخ تھا۔ اُن کی وجہ سے کام ملنا شروع ہوا۔ مظہر حسین یوں تو بڑے سمجھدار تھے لیکن عدالتوں میں کام کرنے کا ابھی تجربہ نہ تھا ہاں موکلوں کو قابو کرنے میں بڑے ماہر تھے۔ مجھے عدالتی کام کا کچھ تجربہ ہو گیا تھا لہٰذا یہ کام میں نے سنبھالا۔ وکالت کی گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ آبا جی نے چچا جان کو اِس صورتِ حال سے مطلع کیا تو اُن کی طرف سے اُن کے نام یہ خط آیا۔

لاہور ۱۰ جولائی ۲۲ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا تھا اور والد مکرم کی خیریت ذکی شاہ سے بھی معلوم ہوگئی تھی۔ الحمد علیٰ ذالک۔ بہت اچھا ہوا کہ آپ نے پھوڑے کی طرف جلد توجہ کر دی ورنہ ممکن ہے زیادہ تکلیف ان کو ہوتی۔ ذکی شاہ کے ہم دست آم آپ کو بھیج چکا ہوں۔ ملتان سے آم آنے کی توقع تھی جن کی نسبت خیال تھا کہ بہت اچھے ہوں گے میرا خیال تھا کہ وہ آم آئیں تو آپ کو بھیجوں مگر افسوس کہ وہ اس وقت تک نہیں آئے اور بھیجنے والے صاحب ڈلہوزی چلے گئے۔ بہر حال جو آم میں نے بھیجے ہیں وہ بھی ملتان کے ہیں مگر اس سے بہتر دیسی آم لاہور میں نہیں ہیں۔ گو ان میں رس تھوڑا ہے مالدہ آم مجھے بھی پسند نہیں مگر سردار کو اس سے عشق ہے۔ اس واسطے گھر میں جب کبھی آم آتے ہیں وہی منگوائے جاتے ہیں۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اعجاز کا کام چل نکلا ہے۔ آپ اس سے کہہ دیں کہ وہ محنت کرتا رہے اور کام سے اچھی طرح واقفیت حاصل کر لے۔ جب وہ اچھی طرح سے تجربہ حاصل کرے گا تو ممکن ہے کوئی پبلک پراسیکیوٹری کی جگہ نکل آئے۔ میں اس کے لئے کوشش کروں گا۔ پبلک پراسیکیوٹری سے اور بھی اچھی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں لیکن کام جتنا بھی ہو تندہی اور توجہ سے کرے۔ حکام سے بھی جو وہاں ہوں رسوخ رکھے۔ انشاءاللہ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی ابھی اس کی عمر بڑی نہیں ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

محمدؐ اقبال

اس خط کی ایک بات خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کیونکہ وہ چچا جان کے کردار پر روشنی ڈالتی ہے۔ وہ آموں کے رسیا تھے لیکن مالدہ آم انھیں پسند نہ تھے۔ اس کے برعکس چچی سردار کو مالدہ آموں سے بقول چچا جان "عشق تھا"۔ یوں تو آم کی فصل کے دنوں میں اچھی اچھی اقسام کے آم دوست احباب کی طرف سے تحفتاً آتے تھے لیکن جب کبھی بازار سے آم منگوائے جاتے تو چچی سردار مالدہ آم ہی منگواتیں۔ چچا جان کبھی اپنی پسند کے آم منگوانے

پر اصرار نہ کرتے۔

آموں کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی بیان کر دوں۔ جب کبھی آم تحفتاً آتے اور علی بخش یا کوئی دوسرا ملازم آموں کی پیٹی کھولتا تو اُسے دو چار "اچھے اچھے" آم چُن کے نکالنے کے لئے کہتے۔ جب وہ اپنی دانست کے اچھے آم نکال لیتا تو کہتے "اچھا اب یہ آم تم کھا لو۔"

۸۰

جولائی ۳۲ء کے آخری عشرے میں مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ یاد نہیں آرہا کہ کس سلسلہ میں جانا ہوا۔ جون کے شروع میں چچا جان نے ابا جان کو لکھا تو تھا کہ اگر اعجاز چاہے تو کچھ دنوں کے لئے لاہور آجائے۔ شاید اس ارشاد کی تعمیل میں جانا ہوا یا کسی اور وجہ سے۔ میرے لاہور سے واپس آنے کے بعد ابا جان کے نام اُن کا یہ خط موصول ہوا۔

لاہور ۲۶ جولائی ۳۲ء

اُمید ہے اعجاز بخیریت گھر پہنچ گیا ہوگا۔ افسوس ہے کہ آم کی ایک ٹوکری گاڑی چلے جانے کے بعد اسٹیشن سے ملی اگر چند منٹ پہلے مل جاتی تو اعجاز کے ہمدست بھیج دی جاتی۔ بہرحال اگر میری واپسی (پر) کوئی اور ٹوکری کہیں سے آگئی تو ہمراہ لاؤں گا۔ یہ آم جو مظفر گڑھ سے آئے تھے کچھ تو میں نے یہاں دے دیئے ہیں کچھ لدھیانے دیتا جاؤں گا۔ آج شام روانہ ہوتا ہوں آپ شملہ کوٹھی نو بہار کے پتہ پر مجھے اس خط کا جواب دیں۔ اگر شملہ کی آب و ہوا نے پاؤں کو تکلیف نہ دی تو وہاں کچھ مدت قیام رہے گا ورنہ واپس آجاؤں گا اور ایک آدھ روز لاہور میں قیام کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔

اعجاز تو بہت دُبلا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی چُستی میں بھی نسبتاً کمی ہے اور چہرے سے فکر و تردد کے آثار پائے جاتے ہیں۔ میرے دل پر ان باتوں نے بڑا اثر کیا ہے ممکن ہے کہ اس کے دل پر اور باتوں کے علاوہ آپ کی ناخوشی کا بھی اثر ہو۔ آپ اس کی صحت کی فکر

کریں اور اس کو تسلّی دیں کہ انشاءاللہ اس کے لئے ضرور کوئی نہ کوئی بہتر صورت نکلے گی۔ فی الحال اس کو اپنا کام سیکھنے کی طرف پوری توجہ دینی چاہیئے اگر مقدمات نہ بھی آئیں تب بھی قانونی کتب کا مطالعہ کرتا رہے۔ وکیل کی زندگی میں وہ وقت نہایت بیش قیمت ہے جب اسکو کوئی کام نہ آتا ہو کیونکہ ان اوقات میں وہ مطالعہ کر سکتا ہے جو ان دنوں میں اس کے کام آئے گا جب لوگ اپنے معاملات اُس کے سپرد کرنے لگیں گے۔ دو تین سال تکلیف کے ہیں پھر میں بھی انشاءاللہ اس کے لئے کوشش کروں گا اور اگر آپ کے دل میں اس کی طرف سے کوئی ناخوشی ہو تو اس کو دور کر دیں اگر فضول خرچی کا عیب اس میں ہے بھی تو میرے نزدیک یہ عیب بدچلنی سے بہتر ہے اور الحمدللہ کہ یہ موخرالذکر عیب اس میں نہیں۔ یہی غنیمت ہے خدا کا شکر کرنا چاہیے۔ آپ اپنے تمام معاملات خدا کے سپرد کر کے اپنے قلب کو افکار سے فارغ کر لیں۔ اللہ تعالےٰ غیر متوقع سامان کرے گا۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والدہ مکرمہ کی خدمت میں آداب عرض ہو۔ امید ہے اُن کا پھوڑا اچھا ہو گیا ہو گا۔

محمد اقبال

اس خط کے آخر میں میرے متعلق ابا جان کو لکھا ہے کہ "اگر فضول خرچی کا عیب اُس میں ہے بھی تو میرے نزدیک یہ عیب بدچلنی سے بہتر ہے اور الحمدللہ کہ موخرالذکر عیب اُس میں نہیں"۔ اپنے متعلق اُن کے اس بزرگانہ حُسنِ ظن کا معلوم ہو کر قدرتاً مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس خط کی تحریر سے کوئی ۵۲ سال بعد ۱۹۷۳ء میں مجھے ان کا ایک خط مرحوم سر راس مسعود کے نام پڑھنے کا اتفاق ہوا جو ۱۰ جون ۱۹۳۷ء کو یعنی اپنی وفات سے کوئی ۱۰ ماہ پہلے انہوں نے لکھا تھا۔ اُس خط سے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ میرے متعلق ان کا یہ حُسنِ ظن آخر عمر تک قائم رہا کیونکہ اس میں میرے متعلق لکھا ہے "شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے"۔ یہ خط اور سید صاحب موصوف کے نام کئی اور خطوط صہبا لکھنوی مدیر "افکار" کراچی کی مرتبہ کتاب "اقبال اور بھوپال" میں شائع ہوئے ہیں جسے "اقبال اکادمی" نے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا۔ ۱۰ جون والے اس خط کا ذکر ذرا تفصیل سے کرنا ضروری ہے۔ شاید قارئین کی

دلچسپی کا باعث ہو۔

چچا جان کے بہت سے مکتوبات اوّل اوّل شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور نے ۱۹۴۵ء میں "اقبال نامہ حصّہ اوّل" کے نام سے شائع کیے تھے انہیں شیخ عطا اللہ پروفیسر علی گڑھ کالج نے مرتب کیا تھا۔ اقبال نامہ (حصّہ اول میں چچا جان کے کئی خطوط سیّد راس مسعود کے نام شامل ہیں جن میں ۱۰ر جون ۱۹۳۷ء والا خط بھی ہے۔ "اقبال نامہ" (۱۹۴۵ء) کا ایک نسخہ میرے پاس ہے لیکن اس میں ۱۰ر جون ۱۹۳۷ء والے خط میں میرے متعلق اُن کا بھتیجہ اور نہایت صالح آدمی ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔ میں نے صہبا صاحب سے دریافت کیا کہ ۱۰ر جون ۱۹۳۷ء والا خط انہوں نے کہاں سے نقل کیا ہے۔ اُن سے یہ معلوم ہو کر تعجب ہوا کہ وہ خط اور سیّد راس مسعود کے نام دوسرے خطوط جو اقبال اور بھوپال میں شائع کیے گئے ہیں سب کے سب شیخ محمد اشرف کے "اقبال نامہ" حصّہ اول سے نقل کیے گئے ہیں۔ اپنے بیان کی تائید میں انہوں نے "اقبال نامہ" کا وہ نسخہ مجھے دکھایا جس سے یہ سب خطوط نقل کیے گئے۔ جب اس نسخہ میں مندرجہ خطوط بنام سر راس مسعود کا مقابلہ ان خطوط سے کیا گیا جو میرے پاس والے نسخہ میں شامل ہیں تو مزید تعجب ہوا کیونکہ دونوں نسخے اگرچہ ۱۹۴۵ء والے پہلے ایڈیشن کے ہیں (دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی) لیکن اُن میں حسب ذیل بیّن اختلاف ہیں۔

۱۔ خط محرّرہ ۳۰ر مئی ۱۹۳۵ء کا کچھ حصّہ میرے پاس والے نسخے میں حذف شدہ ہے۔

۲۔ خط محرّرہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۵ء میرے پاس والے نسخہ میں سرے سے موجود ہی نہیں۔

۳۔ خط محرّرہ ۱۰ر جون ۱۹۳۷ء کا کچھ حصّہ جس میں میرے متعلق متذکرہ بالا کلمۂ خیر لکھا گیا ہے۔ میرے پاس والے نسخہ میں حذف شدہ ہے۔

جب صہبا صاحب نے شیخ محمد اشرف سے اس معمّہ کی گرہ کشائی چاہی تو انہوں نے اپنے خط محرّرہ ۳ر اکتوبر ۱۹۷۴ء میں یہ جواب دیا۔

"مکاتیبِ اقبال کا ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا

پہلا ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں طبع ہوا تھا۔ جس وقت یہ کتاب چھپ کر بازار میں آئی اُس وقت چودھری محمد حسین جن کو آپ خوب جانتے ہوں گے زندہ تھے۔ چودھری صاحب پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور Paper controller بھی تھے۔ میرے اُن سے تعلقات بھی تھے۔ علامہ اقبال مرحوم نے ایک خط سر راس مسعود کو تحریر کیا ہوا تھا جو بالکل درست تھا۔ وہ خط بھی طبع شدہ ایڈیشن میں موجود تھا۔ چودھری صاحب پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ خط اس مجموعہ میں شامل ہو۔ میں نے ہر چند اُن کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس خط کو حذف نہ کیا جائے مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ مجبوراً وہ خط حذف کر دیا گیا۔ جو نسخے قبل ازیں فروخت ہو گئے اُن میں وہ خط شامل ہو گا۔ بقایا نسخے اس خط کے بغیر ہوں گے۔ یہی فرق ہے جس کی طرف آپ نے نشان دہی کی ہے۔ اس خط کا عکس اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ اصل خط شیخ عطا اللہ صاحب مرحوم کے پاس موجود تھے۔ انہوں نے واپس نہیں کئے تھے۔ اب غالباً اُن کے صاحبزادے مختار مسعود کے پاس محفوظ ہوں گے۔ آپ نے صحیح تحریر فرمایا ہے۔ بعض نسخوں میں صفحات بھی کم ہیں اور عبارتیں بھی مختلف ہیں۔ چونکہ ایک بہت اہم اور طویل خط حذف کر دیا گیا تھا اس وجہ سے صفحات اور عبارت میں ضرور فرق ہونا لازمی تھا۔ اُمید ہے آپ کی اُلجھن دور ہو گئی ہو گی۔ اگر مزید ضرورت ہو تو آپ ہر وقت دریافت کر سکتے ہیں۔"

اس وضاحت کے موصول ہونے کے بعد میں نے اپنے چھوٹے بھائی شیخ مختار احمد کو جو لاہور میں رہتے ہیں اس صورتِ حال سے آگاہ کر کے لکھا کہ وہ شیخ محمد اشرف سے مل کر اپنے طور پر بھی تصدیق کریں اور اگر کوئی ایسا نسخہ اُن کے پاس موجود ہو جس میں یہ تبدیلیاں نہ ہوئی ہوں تو اُسے ہر قیمت پر خرید لیں۔ اُن کا حسبِ ذیل جواب محررہ ۹/ اپریل ۱۹۸۵ء موصول ہوا۔

"میں کل شیخ محمد اشرف صاحب کو ملا تھا، وہ مجھے اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ اقبال نامہ حصہ اوّل کے بارے میں انہوں نے وہی بات بتائی جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس کتاب کی تقریباً ۱۰۰ کاپیاں جب فروخت ہو گئیں تو چودھری محمد حسین

صاحب نے چند خطوں کے بعض حصوں کو حذف کرنے کو کہا ۔ میں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا ۔ سب نے یہی کہا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے مجھے علم ہوا کہ چودھری صاحب ۶ ماہ کے بعد ریٹائر ہو جائیں گے ۔ چودھری صاحب اُس لڑائی کے زمانے میں Paper controller بھی تھے اور کاغذ کا کوٹہ بھی وہی دیتے تھے ۔ انہیں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا ۔ فیصلہ کیا کہ ابھی کتاب کی فروخت بند کر دی جائے اور کسی طرح ۶ ماہ گزارے جائیں ۔ ان کے ریٹائر ہونے کے بعد کتاب فروخت کریں گے ۔ چودھری صاحب کو دو سال کی EXTENTION مل گئی ۔ میں مجبور ہو گیا ۔ کتاب کی ۴۰۰۰ کاپیاں چھپی تھیں ۔ اُن کاپیوں میں ورق تبدیل کرنے پڑے جس میں مجھے کافی نقصان ہوا ۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس اب کوئی کاپی نہیں ورنہ میں آپ کو واپس نہ کرتا ۔"

چچاجان کے احباب میں سے چودھری محمد حسین کے علاوہ سید نذیر نیازی بھی اُن کی زندگی کے آخری سالوں میں اُن کے بہت قریب تھے ۔ میں نے اُن سے بھی "اقبال نامہ" میں شائع ہونے والے بعض مکتوبات بنام سید راس مسعود میں کتاب کے شائع ہو جانے کے بعد چودھری محمد حسین کے "قطع و برید کرانے کے متعلق استفسار کیا تو انہوں نے اپنے خط محررہ ۳۰ اپریل ۷۵ء میں تسلیم کیا "کہ بعض (خطوط) میں چودھری صاحب مرحوم نے مصلحتاً کچھ تبدیلیاں بھی کیں ان معنوں میں کہ جو عبارت پسند نہ آئی اسے قلم زد کر دیا ۔"

شیخ محمد اشرف صاحب اور سید نذیر نیازی صاحب کی متذکرہ بالا تصریحات سے ثابت ہوا کہ اقبال نامہ کے شائع ہو جانے اور کچھ کاپیاں فروخت ہو جانے کے بعد چودھری محمد حسین صاحب نے بعض خطوط مندرجہ اقبال نامہ میں مصلحتاً قطع و برید کرنے پر شیخ محمد اشرف صاحب کو مجبور کیا ۔ سید راس مسعود صاحب کے نام خط محررہ ۳۰ مئی ۳۵ء (اقبال اور بھوپال صفحہ ۸۷) کا کچھ حصہ اور خط محررہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۵ء (اقبال اور بھوپال صفحہ ۱۵۰) سارے کا سارا حذف کرا دینے میں مکرم چودھری محمد حسین کی کیا مصلحت تھی یہ تو انہیں ہی معلوم ہوگا لیکن سید صاحب موصوف کے نام خط محررہ ۱۰ جون ۳۷ء

(اقبال اور بھوپال صفحہ ۱۸۹) کا جو حصہ چودہری صاحب نے حذف کرایا۔ اُس کی مصلحت سمجھ میں آتی ہے۔ اس حذف شدہ حصہ میں میرے متعلق لکھا تھا کہ "نہایت صالح آدمی ہے"۔ یہ صالحیت کا سارٹیفکیٹ اگرچہ اُس حُسن ظن کا مرہون منت تھا جو بزرگ عام طور پر اپنے عزیزوں کے متعلق رکھتے ہیں لیکن اس کی اشاعت میرے محترم شریک کار (ہم دونوں جاوید اور منیرہ کے گارڈین تھے) کی "سیاست"، کو گوارا نہ ہوئی اس "سیاست بازی" کے متعلق مزید کچھ کہنا مناسب نہیں کہ چودھری صاحب محترم اب اپنے خالق کے پاس پہنچ چکے ہیں اور اُن کا معاملہ اب اللہ تعالےٰ کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کا انہیں اجر عظیم عطا فرمائیں اور تعصب کے زیر اثر ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائیں۔

حال ہی میں بھوپال کے ایک صاحب اخلاق اثر نے بھی چچا جان کے خطوط بنام سید راس مسعود کا مجموعہ "اقبال نامے"، کے نام سے شائع کیا ہے۔ اُس میں بھی چچا جان کے ۱۰ جون ۳۷ء والے خط کا بقول مرتب "معیاری اور مکمل اور مستند متن"[۲] شامل ہے جو "اقبال اور بھوپال" والے متن سے بھی قدرے مختلف ہے۔ اس میں لکھا ہے "نمبر ۲، شیخ اعجاز احمد مرا بڑا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا GUARDIAN ہو سکتا ہے یا نہیں۔" اگر یہی متن مکمل اور مستند متن ہے تو بھی اس میں اُن کی طرف سے میری صالحیت (جس کا مجھے کوئی دعویٰ نہیں) کا سارٹیفکیٹ موجود ہے جسے میں اُن کے مشفقانہ حُسن ظن پر محمول کرتا ہوں۔

خط محررہ ۲۶ جون ۳۲ء میں ایک اور بات جو نوٹ کرنے والی ہے وہ اُن کا اللہ تعالیٰ کی قدرت پر یقین محکم ہے۔ خط کے آخر میں اّبا جان کو مشورہ دیتے ہیں کہ "آپ اپنے تمام معاملات خدا کے سپرد کرکے اپنے قلب کو افکار سے فارغ کرلیں۔ اللہ تعالےٰ غیر متوقع سامان کرے گا۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے۔" اور واقعی اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل سے غیر متوقع سامان پیدا کیے جن کی تفصیل بیان کرنے سے یہ وضاحتی نوٹ اور طویل ہو جائے گا لہٰذا اسے ترک کرتا ہوں۔

[1] ظاہر ہے کہ صہبا صاحب کے پاس اقبال نامہ حصّہ اول کی جو کاپی تھی وہ اُن میں سے ایک تھی جو چودھری محمد حسین مرحوم کی مجوزہ قطع و برید سے قبل فروخت ہو چکی تھیں۔ راقم الحروف کو تلاش تھی کہ چودھری صاحب کی دست برد سے بچ جانے والی کاپیوں میں سے دو ایک اور کاپیوں کا بھی سراغ ملے۔ جوئندہ یابندہ۔ حال ہی میں معلوم ہوا کہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں "اقبال نامہ" مرتبہ شیخ عطا اللہ صاحب کے حصہ اول کی جو کاپی ہے وہ انہیں کاپیوں میں سے ایک ہے۔ جو چودھری محمد حسین کی مجوّزہ قطع و برید سے پہلے فروخت ہو چکی تھیں۔ اس میں خط محرّرہ ۲۶/۳۴ ۱۰ ابھی موجود ہے اور ۲۶/۳۴ ۱۰ والے خط کا متن بھی وہی ہے جو اقبال اور بھوپال میں ہے۔ لائبریری مذکور سے اِن کی فوٹو کاپیاں حاصل کر لی گئی ہیں۔

[2] علامہ اقبال کے خط محرّرہ ۶/۳۴ ۱ کا "مکمل اور مستند" متن شیخ عطا اللہ مرحوم کے مرتبہ "اقبالنامہ" میں ہے یا بقول اخلاق اثر صاحب ان کے مرتبہ "اقبالنامے" میں اس کا فیصلہ تو علامہ کا اصل خط دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ معلوم نہیں یہ اصل خط کس کے پاس ہے۔ شیخ عطا اللہ اقبال نامہ حصّہ اول کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "لیڈی مسعود صاحبہ نے سر سید راس مسعود مرحوم کے نام کے تمام خطوط ازراہِ کرم مجھے مرحمت فرمائے۔" شیخ محمد اشرف ناشر کتاب اپنے خط محررہ ۲/۸۴ ۳ بنام صہبا لکھنوی لکھتے ہیں۔ "اصل خط شیخ عطا اللہ صاحب مرحوم کے پاس موجود تھے۔ انہوں نے واپس نہیں کئے تھے۔ اب غالباً ان کے صاحبزادے مختار مسعود کے پاس محفوظ ہوں گے۔" میں نے محترم مختار مسعود صاحب سے بذریعہ خط استدعا کی ہے کہ اگر اصل خط اُن کے پاس محفوظ ہیں تو براہِ کرم خط محررہ ۶/۳۴ ۱ کی فوٹو کاپی عنایت فرمائیں۔ اگر شیخ عطا اللہ مرحوم نے اصل خطوط واپس نہیں کئے تھے تو اخلاق اثر صاحب کو وہ خطوط کہاں سے دستیاب ہوئے۔ ممکن ہے شیخ محمد اشرف کی اطلاع درست نہ ہو اور شیخ عطا اللہ مرحوم نے اصل خطوط واپس کر دیئے ہوں۔ ایسی صورت میں اخلاق اثر صاحب کو یہ خطوط ممنون حسن خاں سابق سکریٹری سید راس مسعود اور حال صدر اقبال ادبی مرکز بھوپال سے ہی ملے ہوں گے۔ اُن کی خدمت میں بھی استدعا کی گئی ہے کہ خط محرّرہ ۶/۳۴ ۱ کی فوٹو کاپی عنایت فرمائیں۔ اگر اس کتاب کی طباعت سے پہلے ان میں سے کوئی ایک فوٹو کاپی مل گئی تو صورتحال عرض کر دی جائے گی۔ اگر دونوں طرف سے صدائے برنخاست والا معاملہ ہوا تو قارئین جس متن کو چاہیں "مکمل اور مستند متن" سمجھ لیں۔ [3]

یہاں یہ ذکر بھی کر دوں کہ ۳۷ء میں آنکھوں میں موتیا اترنے کی وجہ سے ڈاکٹروں نے انہیں لکھنے

پڑھنے سے منع کر دیا ہوا تھا۔ ۱۹۳۷ء کے اُن کے خطوط میرے نام جو اس کتاب میں شائع کیے جا رہے ہیں سوائے ایک سب کسی اور سے لکھوائے گئے۔ اس لئے سیّد راس مسعود مرحوم کے نام خط محررہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء بھی اغلباً کسی اور سے لکھوایا ہوگا۔ فوٹو کاپی دستیاب ہو تو حقیقت معلوم ہو۔

۳۔ محترم مختار مسعود صاحب کو خط متذکرہ بالا ۲۵ مئی ۱۹۸۵ء کو اور محترم ممنون حسن خاں صاحب کو ۵ جون ۱۹۸۵ء کو بذریعہ رجسٹری ڈاک ارسال کیے گئے تھے جو دونوں حضرات کو مل چکے ہیں۔ آج تک کہ اگست ۱۹۸۵ء کی ۱۳ تاریخ ہے دونوں حضرات کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ حسن ظن سے کام لیتے ہوئے راقم الحروف کا خیال ہے کہ اوّل الذکر صاحب حکومت پاکستان کی وزارت تجارت کے معتمد اعلیٰ ہونے کی وجہ سے درآمد برآمد کی پالیسی مرتب کرنے میں شاید اتنے مصروف ہیں کہ انہیں میری درخواست پر غور فرمانے کے لئے وقت ہی نہ مل سکا یا (جو زیادہ قرین قیاس ہے) انہوں نے اس معاملہ کو غیر اہم سمجھتے ہوئے اس پر توجہ فرمانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اُن سے جو استصواب کیا گیا تھا اُس کا مقصد صرف اُن کے والد بزرگوار مرحوم شیخ عطا اللہ صاحب کو بھوپال کے اخلاق اثر صاحب کے اس الزام سے بری الذمہ ثابت کرنا تھا کہ انہوں نے ۱۹۴۵ء میں "اقبال نامہ" شائع کرتے وقت علامہ کے خط محررہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء بنام سر راس مسعود میں سے دو ایک فقرے حذف کر دیئے۔ موخر الذکر صاحب کی خاموشی کی بھی کوئی وجہ ہوگی۔ پچھلے دنوں اُن کے شہر میں جو قیامت صغریٰ بپا ہوئی شاید اس سلسلہ میں اُن کی مصروفیت اس معاملے پر توجہ دینے میں حارج ہوئی۔ بہرحال دونوں طرف سے تعاون نہ ہونے کی وجہ سے راقم الحروف یہ عرض نہیں کر سکتا کہ علامہؒ کے خط محررہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء کا کون سا متن "مکمل اور مستند" متن ہے۔ قارئین جس متن کو چاہیں "مکمل اور مستند" متن سمجھ لیں۔

ستمبر ۲۲ء میں ابّا جان پھر بیمار ہو گئے اگرچہ اُس وقت اُن کی عمر ۴۶ سال کے لگ بھگ تھی، لیکن کوئی خاص عارضہ لاحق نہ تھا۔ دراصل اُن کی طبیعت کی ناسازی ذہنی تفکرات کا نتیجہ تھی۔ اُن کے تین بیٹوں اور تین بیٹیوں میں سے اس وقت تک صرف ایک بیٹی کی شادی ہوئی تھی اور بیٹوں میں سے صرف ایک تعلیم مکمل کرکے برسرکار ہوا تھا۔ اسلئے وہ فکرمند رہتے تھے کہ اتنی ذمہ داریوں سے کیسے عہدہ برآ ہوں گے۔ اُن کا بخار رکا نہیں تو میں نے چچا جان کو مطلع کیا۔ یہ اطلاع ملنے پر انھوں نے ابّا جان کو یہ خط لکھا جو کئی لحاظ سے خاص توجہ کا مستحق ہے۔

لاہور ۲۸ ستمبر ۲۲ء

برادرِ مکرم اسلامُ علیکم

اعجاز کے خط سے معلوم ہوا کہ مسہل کے بعد بخار رک گیا ہے۔ الحمد للہ میں آپ کے لئے دعا کر رہا ہوں، انشاء اللہ آپ کی صحت ضرور اچھی ہو جائے گی میں نے جو نسخہ آپ کو بتایا تھا اس پر ضرور روزانہ عمل کئے جایئے اس کی بنا محض فلسفیانہ خیالات پر نہیں بلکہ اس انکشاف پر ہے جو خدا تعالےٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے قلب انسانی کے متعلق مجھ کو عطا فرمایا ہے۔ اگر بعض خیالات آپ کو افسردہ کر رہے ہیں تو ان کو یک قلم دل سے نکال دینا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ آپ کی تمام مشکلات رفع کردے گا اور برکت نازل کرے گا۔ اگر آپ زندگی سے دل برداشتہ بھی ہوں تو محض اس خیال سے کہ اسلام پر بہت اچھا زمانہ عنقریب آنے والا ہے۔ اپنی صحت کی طرف توجہ کیجئے تاکہ آپ اپنی آنکھوں سے اس زمانے کا کچھ حصّہ دیکھ لیں۔ آج چودہ یا شاید ۱۶ سال ہو گئے جب مجھ کو اس زمانے کا احساس انگلستان کی سرزمین پر ہوا تھا۔ اس وقت سے آج تک یہی دعا رہی ہے کہ بارالہا اس وقت تک مجھے زندہ رکھ یہاں تک کہ اپنی بعض پرائیویٹ مشکلات کے متعلق بھی میں نے شاذ ہی دعا مانگی ہوگی۔

آپ نے اخباروں میں پڑھ لیا ہوگا کہ ترکوں کا قبضہ بغیر جنگ کے اپنے تمام ممالک پر ہوگیا ہے۔ آبادوں پر ان کا اقتدار تسلیم کرلیا گیا ہے البتہ یہ اقتدار بعض شرائط کا پابند ہوگا جس کا فیصلہ مجلس اقوام کرے گی۔ ترکستان کی جمہوریت کو بھی روس کی گورنمنٹ نے تسلیم کرلیا ہے۔ اس کے صدر غازی انور پاشا ہوں گے اس سے بھی زیادہ معنی خیز خبر یہ ہے کہ روس کی سلطنت کا صدر اب ایک مسلمان محمد ستالین نام ہے لے نن جو پہلے صدر تھا بوجہ علالت رخصت پر چلا گیا ہے اس کے علاوہ روسی گورنمنٹ کا وزیر خارجہ بھی ایک مسلمان مقرر ہوا ہے جس کا نام قرہ خان ہے۔ ان تمام واقعات سے انگریزی پولیٹیکل حلقوں میں بہت اضطراب پیدا ہوگیا ہے اور ان سب باتوں پر طرہ یہ ہے کہ ایشیا میں ایک لیگ اقوام کی قائم ہونے والی ہے جس کے متعلق افغانی اور روسی گورنمنٹ کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے۔ یہ سب اخباروں کی خبریں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ حقیقت ان سے بھی زیادہ ہے۔ غالباً اب سلطان ابن سعود کا فرض ہے کہ تمام اسلامی دنیا میں چندہ کرکے کابل اور قسطنطنیہ کو بذریعہ ریل ملا دیا جائے اور یہ ریل ان تمام اسلامی ریاستوں میں سے ہوکر گزرے جو روس کے انقلاب سے آزاد ہوئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تجویز ضرور عمل میں آئے گی۔ باقی خدا کا فضل و کرم ہے جو واقعات رونما ہوئے ہیں انہوں نے قرآنی حقائق پر مہر لگا دی ہے کہ حقیقت میں کوئی کمزور یا طاقتور نہیں جس کو اللہ چاہتا ہے طاقتور بنا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے آن کی آن میں تباہ کردیتا ہے۔ والدہ مکرمہ کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

محمد اقبال لاہور

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریر خط سے ۱۷ سال قبل قیام انگلستان کے زمانے میں انہیں یہ احساس ہوگیا تھا کہ اسلام پر بہت اچھا زمانہ عنقریب آنے والا ہے۔ اُن کے اس بیان کی تائید اُن کی "زمانہ آیا ہے بے حجابی کا" والی غزل سے بھی ہوتی ہے جو قیام انگلستان کے دوران ۱۹۰۷ء میں کہی گئی جو بانگ درا میں شائع ہوچکی ہے۔ اسلام کی نصرت اور سربلندی کے لئے اُن کی تڑپ کا یہ عالم تھا کہ اخباری گپ پر بھی یقین فرما لیتے۔ "اخباری خبر کہ روس کا صدر ستالن مسلمان ہے اور اس کا نام "محمد ستالین" ہے

اخباری گپ ہی تھی ورنہ واقعتاً یہ بات درست نہ تھی۔ بہرحال "اسلام پر جلد بہت اچھا زمانہ آنے" کا اُن کا احساس اپنی جگہ درست تھا۔ اُن کی حیات میں تو ان کے "آئینہ ادراک میں آنے والے دور کی تصویر دھندلی" سی تھی لیکن ان کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد اس تصویر کے نقوش اُبھرنے لگے۔ اسلامی دنیا میں سیاسی انقلاب برپا ہوا۔ اُن کا پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے درجنوں اسلامی ممالک غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزاد ہوئے۔ انقلاب کا یہ عمل ابھی جاری ہے۔ سیاسی انقلاب کے علاوہ ایک روحانی انقلاب بھی برپا ہے جس کی طرف ابھی سیاسی دنیا کی توجہ نہیں لیکن قرآن کریم کی پیشن گوئی "هُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ" پوری ہو کر رہے گی۔ انشاء اللہ۔

انکم ٹیکس کے محکمہ سے مستعفی ہونے کے بعد سیالکوٹ میں بطور وکیل پریکٹس کرتے ہوئے مجھے قریباً ۲ سال ہو گئے تھے۔ پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس پریکٹس میں میرے ساتھ ایک اور وکیل دوست سیّد مظہر حسین بھی شریک تھے۔ انہیں ایّام میں سیالکوٹ کے ایک پرانے وکیل علی بخش صاحب کے صاحبزادے مسٹر کے۔ اے۔ حمید مرحوم انگلستان سے بیرسٹری کی سند لے کر آئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ یہ کہنا تو مبالغہ آرائی ہو گی کہ ہماری پریکٹس زوروں پر تھی لیکن جونیئر وکلاء کی حیثیت سے کچھ غیر تسلی بخش بھی نہ تھی۔ حسنِ اتفاق سے اُن دنوں سیالکوٹ میں دیوانی، فوجداری اور محکمۂ مال کے سب افسران نوجوان وکلا کی بڑی حوصلہ افزائی کرنے والے تھے۔ ہم تینوں کے ان سب سے اچھے مراسم تھے۔ اپنے ہم عصر وکلاء سے بھی میرے اچھے تعلقات تھے۔ بار ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں کا انتخاب ہوا تو مجھے ایسوسی ایشن کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ اُن دنوں شہر میں سیاسی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ اُن میں اور بالخصوص تحریک خلافت میں مسلم

نوجوان وکلا بھرپور حصہ لیتے تھے۔ کچھ عرصہ کے لیے میں نے خلافت کمیٹی کے معتمد کے طور پر بھی کام کیا۔ غرضیکہ ہر رنگ میں پریکٹس کے لیے حالات سازگار تھے لیکن جیسا کہ چچا جان نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا "وکالت اللہ پر توکل رکھنے والوں کا پیشہ ہے۔ اگر کسی مہینے آمدنی نہ ہو تو ابتدا میں سخت گھبراہٹ ہوتی ہے۔" مجھے اعتراف ہے کہ توکّل کا یہ مقام مجھے حاصل نہ تھا اس لیے جس مہینے آمدنی کافی نہ ہوتی تو سخت گھبراہٹ ہوتی۔ میری خواہش تھی کہ آمدنی خواہ تھوڑی ہو لیکن مستقل ہو اور یہ صورت صرف ملازمت میں ہو سکتی تھی۔ اس لیے پہلے تلخ تجربے کے باوجود میری طبیعت ملازمت کی طرف مائل تھی۔ اُن دنوں پنجاب جوڈیشل سروس میں داخلے کا طریقہ یہ تھا کہ سال دو سال بعد جب کچھ آسامیاں خالی ہونے والی ہوتیں تو ہائی کورٹ ہر ضلع کے ڈسٹرکٹ جج سے اُس ضلع میں پریکٹس کرنے والے جونیئر وکلا میں سے ایک ایک یا دو دو کے نام منگواتی۔ ہائیکورٹ میں جو نام موصول ہوتے ان میں سے ہائیکورٹ کے جج صاحبان کی ایک کمیٹی ضرورت کے مطابق دس بارہ امیدواروں کا انتخاب کر لیتی جنہیں جوڈیشل اور ریونیو ٹریننگ دے کر بطور سب جج تعینات کیا جاتا۔ ۲۴ء کے وسط میں جب ہائیکورٹ سے اس غرض کے لئے ڈسٹرکٹ ججوں سے نام طلب کئے گئے تو میں نے بھی قسمت آزمائی کا ارادہ کیا۔ ابّا جان نے چچا جان کو میرے ارادے سے مطلع کیا تو انہوں نے جواب میں یہ خط لکھا۔

لاہور ۱۳ جولائی ۲۴ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ بہت بہتر ہے آپ اعجاز کا نام بھجوا دیجئے میں چیف جج صاحب سے اس کا ذکر پہلے کر چکا ہوا ہوں۔ اس کو چند ماہ کا عرصہ ہو گیا۔ مگر بعد میں میں خود بعض وجوہ سے خاموش رہا جن کا ذکر یہاں ضروری نہیں۔ بہرحال اب وہ اکتوبر میں ولایت سے واپس آئیں گے۔ تو پھر اُن سے کہوں گا۔ باقی والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو مسوڑھے کے پھول جانے سے اب کے بہت تکلیف ہوئی۔ آخر چیرا ہی دلانا پڑا۔ پرسوں سے بالکل آرام ہے۔ رات یہاں بارش ہوئی۔ موسم خنک ہو گیا

ہے ۔ ابھی مطلع ابر آلود ہے ۔ اُمید ہے اور برسے گا۔ شہر میں بخار اور نزلہ کے کوئی کوئی کیس ہوتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ فضل و کرم کرے میں غالباً ابتدائے اگست میں شملہ جاؤں گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے ۔

والسلام
محمدؐ اقبال لاہور

۸۳

اُن دنوں سیالکوٹ کے ڈسٹرکٹ جج شیخ رحیم بخش صاحب تھے ۔ شیخ صاحب بڑے شریف النفس انسان تھے ۔ طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف تھا ۔ صورت بڑی متبرک تھی ۔ شہرت بھی اچھی تھی لیکن ذرا ڈرپوک ٹائپ تھے ۔ یوں بھی اُس زمانے میں ہائی کورٹ کی باگ ڈور سر شادی لال کے ہاتھوں میں تھی ۔ ان کے دور حکومت میں جوڈیشل سروس کے مسلم افسران ویسے ہی سہمے سہمے رہتے تھے ۔ میں نے درخواست تو دے دی لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ میری سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے شیخ صاحب جوڈیشل سروس کے لئے میرا نام ہائیکورٹ کو بھیجنے کی شاید ہمت نہ کر پائیں ۔ میں نے چچا جان کو لکھا کہ شیخ صاحب کو کہلوایا جائے ۔ ابا جی نے بھی انہیں لکھا تو ان کا یہ جواب موصول ہوا

لاہور ۳۰ ؍ جولائی ۲۴ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط کل مل گیا تھا الحمد اللہ کہ خیریت ہے ۔ اعجاز کے بارے میں آپ نے لکھا ہے کہ شیخ رحیم بخش صاحب کو خط لکھوایا جائے ۔ میری رائے میں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ اعجاز نے بھی مجھے خط لکھا تھا کہ ان کو لکھوں مگر میں خاموش رہا ۔ شیخ رحیم بخش میرے پرانے مہربان ہیں میں اور وہ کالج میں اکٹھے تھے اگرچہ ہم جماعت نہ تھے ان کو خوب معلوم ہے کہ میرے اور اعجاز کے کیا تعلقات ہیں اور مجھ سے انہوں نے خود ذکر بھی کیا تھا کہ اعجاز کی نسبت ان کے خیالات

بھی اچھے ہیں۔ غرضیکہ موجودہ حالات میں کسی خاص سفارش کی ضرورت نہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اعجاز کا نام ضرور بھیج دیں گے۔ یہاں لاہور میں بھی سخت مقابلہ ہوگا کیونکہ ہر ضلع سے دو دو نام آئیں گے اور سفارشوں کی کوئی حد نہ رہے گی۔ بہر حال کوشش شرط ہے اور انشاء اللہ میں بھی کوشش کروں گا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ چیف جج صاحب سے میں اس کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ اب موقع آنے پر پھر دوبارہ ذکر کر دوں گا۔ آفیشل اعتبار سے بھی رحیم بخش صاحب کو لکھنا یا لکھانا ٹھیک نہیں اس کے متعلق فی الحال قواعد سخت ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

والسلام

محمد اقبال

اُن دنوں ہماری پھوپھی کریم بی بی جو ہمارے ساتھ رہتی تھیں کچھ دنوں کے لئے چچا جان کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ انہیں میاں جی سے بہت اُنس تھا۔ وہ غالباً وہاں کچھ اداس ہوگئیں اور انہوں نے میاں جی کے نام اپنے خط میں اس کا اظہار کیا۔ میاں جی رقیق القلب تو تھے ہی۔ پھوپھی جی کے خط سے بڑے متاثر ہوئے اور مجھے ارشاد فرمایا کہ میں چچا جان کو پھوپھی جی کو جلد سیالکوٹ واپس بھیجنے کے لئے لکھوں۔ میرا خط ملا تو چچا جان نے میاں جی کو یہ خط لکھا۔

لاہور ۱۰ راگست ۳۴ء

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

اعجاز کا خط ابھی ملا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ہمشیرہ کریم بی بی کے خط سے آپ کے دل پر بڑا اثر ہوا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ وہ جلد سیالکوٹ آ جائے۔ مجھے آپ کی بے چینی کا حال پڑھ کر بہت رنج ہوا ہے بلکہ میرا دل بھی اس خط سے ایسا ہی متاثر ہوا جیسا کہ آپ کا۔

میں نے مختار سے کہہ دیا ہے کہ اگر گاڑی میں کافی وقت ہے تو آج ہی ہمشیرہ کو لے جائے ورنہ کل روانہ ہو جائے۔ سو انشاء اللہ اول تو آج ہی جائے گا ورنہ کل روانہ ہو جائے گا۔ میں بھی انشاء اللہ چند روز کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ مقدمات کرنال کے تصفیے کے لئے شملہ جانا ہے اور ان کی تاریخ کا انتظار ہے۔ وہاں سے واپس ہونے کے بعد انشاء اللہ ضرور آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ اطمینان فرمائیں اور ہمشیرہ کریم بی بی کے پہنچنے کے بعد اپنی خیریت سے مطلع کریں۔ اس کی جب ضرورت ہو گی اسے پھر بلا لیا جائے گا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔

والسلام
محمد اقبال

برخوردار اعجاز کو بعد دعا کے واضح ہو کہ میں نے تمہارے دونوں خط پڑھ لئے ہیں۔ والد مکرم کی طبیعت پہلے بھی رقیق تھی اب بہ سبب ضعف پیری کے اور بھی رقیق ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ عمر کا آدمی کوئی رفیق اپنا نہیں دیکھتا اس کو دنیا نئی معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے جس سے اس کی طبیعت اور گھبرا جاتی ہے اس واسطے میرا مشورہ تم کو یہ ہے کہ دن میں ایک دفعہ وقت نکال کے ایک آدھ گھنٹہ ضرور اُن کے پاس بیٹھا کرو اور جن باتوں میں ان کو دلچسپی ہے ان کے متعلق ان سے گفتگو کیا کرو خواہ وہ گفتگو بہ تکلف ہی کیوں نہ ہو۔ تم اس بات کو زندگی کے دیگر فرائض کی طرح لازم کر لو اور ایک دن بھی اس فرض کی انجام دہی سے غافل نہ ہو۔ غالب گمان ہے کہ اس سے تم کو بہت فائدہ پہنچے گا کیا عجب ہے کہ جو بات ان سے . . . . کو حاصل نہیں ہو سکی وہ تم کو مل جائے۔ اور اگر یہ بات ہو گئی تو زندگی بھر ان کے احسان کو فراموش نہ کر سکو گے اگرچہ اس وقت تم کو اس کا احساس نہ ہو کیونکہ جوانی کے خیالات کا رُخ اور طرف ہوتا ہے۔ مجھے خود جو فائدہ ان کی ذات سے ہوا اس کا احساس اب ہوا ہے اور میں اس کو ہر قسم کے علم اور دنیوی وجاہت پر ترجیح دیتا ہوں۔ تم ان کے مذاق کا مطالعہ کرو اور پھر خواہ بہ تکلف ہی کیوں نہ ہو تھوڑی دیر کے لئے اس مذاق میں رنگین ہو جایا کرو تاکہ

تاکہ وہ تمہیں محرم تصور کریں۔ اس میں تمہارے لئے بڑے بڑے فائدے مستور ہیں جن کو میں اب بیان نہیں کرسکتا اور اگر بیان کر دوں بھی تو شاید تم ان کو اچھی طرح سمجھ بھی نہ سکو گے۔ اس فائدے کے علاوہ دنیوی فائدے کا بھی امکان غالب ہے کسی وقت خوش ہوکر ایک کبیرالسن آدمی کے منہ سے دعا نکل جائے تو اسے دنیا کے تجربے نے نہایت پر تاثیر بتایا ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیر یت ہے۔

والسلام

محمدؐ اقبال

خط میں مختار سے مراد میرے سب سے چھوٹے بھائی شیخ مختار احمد ہیں جو اُن دنوں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں چچا جان کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ پھوپھی جی کو سیالکوٹ واپس پہنچا گئے۔

اس خط کا آخری حصہ میرے نام ہے اور خاص توجہ کا مستحق ہے۔ میں تو پچھلے دو سالوں سے اکثر میاں جی کی صحبت میں بیٹھتا تھا۔ لیکن اس خط کے بعد سے تو چچا جان کے ارشاد کے مطابق میں نے اس فرض کو زندگی کے دیگر فرائض کی طرح لازم کر لیا۔ اور اس سے مجھے بہت فائدہ حاصل ہوا۔ خط میں میاں جی سے فیض حاصل نہ کر سکنے کے سلسلہ میں ایک عزیز کا نام لکھا تھا۔ وہ میں نے حذف کر دیا ہے کیونکہ ان مکتوبات کی اشاعت سے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں۔

شیخ رحیم بخش صاحب کے متعلق میرا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ جوڈیشل سروس کے لئے ہائی کورٹ کو میرے نام کی بجائے انہوں نے سیالکوٹ کے ایک تحصیل ہیڈ کوارٹر میں پریکٹس کرنے والے وکیل صاحب کا نام بھیجا جو مجھ سے دو سال جونیئر تھے۔ میرا نام نہ بھیجنے کی وجہ یہ لکھی کہ اگرچہ یہ امیدوار باقی ہر لحاظ سے بہترین ہے لیکن سیاسی تحریکوں میں

حصہ لیتا رہتا ہے لہٰذا اس کا نام بھیجنا مناسب نہیں۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں سمجھا شاید ڈسٹرکٹ جج صاحب نے ڈپٹی کمشنر سے مشورہ کیا ہو اور یہ اعتراض انہوں نے اٹھایا ہو۔ ڈپٹی کمشنر ایک بیدار مغز انگریز سویلین تھے۔ بار ایسوسی ایشن کے سیکریٹری ہونے کی وجہ سے وہ مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے۔ میں اُن سے ملا اور دریافت کیا کہ جوڈیشل سروس کے لئے میرے نام پر قدغن کیا حکومت کی یا ان کی پالیسی کے تحت لگائی گئی ہے تاکہ اگر ایسا ہے تو میں اس معاملہ میں مزید تگ و دو نہ کروں۔ انہوں نے فرمایا کہ اس معاملہ میں ڈسٹرکٹ جج کے لئے ان سے مشورہ کرنا ضروری نہ تھا اور نہ ہی ان سے مشورہ کیا گیا۔ مزید کہا کہ اگرچہ تم سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے رہتے ہو لیکن تمہاری طرف سے قانون شکنی کی کوئی رپورٹ مجھے نہیں ملی اس لئے اگر ہائی کورٹ جوڈیشل سروس کے لئے تمہاری درخواست پر غور کرے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میری درخواست پر انہوں نے مجھے ایک تحریر بھی اس مطلب کی لکھ دی۔ میں نے یہ سارے حالات چچا جان کو لکھے اور کہا کہ ان حالات میں ہائی کورٹ ڈسٹرکٹ جج سے میرا رول منگا سکتی ہے۔ جس کے لئے کوشش کی جائے۔ اس کے جواب میں اُن کا یہ خط موصول ہوا۔ خط پر تاریخ درج نہیں لیکن اگست ۲۴ء کے آخر یا ستمبر کے شروع کا ہے۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے۔ مجھے شیخ صاحب سے کوئی توقع نہ تھی اسی واسطے میں نے ان کو خط لکھنے سے احتراز کیا تھا۔

اب یہ بات کہ ججان ہائی کورٹ خاص طور پر تمہارا رول منگوائیں بہت مشکل نظر آتی ہے کیونکہ اس کے لئے خاص وجوہ کی ضرورت ہے تاہم میں اس بات کی کوشش پورے طور پر کروں گا اور چیف جج صاحب سے تمام ضروری باتیں کہہ دوں گا۔ تم ستمبر کے آخر میں مجھے ڈپٹی کمشنر کے سارٹیفکیٹ کی ایک نقل بھیج دینا جو انہوں نے تم کو دیا ہے۔ علاوہ اس کے یہ بھی لکھنا کہ جن لوگوں کے نام بھیجے گئے ہیں وہ تم سے سینئر ہیں یا جونیئر اور اگر جونیئر ہیں تو کتنے سال۔ تم نے خط میں لکھا تھا کہ خلافت کمیٹی کا ممبر ہونے کی وجہ سے تم پر اعتراض

کیا گیا تھا جس کے متعلق ڈپٹی کمشنر کی تحریر تم نے خط میں نقل کی تھی اگر وہ تحریر انبتسل نہ ہو تو اس کی نقل بھی بھیج دینا۔

ان سب باتوں کے علاوہ سیالکوٹ شہر کے وکلاء کو خاص طور پر اس امر کے خلاف احتجاج کرنا چاہیئے کہ سیشن جج صاحب نے اپنی سفارشات میں ان کے حقوق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بار کمیٹی کو چاہیئے کہ وہ ایک رزولیوشن اس کے خلاف پاس کرکے چیف جج صاحب کے نام بھیجدے۔ یہ تجویز تم خود کرو یا تمہارا کوئی دوست بار ایسوسی ایشن میں یہ تجویز پیش کرے۔ بہتر ہے کہ تمہارا کوئی دوست ایسا کرے۔ اس سلسلے میں میرا ذکر نہ کرنا چاہیئے یعنی کہ یہ تجویز میرے ایما سے کی گئی ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو میرے ہاتھ ذرا مضبوط ہو جائیں گے اور میں زیادہ صفائی کے ساتھ چیف جج صاحب سے کہہ سکوں گا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

محمد اقبال لاہور

اباجان نے بھی انہیں اس معاملہ کے متعلق لکھا تھا جس کا جواب یہ موصول ہوا۔

لاہور ۲۱ ستمبر ۲۴ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ اعجاز کا خط بھی پونچا ہے مجھے منشی رحیم بخش صاحب سے زیادہ توقع نہ تھی اسی واسطے میں ان کو خط نہ لکھنا چاہتا تھا۔ مگر خیر ان کی سفارشات کا بھی حجاں ہائی کورٹ پر کوئی ایسا اثر نہیں ہے۔ حال میں انکے ایک فیصلہ کی اپیل میں حجاں نے ان پر نہایت خراب ریمارک کئے ہیں یہی وجہ ان کے خوف کی ہے۔ یہ معاملہ سفارشات کا ججوں کی کمیٹی میں پیش ہوگا۔ چیف جج آئیں گے تو میں خود ان سے سب حال کہہ دوں گا اور اگر اعجاز کے آنے کی ضرورت ہوئی تو اس کو بھی بلا لوں گا۔ فی الحال تعطیلوں میں کچھ کام نہ

ہوگا اور جو جج چھٹیوں میں کام کر رہے ہیں وہ کچھ نہیں کر سکتے ۔ اعجاز کو بھی یہ خط دکھا دیجئے بہر حال جو کچھ ہو سکے گا کیا جائیگا اعجاز کو گھبرانا نہ چاہیے اور موقع نکل آئیں گے ۔

والسلام
محمد اقبال

۸۷

اُن دنوں سردار چچی جان اور مختار چچی جان دونوں امید سے تھیں ۔ مختار چچی تو اپنے میکے لدھیانے گئی ہوئی تھیں ۔ سردار چچی کو انہوں نے "بھابھی جی" کے پاس سیالکوٹ بھیج دیا ہوا تھا ۔ ۵ اکتوبر ۲۴ء کو خدا کے فضل و کرم سے جاوید سلمہٗ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ابا جان کے نام اس خط میں مجھے چیف جسٹس سے ملنے کے لئے لاہور آنے کے لئے لکھا ۱۸ اکتوبر کا یہ خط دوسرے دن سیالکوٹ پہنچ گیا ۔ لیکن اس کے سپرد ڈاک کرنے کے بعد ۱۸ اکتوبر کو ہی انہیں لدھیانہ سے مختار چچی جان کی تشویشناک علالت کا تار ملا ۔ انہوں نے اسی دن یہ خبر ابا جان کو بذریعہ تار بھیجی اور مجھے فوراً لاہور طلب فرمایا تاکہ ان کے ساتھ لدھیانے چلوں ۔ میں دوسرے دن صبح کی گاڑی سے لاہور پہنچ گیا اور اُسی دن ہم لدھیانے چلے گئے ۔

مختار چچی جان کو نمونیہ ہوگیا تھا جس کی وجہ سے وہ سخت کمزور ہوگئی تھیں اور وضع حمل کی تکلیف برداشت کرنے کے قابل نہ رہی تھیں ۔ اس پر مستزاد یہ کہ ۲۱ اکتوبر کو دردِ زہ بند ہوگیا ۔ ڈاکٹروں سے کہا گیا کہ جہاں تک ہو سکے زچہ کی جان بچانے کی کوشش کریں اور بچے کا خیال نہ کریں ۔ لیکن ڈاکٹروں کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور چچی جان رحلت فرما گئیں ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

لاہور ۱۸ اکتوبر ۲۴ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط اور پوسٹ کارڈ دونوں مل گئے ہیں ۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے ۔ لدھیانے

عرض ہو۔

محمد اقبال

رسم قل ادا ہو جانے کے بعد ہم لاہور واپس آ گئے۔ لاہور سے یہ خط ابّا جان کو لکھا۔

لاہور ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۴ء

برادر مکرم السلام علیکم

میں بخیریت لدھیانے (سے) پرسوں مع اعجاز کے آ گیا تھا۔ ماتم پرسی کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اس واسطے آپ کو خط نہیں لکھ سکا۔ طبیعت نہایت پریشان ہے۔ پرسوں شام جھنگ مقدمہ کے لئے جاؤں گا اس طرح طبیعت کے اور طرف لگ جانے سے امید ہے خیالات میں اطمینان و سکون پیدا ہو گا۔ مرحومہ کے بھائیوں نے اس کا تمام زیور اور سامان واپس کر دیئے ہیں ہر چند میں نے کہا کہ شریعت کی رو سے اس کے بیشتر حصے کے وارث اس کے بھائی بہن ہیں مگر انہوں نے ایک نہیں مانی معلوم ہوتا ہے وہ مرنے سے پہلے ان سے یہی کہہ گئی تھی۔ اب ارادہ ہے کہ یہ ترکہ اس کی کسی یادگار کی صورت میں صرف کیا جائے کچھ روپیہ میں اور اپنی طرف سے اس میں اضافہ کر دوں گا۔ اگر خدا تعالےٰ نے توفیق دی تو بہت اچھی صورت ہو جائے گی۔ والدہ مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔

امید ہے جاوید اور اس کی والدہ دونوں اچھے ہوں گے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ اعجاز کا رول بلا لیا جائے گا۔ باقی مرحلہ جو زیادہ سخت ہے بعد میں آئے گا اس کے لئے بھی انشاءاللہ کوشش کروں گا۔

والسلام

محمد اقبال

قیام لاہور کے دوران میں جج مرزا ظفر علی صاحب اور جج سید عبدالرؤف صاحب سے ملا اور اپنا کیس بیان کیا۔ دونوں نے اُس وقت صرف اتنا ہی کہا کہ آخری انتخاب تو ججوں کی کمیٹی کرے گی۔ لیکن تمہارا کیس کمیٹی کے سامنے پیش ہونا چاہیئے۔ اس لئے تمہارا رول ڈسٹرکٹ جج سے منگوا لیا جائے گا۔ چنانچہ دوسرے ہی دن ڈسٹرکٹ جج صاحب کو میرا رول بھیجنے کی ہدایت کر دی گئی۔

جیسا کہ چچا جان نے اس خط میں لکھا ہے اُن کی طبیعت اس سانحہ سے بڑی پریشان تھی اور کئی دن تک یہی کیفیت رہی۔ فرماتے تھے کہ درد کی شدت کی وجہ سے مرحومہ کے چہرے پر جو بے چارگی اور بے کسی کی کیفیت تھی وہ نہیں بھولتی۔

یہاں یہ ذکر بھی کر دوں کہ مرحومہ کی وفات کے دوسرے یا تیسرے دن لدھیانہ ہی میں انہوں نے مرحومہ چچی جان کا قطعۂ تاریخ وفات کہا جو یہ ہے

اے دریغا مرگِ ہم سفرے
دلِ من در فراقِ اُو ہمہ درد
ہاتف از غیب دادِ تسکینم
سُخنِ پاکِ مصطفےٰ آورد
بہرِ سالِ رحیلِ او فرمود
بشہادت رسید و منزل کرد ۱۳۴۳ھ

مرحومہ کی لوح مزار چچا جان نے لاہور سے تیار کرا کر بھیجی۔ اُس پر یہ قطعہ تاریخ وفات کندہ ہے۔

مولانا غلام رسول مہر نے یہ قطعہ "سرود رفتہ" میں شائع کیا ہے مگر اُس میں دو ایک غلطیاں ہیں جو کتابت کی معلوم ہوتی ہیں اولاً تاریخ وفات جو ۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء لکھی گئی ہے درست نہیں۔ صحیح تاریخ وفات ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء ہے۔ دوسرے ہجری سن وفات ۱۳۴۲ لکھا گیا ہے جو درست نہیں۔ ہجری سن وفات ۱۳۴۳ ہے۔ ان دو فروگزاشتوں کے علاوہ قطعۂ وفات کا آخری مصرعہ "بشہادت

رسید و منزل کرد" درج ہوا ہے جس سے سن وفات ۱۳۴۸ نکلتا ہے۔ صحیح مصرعہ یوں ہے "بشہادت رسید و منزل کرد" جس سے سن وفات ۱۳۴۳ نکلتا ہے۔ "بشہادت" کی جگہ "بہ شہادت" چھپنے سے "ہ" کے پانچ عدد کا اضافہ ہو جاتا ہے جس سے سنِ وفات کی صحت میں خلل پیدا ہوتا ہے۔

ہائی کورٹ کی ہدایت پر ڈسٹرکٹ جج صاحب نے میرا ردل بھیج تو دیا لیکن ساتھ ایک خط میں پہلے ردل نہ بھیجنے کی وجہ بھی لکھ دی یعنی یہ کہ یہ امیدوار سیاسی تحریکوں میں حصّہ لیتا رہا ہے۔ چچا جان چیف جسٹس سے ملے اور میرے کیس کے حالات اُن کے گوشگزار کئے۔ اس کی اطلاع انہوں نے ابا جان کو اس خط میں دی۔

لاہور ۵ نومبر ۲۴ء

برادر مکرم۔ السلام علیکم

آپ کا پوسٹ کارڈ ابھی ملا ہے الحمدللہ کہ خیریت سے۔ اگر جاوید اور اس کی والدہ تندرست ہیں تو بہتر ہے۔ ۱۱ نومبر تک آجائیں۔ لیکن اگر کوئی امتحان ابھی باقی ہے تو وہیں قیام کریں۔ ڈاکٹر میر حیدر صاحب کا نسخہ ہمراہ لیتے آئیں اس کا استعمال جاری رہے گا لیکن میں نومبر کے مہینے میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ کام کے علاوہ بہت سی اور مصروفیتیں ہیں نئے گورنر صاحب کے بہت سے ڈنر ہیں وہاں جانا ہے اس کے علاوہ علی گڑھ کے ایک پروفیسر مجھ سے ملنے کے لئے آرہے ہیں وہ میرے متعلق کوئی کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ مجھ سے سوالات کرنا چاہتے ہیں جن کے جوابات محفوظ رہیں گے۔ اعجاز کے ہمراہ آجائیں میں انشاءاللہ دسمبر میں والد مکرم کی زیارت کے لئے حاضر ہوں گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ اعجاز کا ردل امید ہے آج پہنچ گیا ہو گا مرزا ظفر علی اور سید عبدالرؤف جج جان سے تو وہ مل گیا ہے۔ بانی چیف جج صاحب سے میں نے اس کے تمام

حالات بیان کر دیئے تھے اور اس D.O کا بھی ذکر کر دیا تھا جو سیشن جج صاحب نے رول کے ہمراہ بھیجی ہے اگر وہ یہ D.O نہ بھیجتے تو بہتر ہوتا بہر حال امید نہیں کہ بااثر ہو۔ مشکل جو اس معاملے میں ہے وہ یہ ہے کہ پنجاب کونسل نے رزولیوشن پاس کیا ہے کہ پہلے ۷۰ فیصدی ملازمتیں زمینداروں کو دی جائیں۔ چیف جج صاحب سے پھر بھی ملوں گا اس کے لئے جہاں تک ہوگا کوشش کی جائے گی۔ آئندہ اس کا مقدر۔

والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

والسلام

محمد اقبال لاہور

سردار چچی جان ابھی سیالکوٹ میں ہی تھیں۔ ان کی طبیعت کچھ علیل تھی۔ ڈاکٹر میر حیدر صاحب علاج کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب شہر کے ایک بااثر سید خاندان کے فرد تھے۔ مولانا میر حسن صاحب سے بھی اُن کی قرابت داری تھی۔ ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے اور اپنا مطب کرتے تھے۔ تھے تو اسسٹنٹ سرجن لیکن ہاتھ میں شفا تھی اس لئے ان کا مطب مرجع خاص و عام تھا۔ ہمارے خاندانی معالج تھے۔ اُن کے ایک صاحبزادے سید بشیر حیدر جو محکمۂ ایکسائز میں ملازم تھے۔ چچا جان کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ مختار چچی جان سے شادی طے پانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا کیونکہ اُن دنوں وہ لدھیانے میں تعینات تھے۔

یہ معلوم نہیں کہ علی گڑھ کے جس پروفیسر کا ذکر ہے وہ کون صاحب تھے اور انہوں نے وہ کتاب لکھی یا نہیں جو وہ لکھنا چاہتے تھے۔ سردار چچی کو صحت ہوئی تو میں انہیں اور جاوید کو لاہور پہنچا آیا۔

یہاں یہ ذکر کر دوں کہ اللہ تعالےٰ کے فضل سے چچا جان کی کوشش کامیاب ہوئی اور ہائی کورٹ کے ججوں کی کمیٹی نے مجھے جوڈیشل سروس کے لئے منتخب کر لیا۔ الحمد اللہ۔

شیخ گلاب دین صاحب کا ذکر خط نمبر ۳ کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ کسی امر کے متعلق اُن کا تنازعہ سیالکوٹ کے بعض افراد کے ساتھ تھا۔ اس کے تصفیے کے لئے وہ سیالکوٹ آئے تھے۔ چچا جان نے یہ خط ابا جان کو لکھا کہ تنازعہ کا جلد فیصلہ کرانے میں کوشش کریں۔ میرے لئے ارشاد تھا کہ ضرورت پڑے تو میں بھی اس معاملے میں شیخ صاحب کی مدد کر دوں۔ چنانچہ تعمیل ارشاد کی گئی۔

لاہور ۷، فروری ۲۵ء

برادر مکرم۔ السلام علیکم

میں اب خدا کے فضل و کرم سے اچھا ہوں۔ مختار کے متعلق آپ کا خط مل گیا تھا۔ میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اسے غلط آگاہی ملی تھی۔ آئندہ سال اس کے لئے انشاءاللہ کوشش کی جائے گی۔

شیخ گلاب دین صاحب سیالکوٹ آتے ہیں۔ ان کا معاملہ آپ کو معلوم ہے اس میں جہاں تک ہو سکے جلد ان کا فیصلہ کرانے میں کوشش کیجئے حالات آپ کو معلوم ہی ہیں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت پڑے تو اعجاز سے بھی کہہ دیجئے کہ وہ اس معاملے میں شیخ صاحب کی مدد کرے۔

والسلام

محمد اقبال

میاں جی نے اپنے بزرگوں سے سنا ہوا تھا کہ ہمارے آبا میں سے جو بزرگ سب سے پہلے اسلام کی نعمت سے سرفراز ہوئے وہ "لول حج" کے عرف سے مشہور تھے۔ اُن کی بعض کرامتوں کی داستانیں خاندان کی بڑی بوڑھیاں بیان کیا کرتی تھیں لیکن یہ سب سُنی سنائی باتیں تھیں تفصیلی حالات معلوم نہ تھے۔ چچاجان کو اپنے بزرگوں کا سراغ لگانے کی جستجو رہتی تھی۔ یہ سراغ انہیں کس طرح ملا۔ اس کا حال انہیں کی زبانی سنیئے جو آپا جان کے نام اس خط میں درج ہے۔ اس خط کا ذکر کتاب کے شروع میں خاندانی حالات کے تحت کر دیا گیا ہے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

لاہور ۵ راکتوبر ۲۵ء

برادر مکرم۔ السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے جس سے بہت اطمینان ہوا۔ الحمدللہ علی ذالک جاوید اب بالکل تندرست ہے۔ آج پورے ایک سال کا ہوگیا ہے۔ اس کی والدہ آج قربانی دینے میں مصروف ہے۔ آپ اور والد مکرم یہ سن کر خوش ہوں گے کہ مدت کی جستجو کے بعد آج اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے۔ حضرت بابا لول حج کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ ان کا ذکر خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر میں اتفاقاً مل گیا ہے۔ والد مکرم نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا تھا وہ بحیثیت مجموعی درست ہے۔ ان کا اصلی گاؤں لوچر نہ تھا بلکہ موضع چکو پرگنہ آدون تھا۔ بارہ سال کشمیر سے باہر رہے اور ممالک کی سیر میں مصروف رہے۔ بیوی کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ اس واسطے ترک دنیا کرکے کشمیر سے نکل گئے۔ واپس آنے پر اشارہ غیبی پاکر حضرت بابا نصرالدین کے مرید ہوئے جو حضرت نورالدین ولی کے مرید تھے۔ بقیہ عمر انھوں نے بابا نصرالدین کی صحبت میں گزاری اور اپنے مرشد کے جوار میں مدفون ہیں۔ اب امید ہے کہ مزید حالات بھی معلوم ہو جائیں گے۔ خواجہ اعظم کا تذکرہ مختصر

ہے مگر یہ مختصر نشان غالباً مزید انکشافات کا باعث ہو گا۔ ان حالات کے معلوم ہونے کا
سبب بھی عجیب و غریب ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار الہ آباد یونیورسٹی کی ڈاکٹری کی ڈگری
کے حاصل کرنے کے لئے ایک کتاب کشمیری تہذیب و تمدن پر لکھ رہے ہیں۔ میں ان کے ممتحین
میں سے ہوں۔ باقی دو ممتحین انگلستان اور آئرلینڈ کے پروفیسر ہیں۔ اتفاق سے رجسٹرار صاحب
کل آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کسی اپنے دوست کو ہدایت کی تھی کہ خواجہ اعظم کی تاریخ
کشمیر کا قلمی نسخہ میرے مکان پر پہنچا دے۔ وہ شخص قلمی نسخہ تاریخ مذکور کا لایا میں اس وقت
فارغ بیٹھا تھا یہی کتاب دیکھنی شروع کر دی۔ دو چار ورق ہی الٹے تھے کہ بابا صاحب کا تذکرہ
مل گیا۔ جس سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی۔ غالباً بابا نصر الدین کی اولاد کشمیر میں ہو گی۔ ان سے مزید
حالات معلوم ہونے کی توقع ہے اور کیا عجب کہ ان کے پاس اپنے مریدوں کا سارا سلسلہ
موجود ہو۔ والسلام

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔

محمد اقبال

یہ خط جاوید کی پہلی سالگرہ کے دن لکھا گیا تھا۔ خط میں ذکر ہے کہ "اس کی والدہ
آج قربانی دینے میں مصروف ہے۔" سردار چچی جان جاوید کی سالگرہ صدقہ کے طور پر
بکرہ ذبح کر کے اس کا گوشت غربا میں تقسیم کر کے منایا کرتی تھیں۔ ابھی سالگرہ کا کیک
کاٹنے، موم بتیاں بجھانے اور "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" گانے کا رواج عام نہ تھا اور ہوتا
بھی تو چچا جان ہرگز اس کی اجازت نہ دیتے۔

۱۹۳۱ء میں چچا جان دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے
تو ابا جان سیالکوٹ سے آ کر ان کی عدم موجودگی میں ان کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ اس
اثنا میں گاندھی ارون سمجھوتے کے نتیجے میں کانگریس نے گول میز کانفرنس میں شامل ہونا

منظور کر لیا تھا اور گاندھی جی کو اپنا واحد نمائندہ نامزد کیا تھا۔ مہاتما گاندھی کانفرنس کے سلسلہ میں لندن گئے تو ہندو اخبارات نے لندن میں ان کی "آؤ بھگت" کے قصے بڑھا چڑھا کر شائع کئے۔ لندن سے چچا جان کا ابا جان کے نام یہ خط دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ کیونکہ اس سے گول میز کانفرنس کے بعض حالات اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مصالحت کی کوششوں پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ خط میں جہاں اپنے دونوں بچوں کو دُعا اور چودھری محمد حسین اور منشی طاہر دین کو سلام لکھا ہے وہاں اپنے دونوں ملازمین علی بخش اور رحماں کو بھی فراموش نہیں کیا اور ان کو بھی سلام بھجوایا ہے۔ لاہور میں ابا جان علیل ہو گئے تو وہ واپس سیالکوٹ چلے گئے تھے اور اپنی جگہ میرے چھوٹے بھائی مختار احمد کو چچا جان کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ یہ خط جو لاہور کے پتہ پر آیا تھا ابا جی کو سیالکوٹ کے پتہ پر بھجوا دیا گیا تھا۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۳۱ء

برادر مکرم۔ السلام علیکم

خدا کے فضل و کرم سے ہر طرح خیریت ہے۔ امید ہے گھر میں بھی سب طرح خیریت ہوگی۔ ہندوستان سے اخبار آتے ہیں۔ عجیب خبریں اخبارات میں چھپتی ہیں۔ مثلاً پرتاب میں لکھا ہے کہ مہاتما گاندھی کو شاہی محل میں کمرہ مل گیا ہے۔ اور جب وہ بازار سے گزرتے ہیں تو ہزاروں لوگوں کا ہجوم ان کے گرد ہوتا ہے۔ حالانکہ حال یہ ہے کہ ان کے آنے کا یہاں الٹا اثر ہوا ہے۔ میں نے اسی واسطے لکھا تھا کہ غیر مسلم ذرائع سے جو اخبار آئیں ان پر اعتبار نہ کیا جائے۔ مسلمان ڈیپوٹیشن متحد ہے اور گفتگو مصالحت کے خاتمہ کا الزام ہندوؤں کے یا سکھوں کے سر پر ہے۔ اخبار ٹائمز میں مفصل حالات چھپ گئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندو مسلمانوں کو بدنام کرنے کی ہر کوشش کر رہے ہیں مگر برٹش پبلک کو اب ان کے پروپگنڈے کی اصل حقیقت معلوم ہو گئی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ عام طور پر ہمدردی ہے نو مبر میں مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات یعنی عالم اسلام کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے

کے متعلق انگریزوں کی طرف سے ایک بہت بڑی میٹنگ ہوگی جس کے پروپوگنڈے پر ایک ہزار پونڈ خرچ کیا جائے گا۔ فی الحال عام انتخابات پارلیمنٹ کی وجہ سے آفیشل میٹنگ کانفرنس کی نہیں ہو رہی۔ ۳ر نومبر کو نئی پارلیمنٹ کا اجلاس ہوگا۔ اس کے بعد ہماری کانفرنس کی کارروائی کا آغاز ہوگا۔ اس سے پہلے ہینارٹی کمیٹی کا اجلاس دو دفعہ ہوا اور دونوں دفعہ چند منٹ کے بعد اجلاس ملتوی ہوگیا۔

یہاں بھی فرصت کم ہے تمام دن لوگ آتے جاتے ہیں گویا لنڈن بھی لاہور ہی ہے۔

جاوید اور منیرہ کو دعا۔ والسلام

محمد اقبال لنڈن

چوہدری محمد حسین صاحب کو سلام، طاہر دین اور علی بخش اور رحماں کو بھی سلام

جاوید نے اپنے ابا جان کو پہلا خط لنڈن کے پتہ پر لکھا تو میرے چھوٹے بھائی مختار احمد کے نام اس خط میں بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ اس خط سے بھی گول میز کانفرنس کے متعلق بعض امور پر روشنی پڑتی ہے۔ منشی طاہر دین نے بنکوں کے متعلق فکر کا اظہار کیا۔ اس کے متعلق خط کے آخر میں منشی صاحب کے نام جو جواب بھیجا ہے وہ نوٹ کرنے کے قابل ہے۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۳۱ء

عزیزمن مختار۔ السلام علیکم

تمہارا خط ہوائی ڈاک کے ذریعہ سے مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ گھر میں سب طرح سے خیریت ہے۔ طاہر دین کا خط بھی آیا تھا اس سے بھی خیر خیریت معلوم ہوئی۔ طاہر دین نے لکھا تھا کہ کتاب کے ٹائیٹل پیج کے لئے کون سا کاغذ خریدا جائے اس نے چند نمونہ بھی بھیجے تھے۔ تم اس سے کہہ دینا کہ چودھری محمد حسین اور سالک صاحب جو کاغذ پسند کریں وہ لگا دینا چاہیئے۔

جاوید کا خط دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ اس سے کہنا کہ وہ خوب محنت کرے یہاں کے میرے پرانے دوست مرد اور خواتین سب کہتی ہیں کہ جاوید کو کیوں ساتھ نہ لائے۔ ایک میری استانی نے جرمنی سے خط لکھا ہے اور اسے یعنی جاوید کو دیکھنے کی خواہش کی ہے۔ اس نے بچوں کے متعلق پوچھ بھیجا تھا۔ منیرہ کو بہت بہت پیار کرنا امید ہے کہ میری واپسی تک وہ چلنا پھرنا سیکھ لے گی۔

چودھری محمد حسین صاحب کا صرف ایک ہی خط آج تک ملا ہے۔ ان سے کہہ دینا کہ میناریٹی کمیٹی کے تین اجلاس ہوئے اور تینوں دفعہ کمیٹی پرائیویٹ گفتگو کے لئے ملتوی ہو گئی۔ اس واسطے مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ہوا۔ یہی بات بھائی صاحب کو سیالکوٹ بھی لکھ دینا۔ کیونکہ انہوں نے لکھا تھا کہ تمہاری تقریر کسی اخبار میں شائع نہیں ہوئی۔ ہندوؤں نے یہاں بھی میرے ایڈریس کے متعلق بعض انگریزوں سے پروپگنڈا کرایا میں نے اس کا دندان شکن جواب اخبار ٹائمز میں شائع کرایا تھا۔ ۲۸ نومبر کو انڈیا سوسائٹی میں میرا لیکچر ہے جس کا مضمون فلسفہ اور شعر ہے۔ ۹ نومبر کو لی سی ام کلب کی عورتوں نے دعوت دی ہے۔ وہاں میں ایک ظریفانہ تقریر کروں گا۔ ۷ نومبر کو یہاں کے مسلمان طلباء مجھے ایڈریس دینے والے ہیں۔ کانفرنس کا اجلاس شاید وسط نومبر میں ختم ہو جائے۔ ایسا ہوا تو میں پیرس، برلن، روم ہوتا پورٹ سعید پونچوں گا۔ وہاں سے ایک ہفتہ کے لئے مصر اور فلسطین جاؤں گا۔ غالباً وسط دسمبر تک لاہور پونچ جاؤں گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ یہاں آکر میری صحت اچھی ہو گئی۔ البتہ گزشتہ رات سردی کی وجہ سے دانت کا درد ہوا۔ مگر تکلیف جلد رفع ہو گئی۔ باقی چودھری محمد حسین صاحب سے کہئے کہ کام خوب ہو رہا ہے۔ افسوس کہ ہندو سبھا اور سکھ بہت روڑا اٹکاتے ہیں۔ برادر مکرم کا خط بھی تمہارے خط کے ساتھ ہی ملا تھا۔ ان کی طبیعت کی ناسازی کی خبر سن کر مجھے ایک گونہ فکر پیدا ہوا۔ یہ خط خود پڑھ کر اور سب کو سنا کر ان کو سیالکوٹ بھیج دینا چاہیئے زندگی اور موت رنج و راحت سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اسی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ انشاء اللہ ان سے ملاقات ہو گی اور میں ان کو تندرست پاؤں گا۔ طاہر دین نے بنکوں کے متعلق فکر کا اظہار کیا تھا اس سے کہہ دینا چاہیئے کہ کوئی فکر کی بات نہیں۔ میرے تمام معاملات جان و

مال اور روپیہ اللہ کے سپرد ہے۔ جب سے میں نے ایسا کیا ہے مجھے کوئی تردد نہیں ہوتا۔
سب کچھ اسی کا ہے اس کی رضی میری مرضی ہے۔

والسلام
محمد اقبال لنڈن

۱۹۳۳ء میں میں چونیاں میں جو ضلع لاہور کا ایک تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے سب جج کے طور پر تعینات تھا۔ ان دنوں وہاں کے سول ہسپتال کے انچارج ایک شریف النفس اور نیک سکھ اسسٹنٹ سرجن تھے جو حضرت بابا گرونانک کی اولاد میں سے تھے۔ شہر لاہور کے ایک گوردوارے کے گرنتھی صاحب کہ وہ بھی حضرت بابا جی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور "بیدی صاحب" کہلاتے تھے گاہے گاہے چونیاں آ کر ڈاکٹر صاحب کے ہاں قیام کرتے تھے۔ وہ بڑے خوش بیان تھے۔ جب چونیاں آتے تو ہر روز شام کو وہاں گوردوارے میں وعظ فرماتے جسے سننے کے لئے کثرت سے لوگ گوردوارے جاتے۔ ڈاکٹر صاحب سننے کے لئے کثرت سے لوگ گوردوارے جاتے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میں بھی کئی دفعہ ان کا ویاکھیان سننے کے لئے گوردوارے گیا اور ڈاکٹر صاحب کے مکان پر تو اکثر اُن سے ملاقات ہوتی تھی۔

ایک دن بیدی صاحب میرے ہاں تشریف لائے اور تخلیہ میں گفتگو کرنی چاہی میں سمجھا شاید کسی مقدمہ میں سفارش کریں گے۔ جب تخلیہ ہوا تو فرمایا میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ آپ اپنے چچا سے میری ملاقات کا انتظام کر دیں۔ ان کی اس غیر متوقع درخواست پر مجھے کچھ تعجب ہوا کیونکہ میرے مشاہدے میں وہ سکھوں اور ہندوؤں میں بڑے مقبول تھے۔ ستمبر کی تعطیلات میں دیوانی عدالتیں ایک مہینے کے لئے بند ہونے والی تھیں اور میں سیالکوٹ جانے والا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ ستمبر میں مجھے لاہور جانے کا بھی اتفاق ہوگا تو ان کی ملاقات

کا انتظام ہو جائے گا۔

میں سیالکوٹ گیا تو وہاں بیدی صاحب کا جموں توی سے لکھا ہوا خط ملا کہ وہ علامہ اقبال سے کب مل سکیں گے۔ اس خط میں انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ مسلمان ہونے کے بعد ان کا موجودہ ذریعہ معاش تو ختم ہو جائے گا اس لئے اس کا بھی کچھ انتظام ہونا چاہیئے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ ستمبر کے آخر میں چونیاں جاتے ہوئے میں دو ایک دن لاہور ٹھہروں گا۔ آپ فلاں تاریخ کو آجائیں تو ملاقات ہو جائے گی۔ یہ بھی لکھ دیا کہ میرے علم میں مسلمانوں کی کوئی ایسی منظم جماعت نہیں جو نومسلموں کے ذریعہ معاش کا انتظام کر سکے۔ میں نے بیدی صاحب کا خط اور اپنے جواب کی نقل چچا جان کو بھیج کر بیدی صاحب کے لئے ملاقات کی استدعا کی۔ اس کے جواب میں اُن کا یہ خط مجھے سیالکوٹ کے پتہ پر ملا۔

لاہور ۱۳ ستمبر ۳۳ء

عزیزم اعجاز سلمہ

تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ لڑکی کا نام قدسیہ رکھنا چاہیئے۔ مختار کے ہاں لڑکا ہوا ہے اس کا نام میں نے زوّار احمد تجویز کیا ہے۔

باقی رہا بیدی صاحب کا معاملہ سو تم نے ان کو ٹھیک لکھا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں کوئی منظم جماعت ایسی نہیں کہ نومسلموں کے لئے کوئی انتظام معاش کر سکے۔ ابھی چند روز ہوئے مجھے پنجاب کے ایک مقام سے خبر آئی کہ کئی ہزار مذہبی سکھ مسلمان ہونے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ ان کے لئے زمین کا انتظام کر دیا جائے۔ علیٰ ہذا القیاس تین چار معزز سکھ اور ہندو میرے پاس آئے کہ اگر ان کے لئے ملازمت کا انتظام ہو جائے تو وہ مسلمان ہونے کے لئے تیار ہیں۔ غرض یہ کہ بالعموم اس قسم کے حالات میں دنیوی محرکات عمل کرتے ہیں بہرحال اگر بیدی صاحب کی توقعات کا حال معلوم ہو تو میں یہاں کی کسی انجمن سے گفتگو کر سکوں۔ ان کے خط میں مطالبات کا کہیں ذکر نہیں۔ عام طور پر اگر مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ تبدیلی مذہب سے کسی کا مقصود محض منفعت مادی ہے تو وہ اسے نہایت مکروہ جانتے ہیں۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ان کے سیاسی زوال کے اوقات میں ہوا ہے۔ حکومت

کے عروج کے زمانے میں اسلام نہیں پھیلا مگر اس بات کا کیا علاج کیا جائے کہ اس ملک میں مسلمان نہایت افلاس زدہ ہیں خود موجودہ مسلمان قوموں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ان کے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ تاہم جوشِ تبلیغ کسی حد تک مسلمانوں میں موجود ہے۔ یہی حال میں نے یورپ میں دیکھا ہے۔ اسلام کے متعلق ان کی راز جوئی روز بروز ترقی کر رہی ہے مگر مسلمانوں میں استطاعت اس قدر نہیں ہے کہ وہ یورپ میں کلچرل اور مذہبی مشن بھیج سکیں۔ جو مشن وہاں موجود ہیں ان میں کوئی آدمی اس قابل نہیں کہ وہ یورپ کی موجودہ مشکلات کو سمجھ سکے اور ان مشکلات کی روشنی میں اسلام کی مذہبی اور کلچرل حیثیت ان کے سامنے پیش کر سکے

والسلام

محمد اقبال

ستمبر کے آخری دنوں میں چونیاں جاتے ہوئے لاہور ٹھہرا۔ تاریخ مقررہ پر بیدی صاحب تشریف لائے۔ چچا جان سے کچھ عرصہ گفتگو رہی۔ جس میں چچا جان نے انہیں سمجھایا کہ اگر آپ اسلام اس لئے قبول کر رہے ہیں کہ آپ کو اس کی حقانیت پر یقین ہو گیا ہے اور کوئی دنیاوی غرض شامل نہیں تو اللہ تعالےٰ آپ کے لئے خود غیب سے سامان پیدا کرے گا۔ اس گفتگو میں انہوں نے فرمایا کہ اُن کے والد کو گوجرانوالہ ضلع کے ایک بزرگ سے عقیدت تھی اور وہ انہیں ملنے جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ گئے تو وہ بزرگ اپنے مکان کے باہر چارپائی پر بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک جنگلی خرگوش جس کے پیچھے کُتے لگے ہوئے تھے بھاگتا ہوا آیا اور بزرگ کی چارپائی کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔ کتے جو تعاقب کر رہے تھے وہاں آدمیوں کو بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ کچھ دیر بعد اُس بزرگ نے چارپائی کے نیچے دیکھا اور خرگوش سے مخاطب ہو کر کہا "ارے عقلمند پناہ بھی لی تو ایک انسان کی" چچا جان نے یہ واقعہ سنایا اور اُن پر رقت طاری ہوگئی۔ صوفے پر بیٹھے تھے۔ اُس کی پُشت پر سر رکھ دیا اور زار و قطار دیر تک روتے رہے۔ میں نے پہلی بار انہیں اس طرح روتے دیکھا۔

یہ واقعہ سنانے سے بیدی صاحب کا یہ سمجھانا مقصود تھا کہ انہیں اگر اسلام سچے دل سے قبول کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ ڈھونڈنی چاہیئے نہ کہ انسانوں کی۔ بیدی صاحب

سمجھ گئے کہ ان تلوں میں تیل نہیں ۔ اس کے بعد بیدی صاحب نہ کبھی چونیاں آئے نہ ہی ان کے اسلام قبول کرنے کی خبر سُنی ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اپنے گوردوارے کے منتظمین سے ان کا کچھ تنازعہ تھا جس کی وجہ سے انہیں گرنتھی کے عہدے سے ہٹا دیا گیا تھا ۔

۳۷ء میں مَیں دہلی میں بطور سب جج تعینات تھا ۔ میری اہلیہ کے بدن پر گاہے گاہے دھپڑ نکل آتے تھے ۔ ایلوپیتھک والے اس بیماری کو آرٹیکیریا (ARTICARIA) کا نام دیتے ہیں ۔ ہم نے ایلوپیتھک، یونانی، ہومیوپیتھک سب ہی قسم کے علاج کرائے لیکن کوئی خاص فائدہ نہ ہوا ۔ ایک دفعہ چچا جان سے اس کا ذکر آیا تو فرمایا تم دہلی میں تعینات ہو حکیم عبدالوہاب صاحب کو کیوں نہیں دکھاتے ۔ ۳۷ء میں وہ بھی اُن کے زیرِ علاج تھے ۔ شروع اپریل میں وہ تین دن کے لئے دہلی آئے ۔ افغانستان کے قونصل جنرل ان کے دوست تھے ان کے ہاں قیام فرمایا ۔ وہاں سے بذریعہ ڈاک مجھے یہ خط میرے دہلی کے پتہ پر لکھا ۔

برخوردار اعجاز احمد طال عمرہٗ

میں کل صبح دہلی آیا تھا ۔ آج حکیم صاحب نابینا سے ملاقات کی ہے اور تمہاری بیوی کے متعلق ان سے مفصل کہہ دیا ہے ۔ تم کسی روز اُن سے مل کر والدۂ تحسین کی نبض دکھانے کے لئے وقت مقرر کر لو تاکہ حکیم صاحب وہ وقت مریضہ کے لئے خالی رکھیں اور تخلیہ میں مفصل حالات سُن سکیں ۔ میں کل شام واپس لاہور جا رہا ہوں ۔ باقی تمہارے بچوں کو دعا و سلام ۔ اس خط میں حکیم صاحب کے نام بھی ایک خط ملفوف ہے جو اگر ضرورت ہو تو حکیم صاحب کو دکھلا دینا

محمد اقبال،

قونصل خانہ ۔ افغانستان نیو دہلی

۳ اپریل ۳۷ء

اس خط کا متن ان کا قلمی نہیں ۔ کسی اور سے لکھوایا گیا ۔ لیکن دستخط اُن کے ہیں قونصل خانہ کا پتہ اور تاریخ تحریر خط بھی ان کی قلمی ہیں ۔ اُن کے ارشاد کے بموجب میں نے حکیم صاحب سے وقت لیا ۔ وہ بڑی شفقت سے پیش آئے بڑی توجہ سے میری اہلیہ کی نبض دیکھی ۔ حالات سُنے اور دوائی عطا کی جس سے میری اہلیہ کو افاقہ ہوا ۔

۹۷

میں نے حکیم صاحب سے ملاقات کی کیفیت چچا جان کو لکھی تو اُس کے جواب میں یہ خط موصول ہوا ۔

اُن دنوں اُن کی آنکھوں میں موتیا اُتر رہا تھا ۔ ایک دفعہ معائنہ ہو چکا تھا ۔ دوسرے معائنہ تک ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہوا تھا ۔ یہ خط جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے کسی دوست سے لکھوایا ۔ دستخط بھی اُن کے نہیں لیکن اندازِ تحریر انہیں کا ہے

من اندازِ قدش را می شناسم

لاہور

۲۲ر اپریل ۳۶ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے ۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے کہ تمہاری بیوی کو حکیم صاحب کے علاج سے فائدہ ہوا ہے ۔ یہ علاج جاری رہنا چاہیے بلکہ کامل صحت ہو جانے کے بعد بھی کچھ عرصہ تک اس کا جاری رہنا ضروری ہے ۔ حکیم صاحب طبیب ہونے کے علاوہ درویش ہیں اور مجھ کو ان کی یہ ادا نہایت پسند ہے ۔ والسلام

تمہارے بچوں کو دعا — محمد اقبال

یہ خط میں نے ایک دوست سے لکھوایا ہے کیونکہ ڈاکٹر نے مجھ کو آنکھ کے دوسرے معائنہ تک لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہے ۔

اپریل ۳۷ء میں چچا جان نے دہلی آکر حکیم نابینا صاحب کو نبض دکھائی تھی اور اُن کی تجویز کردہ دواؤں کا استعمال شروع کیا تھا۔ مئی کے تیسرے ہفتہ میں یہ خط میرے نام آیا جس میں اُن دواؤں کے استعمال کے بعد جو ان کی حالت تھی وہ تفصیل سے بیان کی گئی ہے ارشاد ہوا کہ میں "یہ خط خود جاکر حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کردوں اور جو دوا وہ دیں اُسے لے کر انہیں پارسل کر دوں۔" اگرچہ ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کیا ہوا تھا لیکن دو صفحات کا یہ طویل خط انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔

لاہور ۲۰ مئی ۳۷ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

بعد دعا کے واضح ہو میں نے حکیم نابینا صاحب کے خدمت میں کچھ دن ہوئے ایک رجسٹرڈ خط لکھا تھا جس کا کوئی جواب اب تک نہیں ملا۔ مہربانی کرکے تم یہ خط خود جاکر ان کی خدمت میں پیش کر دو اور جو دوا وہ دیں اسے لے کر مجھے پارسل کر دو!

(۱) سنہری گولی جو صبح بالائی میں رکھ کر کھائی جاتی ہے اب ختم ہونے کو ہے۔ یہ گولی مجھے بہت مفید ثابت ہوئی ہے اس کے کھانے سے پیٹھ کی درد رفع ہوئی اس کی کافی تعداد اگر حکیم صاحب روانہ کر دیں تو میں بہت ممنون ہوں گا۔ حکیم صاحب کو بار بار زحمت دینے کی ضرورت نہ رہے گی۔

(۲) سفید ورق والی گولی جو ناشتے میں کھائی جاتی ہیں اس کی کافی تعداد ابھی میرے پاس موجود ہے اس کے روانہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے

(۳) سفید ورق والی جو پان میں رکھ کر کھائی جاتی ہے۔ قریب الاختتام ہے صرف تین گولیاں باقی۔ یہ تولید بلغم کو روکنے والی گولی ہے اگر اس کا جاری رکھنا ضروری ہے تو یہ بھی کافی تعداد میں ارسال فرما کر مشکور فرمائیں۔

(۲) اپریل کے ابتدا میں جب میں حکیم صاحب سے ملا تھا تو انہوں نے فرمایا تھا کہ تمہارا جگر ریح پیدا کرتا ہے اب اس کا علاج ضروری ہے اس کے لئے انہوں نے ایک معجون مجھے عطا فرمائی تھی۔ اس معجون کا نسخہ اس خط میں ملفوف کرتا ہوں۔ وہ حکیم صاحب کو دکھا دیں تاکہ انہیں یاد آجائے۔ یہ بھی اب قریب الاختتام ہے چند خوراک باقی ہے اگر اسی کو جاری رکھنا ہو تو اس کے مقدار بھی کافی ارسال کریں۔ مگر بہتر ہے اس کے کہ حکیم صاحب قبلہ اسی معجون کے استعمال کا حکم دیں یا اس میں کوئی ترمیم کریں۔ مندرجہ ذیل امور اُن کے گوش گزار کرنا لازم ہے۔

(۱) جگر بدستور ریح پیدا کرتا ہے اس میں کمی نہیں ہوئی غالباً یہ معجون موثر نہیں ہوئی۔

(۲) دم بھی پھولتا ہے گو پہلے کی نسبت کم اس سے میں یہ اندازہ کرتا ہوں کہ دل کی تقویت کے لئے کسی خاص مؤثر دوا کی ضرورت ہے۔

(۳) قبض کی شکایت بھی کم و بیش ہے۔

(۴) اس معجون کے استعمال کے چند روز بعد پیٹھ کا درد بھی عود کر آیا حالانکہ اس کے استعمال سے پہلے مطلق نہ تھا میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا عود کر آنا معجون کے استعمال کی وجہ سے ہے تاہم یہ واقعہ حکیم صاحب کے نوٹس میں لانا ضروری ہے۔

بہر حال جو امور حکیم صاحب کی خاص توجہ کے مستحق وہ یہ ہیں۔

(۱) ریح کا پیدا ہونا (۲) دم پھولنا (۳) قبض کی شکایت (۴) پیٹھ کے درد کا پھر عود کر آنا (۵) ریح جو پیدا ہوتی ہے جب تک نہ نکلے کمر میں درد ہوتا رہتا ہے اور دونوں طرف کے گردوں پر بوجھ سا محسوس ہوتا ہے۔ نکل جائے تو درد میں تخفیف ہوتی ہے۔

غرضیکہ یہ تمام تفصیل میرے موجودہ حالات کی ہے ایک ایک بات حکیم صاحب کے گوش گزار کر کے ان کا جو جواب ہو مجھے اس سے مطلع کریں جو کچھ وہ فرمائیں اسے نوٹ کرتے جائیں تاکہ بعد میں آسانی سے مجھے لکھ سکو۔ دوا کی ترسیل کے لئے خاص تاکید ہے۔ جلد ارسال ہونی چاہیئے۔

والسلام

محمد اقبال

افسوس ہے کہ جاوید کا ماموں عبدالغنی کل بقضائے الٰہی فوت ہو گیا۔ نہایت شریف اور نیک آدمی تھا خدا اسے مغفرت کرے۔

امید کہ تمہاری بیوی کی صحت اب بالکل اچھی ہو گی۔

میں خط ملتے ہی حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حسب ارشاد "ایک ایک بات حکیم صاحب کے گوش گزار" کی۔ حکیم صاحب نے جو دوائیں دیں اور اُن کے متعلق مفصل ہدایات اُسی دن لاہور بھیج دی گئیں۔ پھر یہ سلسلہ جاری رہا۔ چچا جان اپنی کیفیت لکھوا بھیجتے جو میں حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بیان کر دیتا اور جو دوائیں تجویز ہوتیں وہ بذریعہ پارسل بھیج دیتا۔ اس خط کے بعد ۳۷ء میں جتنے خطوط موصول ہوئے وہ سب کسی اور کے لکھے ہوئے تھے۔ انہیں صرف پانچ محفوظ رہ گئے ہیں۔

۹۹

۱۰ مئی ۳۷ء کے بعد کے خطوط جو محفوظ رہ گئے اُن میں پہلا خط یہ ہے جو ۲۲ جولائی کا ہے۔ جون ۳۷ء اور جولائی ۳۷ء کے نصف اوّل میں بھی اس سلسلہ میں خطوط آئے ہوں گے جو محفوظ نہیں رہے۔ حافظ محمد سعید جن کا اس خط میں ذکر ہے دہلی کے ایک نوجوان وکیل تھے جو حکیم صاحب کے قانونی کام کرتے تھے۔ اُن کے ذریعہ میں حکیم صاحب سے ملاقات کا وقت لیا کرتا تھا۔

حسب ارشاد حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر چچا جان کی کیفیت بیان کر دی گئی اور جو دوائیں ملیں وہ بھیج دی گئیں۔

لاہور ۲۲ جولائی ۳۷ء

برخوردار اعجاز احمد طال عمرہٗ

حکیم صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ کچھ دنوں سے میرے دونوں

گردوں کی طرف ایک بوجھ سا رہتا ہے اور گزشتہ رات بائیں جانب کے گردہ میں خفیف سی درد بھی محسوس ہوتی رہی جو اس وقت نہیں ہے۔ اسی بائیں جانب کے گردے میں دس سال ہوئے جب مجھے درد ہوئی تھی۔ جب حکیم صاحب نے اس کا علاج کیا۔ دس سال تک ذرا سی کسک بھی محسوس نہیں ہوئی۔ سوائے گزشتہ رات کے یہ بات حکیم صاحب کے نوٹس میں لانا ضروری ہے۔ مہربانی کر کے یہ خط ان کو حافظ محمد سعید صاحب کی معرفت سنا دیں۔ اور اگر حکیم صاحب کوئی دوائی تجویز کریں تو وہ لے کر مجھے بھجوا دینا۔ باقی جو دوائیاں حکیم صاحب کی ہیں ان کا استعمال جاری ہے۔ ان کے ختم ہونے کے قریب اطلاع دوں گا۔

والسلام

محمد اقبال

دیکھنے سے معلوم ہوا کہ دونوں معجونیں جو حکیم صاحب نے ارسال فرمائی تھیں۔ قریب الاختتام ہیں۔ گولیوں کی تعداد ابھی باقی ہے۔

سنیچر کی تعطیلوں میں دیوانی عدالتیں بند ہو گئیں لیکن میں دہلی میں ہی رہا تاکہ دوائیں وقت پر پہنچاتا رہوں۔ میں نے اس کی اطلاع تو چچا جان کو کر دی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے میرا وہ خط انہیں نہیں ملا۔ وہ سمجھے کہ میں تعطیلوں میں دہلی سے چلا گیا ہوں لہذا انہوں نے حافظ محمد سعید کو براہ راست خط لکھا۔ حافظ صاحب مصوری پہاڑ پر گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہاں سے انہیں لکھا اور میرے دہلی میں ہی قیام کی اطلاع دی۔ اس پر یہ خط موصول ہوا۔

میں یہ خط لے کر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حکیم صاحب کو یہ معلوم ہو کر اطمینان ہوا کہ ان کے علاج سے چچا جان کو فائدہ ہو رہا ہے۔ جو مزید دوائیں انہوں نے دیں وہ بذریعہ پارسل بھجوا دی گئیں۔

۱۷ستمبر ۳۷ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

حافظ محمد سعید صاحب کے خط سے جو مصوری سے آیا معلوم ہوا کہ تم ابھی دلی میں ہو اور ستمبر کی تعطیلوں میں کہیں باہر نہیں گئے۔ میرا خیال تھا کہ شاید تم وہاں نہیں ہو۔ اس لئے میں نے حافظ صاحب ہی کو خط لکھا تھا کہ دوا حکیم صاحب سے لے کر ارسال فرماویں۔ امید ہے کہ تم بھی حکیم صاحب کی خدمت میں پیغام بھیج دو گے۔ تاکہ وہ جلد توجہ فرمائیں۔ امید ہے تمھارے اہل و عیال بخیریت ہوں گے۔ میں بھی بفضلِ خدا تعالیٰ پہلے سے بہت اچھا ہوں۔ حکیم صاحب کی دواؤں نے بہت فائدہ پہنچایا ہے

والسلام

محمد اقبال

۱۰۱

دوائیاں ملنے پر انہوں نے یہ خط لکھا اس کا مضمون بھی حکیم صاحب کے گوشگزار کر دیا گیا اور جو جواب حکیم صاحب نے دیا وہ چچا جان کو لکھ دیا گیا۔ اکتوبر نومبر میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا لیکن وہ خط محفوظ نہیں رہے۔

۲۴ستمبر ۳۷ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

حکیم صاحب کی بھیجی ہوئی دوائیں مل گئیں۔ اب کے انہوں نے صرف دو معجون کھانے کے لئے ارسال کی ہیں۔ اس سے قبل دوا کا دستور العمل یہ تھا۔

صبح سنہری گولی بالائی میں۔

آٹھ بجے سفید گولی ناشتے کے دوران میں۔

دس بجے سفید گولی دونوں معجونوں میں سے ایک کے ساتھ

چار بجے شام دوسری معجون

اب کے جیسا کہ لکھا گیا ہے صرف دو معجونیں صبح و شام کے لئے موصول ہوئی ہیں الگ کوئی گولیاں نہیں بھیجی گئیں۔ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ سنہری اور سفید گولیاں جنکا استعمال ہو رہا تھا ان معجونوں میں شامل کر دی گئی ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں تو کیا سہواً ایسا ہوا ہے یا پھر حکیم صاحب نے قصداً ان کا استعمال بند کرا دیا ہے آپ یہ امر ان کے مطب سے دریافت کر کے مجھے مطلع کریں۔

والسلام

محمد اقبال

یہ بات اس لئے دریافت کی کہ سنہری گولیوں سے مجھے بے حد فائدہ ہوا تھا۔ ان کا ترک کر دینا غالباً ٹھیک نہ ہوگا۔ ہاں اگر یہ گولیاں معجون میں شامل ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں

ان دنوں دسمبر کے مہینے میں دیوانی عدالتیں کرسمس کی تعطیلوں کے لئے ہفتہ دس دن کے لئے بند ہوتی تھیں۔ ۳۷ء میں ان تعطیلوں میں جاوید اور منیرہ کے سیالکوٹ جانے کی تجویز تھی۔ بچوں کی جرمن گورنس ان دنوں میں اپنے عزیزوں کو ملنے علی گڑھ جانا چاہتی تھی۔ اس لئے کرسمس کی تعطیلوں میں میرے سیالکوٹ جانے کا پروگرام دریافت کرنے کے لئے چچا جان کا یہ خط موصول ہوا۔

یکم دسمبر ۳۷ء

برخوردار اعجاز احمد طال عمرہٗ

میں نے تم کو ایک خط متھرا داس کے متعلق لکھا تھا۔ جس کا جواب اب تک نہیں ملا۔

بھائی صاحب کا ارشاد تھا کہ دسمبر کی چھٹیوں میں جاوید اور منیرا چند روز کے لئے سیالکوٹ آجائیں۔ دونوں بچے خود بھی وہاں جانے کے لئے بیتاب ہیں۔ تم مجھ کو فعل فور (فوراً) اطلاع دو کہ دسمبر کی کون سی تاریخ اور کون سے وقت لاہور پہنچو گے۔ غالباً تمہارے اہل و عیال تمہارے ساتھ ہوں گے۔ بہتر یہ ہے کہ اگر گاڑیوں کے اوقات اس بات کو ممکن کریں تو تم سب پہلے یہاں آجاؤ۔ پھر جاوید اور منیرا یہیں سے تمہارے ساتھ سیالکوٹ روانہ ہو جائیں۔ اس خط کا جواب مفصل بہت جلد تحریر کرنا چاہیئے۔ جلدی کی ضرورت اس لئے ہے کہ منیرا اور جاوید کی گورنس بھی اپنے اوقات علی گڑھ جانے کے لئے معین کرنا چاہتی ہے۔ زیادہ دعا

والسلام

محمد اقبال

کیونکہ بچے تمہارے ہمراہ ہوں گے اور یہاں سے دو بچے اور ساتھ ہو جائیں گے۔ اس لئے اگر ممکن ہو تو ایک سیکنڈ یا انٹر کمپارٹمنٹ لاہور سے وزیر آباد تک ریزرو کرا لیا جائے۔

ان کے ارشاد کے مطابق میں اپنے بچوں سمیت پہلے لاہور گیا اور وہاں سے جاوید منیرہ کو ساتھ لے کر سیالکوٹ چلا گیا۔

یہ خط کسی مبتدی سے لکھوایا گیا معلوم ہوتا ہے ایک تو تحریر بھی پختہ نہیں دوسرے فی الفور کو "فعل فور" لکھا ہے۔

اس خط کے پہلے پیراگراف کا ذکر اگلے خط کے ساتھ کیا جائے گا۔

چچاجان کی دائیں آنکھ کی بینائی تو بچپن سے ہی کمزور تھی۔ ۱۹۰۱ء میں جب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان مقابلہ میں شریک ہوئے تو اسی بنا پر طبّی معائنہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔ سرکاری ملازمت میں لے لئے جاتے تو "حکیم مشرق" نہ بن سکتے۔

زندگی کے آخری سالوں میں دوسری آنکھ میں موتیا اترنا شروع ہو گیا۔ ۳۷ء کے شروع میں تو موتیا کی شدّت کی وجہ سے معالجوں نے لکھنے پڑھنے کی بھی ممانعت کر دی۔ اُن دنوں اس مرض کے علاج یعنی آپریشن کے بڑے ماہر ڈاکٹر متھرا داس موگا والے سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے ملازمت کی ابتداء تو اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے کی تھی۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے انہیں موتیا کے آپریشن کی ایسی مہارت عطا کی تھی کہ ہندوستان بھر میں اُن کی شہرت تھی۔ اُن کی ملازمت کا زیادہ عرصہ موگا منڈی کے سول ہسپتال کے انچارج کے طور پر گذرا۔ ان کی وجہ سے وہ ہسپتال موتیا کے آپریشن کے لئے اتنا مشہور ہوا کہ دور دور سے سینکڑوں مریض علاج کے لئے وہاں آتے۔ ۳۷ء میں وہ ملازمت سے ریٹائر ہو کر لاہور میں اپنا مطب کرتے تھے۔ باوجود اتنی شہرت، عزّت اور فنی مہارت کے وہ بڑے خلیق اور وضعدار بزرگ تھے۔ اُن کے بھتیجے دیس راج پاہوا اور میں ایک ساتھ جوڈیشل سروس کے لئے منتخب ہوئے تھے۔ میرا تقرر دیس راج سے پہلے ہو گیا اور حُسنِ اتفاق سے پہلی تعیناتی موگا میں ہوئی۔ دیس راج اُن دنوں موگا میں ڈاکٹر صاحب کے پاس مقیم تھے۔ موگا میں کچھ دن میرا قیام ڈاکٹر صاحب کے ہاں دیس راج کے مہمان دوست کی حیثیت سے رہا۔ موگا کے قیام کے دوران اور پھر اس کے بعد بھی ہمیشہ ڈاکٹر صاحب نے میرے ساتھ ویسی ہی شفقت کا برتاؤ کیا جیسی دیس راج سے کرتے تھے۔ اب ایسی وضعداریاں کہاں ہیں۔

میں نے ایک مرتبہ ڈاکٹر متھرا داس سے اپنے تعلق کا ذکر کر کے چچا جان سے عرض کیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو ڈاکٹر صاحب سے ان کی آنکھ کے معائنہ کا انتظام کیا جائے نومبر ۳۷ء میں انہوں نے مجھے ایسا کرنے کے لئے لکھا۔ میں نے اسی وقت ایک خط ڈاکٹر متھرا داس کی خدمت میں لکھا اور ایک چچا جان کی خدمت میں کہ وہ منشی طاہر دین کو بھیج کر ڈاکٹر صاحب سے معائنہ کے لئے وقت لے لیں۔ یکم دسمبر ۳۷ء کا محررہ خط جس میں ڈاکٹر متھرا داس کے متعلق میرا جواب نہ ملنے کا ذکر ہے۔ سپرد ڈاک کرنے کے بعد اُسی دن میرا خط انہیں مل گیا تھا اور انہوں نے منشی طاہر دین کو کہہ دیا تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے مل کر معائنہ کے لئے وقت لے لیں۔ اُدھر میرا خط ڈاکٹر صاحب کو بھی اُسی دن ملا۔ اُن کی وضعداری کا یہ عالم تھا کہ وہ دوسرے دن صبح خود چچا جان کے ہاں معائنہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اور معائنہ کے بعد انہیں اطمینان دلایا کہ جب آنکھ آپریشن کے قابل ہو جائے گی وہ خود آپریشن کریں گے اور پوری بصارت عود کر آئے گی۔ چچا جان ڈاکٹر صاحب کے اخلاق سے بڑے متاثر ہوئے اور اُسی دن مجھے یہ خط لکھا جس میں فرماتے ہیں" ڈاکٹر صاحب نہایت خوش اخلاق آدمی ہیں اور میں خوش ہوں کہ تم اپنے تعلقات کے لئے ایسے با اخلاق آدمیوں کا انتخاب کرتے ہو۔"

۲ر دسمبر ۳۷ء

برخوردار اعجاز احمد طال عمرُ

تمہارا خط آنے پر میں نے منشی طاہر الدین کو ڈاکٹر متھرا داس صاحب سے وقت مقرر کرنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا خط ڈاکٹر صاحب موصوف کو طاہر الدین کے ملنے سے پیشتر مل گیا تھا۔ وہ آج خود تشریف لے آئے اور میری آنکھ کا معائنہ کیا۔ ان کا خیال ہے کہ موتیا بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ ماہ مارچ میں آپریشن کے لائق ہو جائے۔ مگر فروری میں پھر معائنہ کریں گے۔ اگر مارچ میں اپریشن کے لئے آنکھ پختہ نہ ہوئی اور اپریشن کی ضرورت گرمیوں میں محسوس ہوئی تو پھر اپریشن مصوری پہاڑ پر کیا جائے گا۔ مارچ میں ہوا تو لاہور میں ہو جائے گا۔ گرمیوں میں ہوا تو مصوری میں اور

اگر اس نے اکتوبر تک طول کھینچا اکتوبر میں لاہور میں ہی ہو جائے گا۔ غرض یہ کہ انہوں نے ہر طرح اطمینان دلایا ہے کہ آپریشن نہایت عمدگی کے ساتھ ہوگا۔ اور پوری بصارت عود کر آئے گی۔ ڈاکٹر صاحب نہایت خوش اخلاق آدمی ہیں۔ اور میں خوش ہوں کہ تم اپنے تعلقات کے لئے ایسے با اخلاق آدمیوں کا انتخاب کرتے ہو۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے

محمد اقبال

چونکہ ۳۸ء کے شروع میں ہی چچا جان پر دمہ کے شدید دورے پڑنے لگے اس لئے آپریشن ستمبر ۳۸ء تک ملتوی کر دیا گیا۔ افسوس کہ ستمبر ۳۸ء سے پہلے ہی اُس "دیدۂ بینائے قوم" کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

6472805169